اقبال اکادمی پاکستان 2008
© بشریٰ احمد خرم

نوٹ: اس کتاب کا نقشِ اول الحمرا پبلی کیشنز اسلام آباد سے 2003 میں دمادم رواں ہے یمِ زندگی کے نام سے شائع ہوا تھا۔ نقشِ ثانی ترمیم اور اضافوں کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے،

تمام تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا ربّ ہے،

رحمان اور رحیم ہے،

مالکِ یومِ الدین ہے!

ہم صرف تیری عبادت کرتے اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں،

ہمیں راہِ مستقیم دے،

اُن لوگوں کی راہ جن پر تُو نے انعام کیا نہ اُن کی جن پر غضب ہوا یا جو بھٹک گئے!

ترجمہ سورۃ ۱: فاتحہ

یارب اُس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہوگی

جادۂ ملکِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل

اقبال، ۱۹۰۳ء

سازِ خاموشم نوائے دیگرے دارم ہنوز
آنکہ بازم پردہ گرداند بپے آنم برید
(اقبال)

☆ سازِ خاموش ہوں مگر ابھی ایک نغمہ مجھ میں باقی ہے۔ جو دوبارہ میرا پردہ اٹھا دے، مجھے اُس کے پاس لے چلو۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

پہلی بات

کسی موضوع کے بارے میں سب کچھ جاننے کا دعویٰ کرنا عجیب سی بات ہے۔ مگر اس کے باوجود مجھے یہ کہنا ہے کہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اقبال کی ابتدائی زندگی کی وہ تمام باتیں جو کسی بھی صورت میں معلوم یا دستیاب ہیں اس کتاب میں شامل ہیں۔ اس دائرے میں صرف اُن کی زندگی کے حالات ہی نہیں آتے بلکہ وہ خیالات جو انہوں نے دوسروں کی تحریروں سے اخذ کیے، خود اُن کی اپنی شاعری اور نثر کا مکمل جائزہ اور اُن کا تعارف اس میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کتاب اُس عہد کی تصویر بھی ہے۔

میں نے سوانح نگاری کے اُس بنیادی اُصول سے انحراف کیا ہے جو بیسویں صدی کے شروع میں رائج ہوا تھا اور جسے عام طور پر دُنیا بھر میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ یعنی "سوانح نگار کا پہلا فرض یہ ہے کہ اُس کا دلکش اختصار ہر ایسی بات سے گریز کرے جو توجہ کے لائق نہیں ہے اور ہر ایسی بات کو شامل کرلے جو توجہ کے لائق ہے۔"

میں نے اس کے برعکس اُن مسلمان سوانح نگاروں کا راستہ اپنایا ہے جن کا خیال تھا کہ جب وہ کسی کی سوانح لکھتے ہیں تو اُس کی ہر بات توجہ کے قابل ہوتی ہے خواہ معمولی ہو یا غیر معمولی۔ سوانح نگار کسی صحافی کی مانند ہوتا ہے اور اُس کا کام یہ ہے کہ وہ پوری معلومات دیانت داری اور سلیقے کے ساتھ پیش کردے۔ یہ فیصلہ کرنا قاری کا حق ہے کہ اُن میں سے کون سی بات لائقِ توجہ ہے اور کون سی نہیں۔

اقبال اور اقبالیات کے بارے میں ہر بات جو معلوم ہے اور آج تک تحریر میں آئی ہے اُسے اس سوانح میں شامل کرنے کا منصوبہ ہے جو چھ کتابوں میں مکمل ہوگا یعنی:

۱ ابتدائی دور، ۱۹۰۴ء تک

۲ تشکیلی دور، ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۳ء

۳ وسطی دور، ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۲ء

۴ دورِ عروج، ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۰ء

۵ اختتامی دور، ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۸ء

۶ اقبالیات ۱۹۳۸ء کے بعد

سلسلے کی ہر کتاب اپنی جگہ ایک مکمل کتاب سمجھی جا سکتی ہے کیونکہ ہر دور میں اقبال کی جستجو کا کوئی ایک مرحلہ بخوبی طے ہوتا نظر آتا ہے۔ حیاتِ اقبال کو ادوار میں تقسیم کرتے ہوئے یہ بات خاص طور پر سامنے رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ہر کتاب میں ابواب کی تقسیم کے بھی کچھ رموز ہیں جو باذوق قارئین خود دریافت کر سکتے ہیں۔

میری کوشش رہی ہے کہ یہ کتاب صرف مکمل معلومات پر مشتمل ہی نہ ہو بلکہ اُسے دلچسپ انداز میں بھی پیش کرے۔ ادب اور فن کے پروہتوں میں قریباً ایک صدی سے کسی فن پارے کے دلچسپ ہونے کو اُس کے گھٹیا ہونے کی دلیل سمجھا جاتا رہا ہے اور اعلیٰ درجے کی تحقیق کے دلچسپ ہونے کا تصور مغرب میں مقبول نہیں ہے۔ چنانچہ اِس تحقیقی کتاب کے دلچسپ ہونے کی بات میں تعریف نہیں بلکہ تہمت سمجھ کر چھیڑ رہا ہوں، ایک ایسی تہمت جو مجھے قبول ہے (اپنی ایک کتاب پر میں نے یہ تبصرہ بھی پڑھا ہے کہ چونکہ کتاب دلچسپ ہے لہٰذا اس کے مستند ہونے میں شبہ پیدا ہوتا ہے!)

مجھے غیر جانبداری کا بھی کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ ہم اُسی شخص کے بارے میں زیادہ لکھتے یا پڑھتے ہیں جس سے ہم بہت محبت یا کافی نفرت کرتے ہیں۔ سوانح نگار اگر اپنا فن جانتا ہے تو وہ کسی کی زندگی پر لکھتے ہوئے اُس کا طرفدار ہونے کے باوجود اُسے تمام انسانی کمزوریوں کے ساتھ پیش کرے گا کیونکہ تصویر صرف سفید رنگ سے نہیں بنتی، اُس میں دوسرے رنگ بھی شامل کرنے پڑتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اگر میں اقبال کے بارے میں ''غیر جانبدار'' ہوتا تو اُن کی بجائے کسی اور شخصیت پر کتاب لکھتا جس کا میرا کوئی تھوڑا بہت جذباتی رشتہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ مجھے اقبال سے ویسا لگاؤ ہے جیسا میں کم از کم اِس

وقت کسی دُوسری ادبی شخصیت سے محسوس نہیں کرتا ہوں۔

یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ یہ سوانح ایک ایسے دور کے آغاز پر پیش کی جا رہی ہے جب بیسویں صدی کا فطرتی نظریۂ زندگی دم توڑ رہا ہے اور اُس رومانویت کے دوبارہ زندہ ہونے کے آثار نظر آ رہے ہیں جسے گوئٹے اور ورڈزورتھ کے ہاتھوں عروج ملا اور جس کے آخری نقیب خود اقبال تھے۔ آج دُنیا نے زندگی کو پھر اُس نظر سے دیکھنا شروع کیا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ یہ صدی رُوح کی بازیافت کی صدی ہو۔ مشرق کے اِس شاعر کی زندگی اور سوچ پر دوبارہ غور کرنے کے لیے شاید یہ گھڑی مناسب ہے۔ ''کتنے ہی شاعر ہیں کہ مر کر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ خود تو آنکھ بند کرتے ہیں مگر ہماری آنکھ کھول دیتے ہیں:''

اے بَسا شاعر کہ بعد از مَرگ زاد
چشم خود بَر بَست و چشم ما گشاد

شکریہ

اس کتاب کا نقشِ اول میں نے اپنی بیوی بشریٰ احمد کے لیے تحریر کیا تھا۔ اگر اُنہیں اقبال سے دلچسپی نہ ہوتی تو شاید میری اپنی دلچسپی بھی اُس وقت اظہار کا راستہ اختیار نہ کرتی۔

اس کے علاوہ مجھے استادِ محترم عباس حسین کا ذکر کرنا ہے جنھوں نے کئی مراحل پر میری رہنمائی فرمائی۔ دوست حارث خلیق کا تذکرہ کرنا میرے لیے نہایت پر لطف ہے جو اس طرح میرے اعصاب پر مسلط ہوئے کہ بالآخر کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچوا کر دم لیا۔ میرے لیے یہ ایک جناتی قسم کی مہم تھی جسے حارث کے خلوص کے بغیر سر کرنا شاید اور بھی دشوار ہوتا:

ایک بیدادگر رنج فزا اور بھی ہے

اُن تمام دیدہ و نادیدہ شخصیات کا بھی مشکور ہوں جن کی مہربانی اور دلچسپی نے مجھے پہلے پہل اقبال سے شناسا کیا اور بعد میں اُس شناسائی کو بڑھنے کے مواقع فراہم کیے۔ موخر الذکر میں وہ تمام جلیل القدر اہلِ قلم شامل ہیں جن کی تحریروں سے میں نے اکتسابِ فیض کیا۔ بالخصوص محترم جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال اور ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ اول الذکر میں میرے والد مرحوم محمد شفیق شامل ہیں جن کے فیض نظر کے بغیر میں اقبال کی شاعری کو محسوس کرنے کے قابل نہ ہو سکتا تھا۔

میں اپنی والدہ امتیاز شفیق کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کی زندگی میرے لیے مشعل راہ بنی ہے۔

فہرست

ہر اک مقام سے آگے گزر گیا مہِ نو

باب ۱ زمین و آسماں

باب ۲ ماں کی آغوش کی وسعت

باب ۳ خاندانِ مرتضٰی کی بارگاہ

باب ۴ گجرات کا قید خانہ

باب ۵ حکیموں کا بازار

باب ۶ مشرقی کالج

باب ۷ ہمالہ

باب ۸ سورج کے سامنے

باب ۹ امیر کا صنم خانہ

حاشیے

کتابیں

باب ۱

زمین و آسماں

۱۸۷۹ء تک

پہلا حصہ

۱

جب کشمیر کی برف پوش چوٹیوں پر سورج کی پہلی کرن چمکتی تھی تو اقبال کے آبا و اجداد اُسے نور دینے والے کو خراجِ عقیدت پیش کرتے تھے۔

اوم!
بُھر بُھوے سَوے...
اے آفتاب کو روشن کرنے والے آفتاب!
مقدّس روشنیوں کے جھرمٹ!
ہم تیرا دھیان کرتے ہیں،
تُو ہمارے شعور کو تحریک اور تڑپ دے!

سورج کی حرارت سے زندگی کے چشمے اُبلتے تھے اور ہر چیز متحرک، جوان اور خوبصورت ہو جاتی تھی۔

کبھی اسی سورج کی محبت دل میں لے کر آریاؤں کے لشکر وسط ایشیا سے اُٹھے تھے۔ کچھ مغرب کی طرف نکلے اور اُن کی اولادوں نے یونانی فلسفے اور ادب سے مغربی تہذیب کی شمع روشن کی۔ جو ایران میں آباد ہوئے اُن میں زرتشت پیدا ہوئے۔ کچھ دریاؤں کی سرزمین میں آ پہنچے اور ان کے کارواں راوی اور گنگا کے کنارے اترنے

لگے۔

کشمیری پنڈت انہی کی اولاد تھے۔

۲

کشمیر میں اسلام بارھویں یا تیرھویں صدی میں داخل ہوا۔ پہلے پہل صوفی یہاں آئے۔ پھر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی۔

۱۲۹۵ء میں فارسی سنسکرت کی جگہ سرکاری زبان قرار پائی۔ یہ اُن آریاؤں کی زبان تھی جو ایران میں آباد ہوئے تھے مگر اسلامی فکر اور فلسفہ کا سرمایہ اِسی میں محفوظ تھا۔ کچھ برہمنوں نے سیکھی اور اُن کے ساتھی حقارت سے انہیں ''سپرو'' یعنی جلدی پڑھنے والا کہنے لگے۔

۳

پندرھویں صدی میں ایک سپرو نے اسلام قبول کیا۔

برہمن رشتہ دار اُن کے دشمن ہوگئے مگر یہ منحرف نہ ہوئے۔ بیوی سے تعلقات اچھے نہ تھے جو آنکھوں کے بھینگے پن اور ٹیڑھے پیروں پر ہنستی تھی۔ ایک روز یہ پہاڑوں سے نیچے اُتر گئے اور بارہ سال تک واپس نہ آئے۔ کئی بار حج کیا۔ کئی ملک دیکھے۔ واپس آئے تو لوگ اصل نام بھول کر انہیں بابا لول حج کہنے لگے۔ یہ ایک صوفی کے مرید ہوئے اور بقیہ عمر مرشد کے پاس ہی گزاری۔ مرتے ہوئے ہدایت کی کہ قبر کے سرہانے ان کا عصا گاڑ دیا جائے۔

وہ عصا ایک سرسبز درخت بن گیا۔[۲]

۴

اٹھارھویں صدی کا آغاز ہوا۔

بابا لول حج کی نسل سے شیخ محمد اکبر ایک صوفی سیّد کے مرید تھے۔ مرشد کے انتقال

کے بعد کچھ عرصے مریدوں کی ذمہ داری بھی اٹھائی۔ مرشد کے خاندان ہی میں اُن کی شادی ہوگئی۔

۵

۱۷۳۲ء کے کچھ برس بعد کا ذکر ہے۔

"لوگوں کا خیال ہے کہ شریعت کے احکام میں کوئی خاص مصلحت یعنی کوئی خوبی اور فائدہ پیشِ نظر نہیں ہوتا اور یہ کہ اعمال نیک و بد اور ان کی جزا سزا میں کسی قسم کی مناسبت کا ہونا ضروری نہیں،" دہلی کے محدث شاہ ولی اللہ عربی میں لکھ رہے تھے۔ "ان لوگوں کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن فرائض اور احکام سے لوگوں کو مکلّف کیا ہے ان کی مثال کسی ایسے آقا کی ہے جو اپنے غلام کی اطاعت اور اس کی فرمانبرداری کی آزمائش کرنا چاہتا ہو اور اس لیے وہ اس کو حکم دے کہ اس پتھر کو یہاں سے اٹھا کر وہاں رکھ دو یا مثلاً دوڑ کر اُس درخت کے پاس جاؤ جو یہاں سے ایک سو گز کے فاصلہ پر کھڑا ہے اس کو ہاتھ لگا کر واپس آجاؤ۔ اس سے اس آقا کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا جذبہ معلومِ خاص و عام ہو جائے۔ ویسے اس غلام کے ایسا کرنے پر کچھ فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔ یہ خیال محض غلط ہے..."

کتاب کا نام حجة اللہ البالغہ تھا یعنی خدا کے وجود پر آخری دلیل!

۶

اٹھارہویں صدی ختم ہو رہی تھی یا اُنیسویں شروع۔

شیخ محمد اکبر کے پوتے یا پڑپوتے شیخ جلال الدین تھے۔ اُن کے چاروں بیٹے اُنہیں لے کر پہاڑوں سے نیچے اُتر آئے۔ عبدالرحمٰن، محمد رمضان اور محمد رفیق سیالکوٹ میں آباد ہوئے جبکہ سب سے چھوٹے عبداللہ نے موضع سیالکوٹ کے ضلع جیٹھیکے میں سکونت اختیار کر لی۔

۷

''جو صاحب دانا اور ہندوستان کی زبان بولنے والے ہیں ان کی خدمت میں گذارش کرتا ہوں،'' میر امن دہلوی نے کلکتہ میں اپنی کتاب باغ و بہار کے مقدمہ میں تحریر کیا۔ ''یہ قصہ چار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا زری زربخش (جو اُن کے پیر تھے اور درگاہ ان کی دلی میں قلعے سے تین کوس، لال دروازے کے باہر مٹیالے دروازے سے آگے لال بنگلے کے پاس ہے) اُن کی طبیعت ماندی ہوئی۔ تب مرشد کامل کا دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور بیارداری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شفا دی۔ تب انہوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصے کو سنے گا خدا کے فضل سے تندرست رہے گا۔ جب سے یہ قصہ فارسی میں مروج ہوا۔''

اس کے بعد میر امن نے بتایا کہ وہ یہ قصہ اُردو میں کیوں منتقل کر رہے ہیں۔ ''اب خداوند نعمت، صاحب مروت، نجیبوں کے قدردان، جان گلکرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال اُن کا زیادہ رہے جب تلک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ اس قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اُردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے میں لکھنا شروع کیا ہے جیسے کوئی باتیں کرتا ہے...''

باغ و بہار ۱۸۰۴ء کے لگ بھگ کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج سے شائع ہوئی۔

۸

محمد رفیق عرف فیقا محلّہ کھٹیکا میں رہتے تھے۔ شہر میں اُن کا کپڑے اور کشمیری دھسّوں کا چھوٹا سا کاروبار تھا۔ اُن کی شادی بھی ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی مگر اولاد ہونے سے پہلے بیوی چل بسیں۔ ۱۸۱۳ء کے قریب جلال پور جٹاں کے ایک کشمیری گھرانے میں دوسری شادی ہوئی۔

یہ بیوی غیر معمولی حد تک حسین تھیں۔ان کا نام گجری پڑ گیا۔

۹

رنجیت سنگھ آندھی بن کر پنجاب پر چھایا۔ اُس نے ۱۷۹۹ء میں لاہور سے اپنی حکومت کا آغاز کیا۔ سیالکوٹ ۱۸۰۷ء اس کے قبضے میں آیا۔ سات سال بعد جب اُس کی فوجیں کشمیر پر حملہ کرتے ہوئے راستے میں سیالکوٹ ٹھہریں تو محمد رفیق نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا ہوگا۔

کشمیر پر رنجیت سنگھ کا قبضہ ۱۸۱۹ء میں ہوا۔ اگلے برس تک وہ سکھوں کی منتشر قوتوں کی شیرازہ بندی کر کے ایک عظیم پنجابی سلطنت کی بنیاد رکھ چکا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو اپنے دربار میں جگہ دی مگر اُس کے بعض اقدامات مسلمانوں کے لیے تکلیف دہ تھے۔ پنجاب کے کونے کونے سے مغل مقبروں کے قیمتی پتھر نوچ کر امرتسر میں زیرِ تعمیر گردوارے میں لگائے گئے اور شاہی مسجد اصطبل بنا دی گئی۔ اُس کے حکم پر کشمیر سے دوشیزائیں اغوا کر کے لاہور پہنچائی گئیں تاکہ گورے رنگ کی آغوش میں رنجیت سنگھ اپنے چیچک کے داغوں اور ناکارہ آنکھ کے نقص کا غم بھلا سکے۔

۱۰

"مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہندو اس وقت جس مذہبی نظام پر عمل کر رہے ہیں وہ اُن کی سیاسی ترقی میں مددگار ثابت نہیں ہو سکتا... یہ بہت ضروری ہے کہ کم از کم اُن کے سیاسی فائدے اور اُن کے رہن سہن کے آرام کے لیے اُن کے مذہب میں بعض تبدیلیاں کی جائیں۔" یہ الفاظ رام موہن رائے کے ہیں جو انہوں نے ۱۸۲۸ء میں تحریر کیے۔ وہ بنگال میں رہتے تھے جو ہندوستان میں انگریزی اقتدار کا مرکز تھا۔

اُن کی قائم کردہ برہمو سماج کی شاخیں بہت دور تک پھیل گئیں۔

۱۱

مسلمانوں کی وہ تحریک جسے ہندوستان میں اہلِ حدیث اور باقی دنیا میں وہابی تحریک کہا جاتا تھا یہ بنیادی مقصد لے کر اٹھی تھی کہ اسلام کو اُن عقائد سے پاک کیا جائے جو تصوف کی وجہ سے اور غیر مسلموں کے ساتھ میل جول رکھنے سے پیدا ہوئے تھے، خاص طور پر رسولِ اکرم کی شفاعت کو اور اولیاء اللہ کو وسیلہ سمجھنا۔ حاکمِ جابر کے خلاف جہاد کر کے شریعت کو رائج کرنا بھی اِس تحریک کے مقاصد میں شامل تھا۔شاہ اسماعیل اُس زمانے میں اہلِ حدیث کے بڑے مبلغ تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ انگریز حکومت میں مسلمانوں کے عقائد محفوظ ہیں لہٰذا مسلمانوں پر رعایا ہونے کے ناتے انگریزوں کی اطاعت فرض ہے مگر سکھوں کے ماتحت مسجدیں اصطبل بنائی جا رہی ہیں اس لیے اُن سے جہاد کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔

اِس تحریک کو سیّد احمد بریلوی کی صورت میں بلند حوصلہ قیادت میسّر آئی تو بظاہر یوں لگا کہ اب اِس کے سپاہی رنجیت سنگھ کی افواج کو روندتے ہوئے پنجاب کے سینے تک پہنچ جائیں گے۔مگر ایک طرف مجاہدوں نے نماز کے دوران شہادت کے لیے انگلی اٹھانے والے مسلمانوں کی انگلیاں کاٹنا شروع کیں اور دُوسری طرف رنجیت سنگھ بعض مقامی لوگوں کو اُن سے توڑنے میں کامیاب ہو گیا۔

اندرونی خلفشار اور رنجیت سنگھ کی افواج کے سامنے مئی ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے تاریخی معرکے میں شاہ اسماعیل اور سیّد احمد بریلوی خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

۱۲

گجری کے یہاں اب تک دس لڑکے پیدا ہوئے تھے جن میں سے کوئی بھی دودھ چھٹنے کی عمر تک زندہ نہ رہا تھا۔ ۱۸۳۷ء کے قریب گیارھواں لڑکا پیدا ہوا۔

گھر کی عورتوں نے پیروں فقیروں سے دعائیں کروائیں اور پھر کسی کو یہ سوجھی کہ بچّے کی ناک میں نتھ ڈال دی جائے تاکہ موت کا فرشتہ اُسے لڑکی سمجھ کر واپس

چلا جائے۔شاید یہی ترکیب کام کرگئی۔لڑکے کا نام نور محمد رکھا گیا مگر لوگوں میں وہ تتھو کے نام سے مشہور رہا۔

کچھ عرصہ بعد ایک اور لڑکا پیدا ہوا مگر موت کا فرشتہ اب راستہ بھول چکا تھا۔چھوٹے لڑکے کا نام غلام محمد رکھا گیا۔

۱۳

سیالکوٹ میں عبدالحکیم کا کتب خانہ خاصے کی چیز تھا۔ یہ بزرگ دوسو سال پہلے گزرے تھے اور مجدد الفِ ثانی کے اُستاد بھائی تھے۔

''افسوس! خلف وہ نہ نکلے جو سلف تھے۔خلف بنانے کے لیے آئے تھے، خلف برباد کرنے کے لیے پیدا ہوئے۔وہ کتب خانہ نا اہلوں کے پاس آکر رفتہ رفتہ تباہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ جب (رنجیت سنگھ کے بعد سکھوں کی خانہ جنگی میں) سیالکوٹ لوٹا گیا، شہر میں آگ لگائی گئی، تو یہ نادر کتب خانہ بھی جو اپنے زمانے میں شمالی ہند کالا جواب کتب خانہ تھا، سکھوں نے جلا دیا۔'' یہ تاثرات سیالکوٹ کے ایک باشندے کے ہیں جو کتب خانے کی تباہی کے وقت بچہ تھا۔[۲]

۱۴

کشمیر کے ڈوگرہ حکمراں نے اپنے آقاؤں کا ساتھ ایسے وقت میں چھوڑا جب وہ پنجاب کو انگریزوں سے بچانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔

۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے مسلمانوں سے بھری ہوئی کشمیر کی پہاڑیاں پچھتر لاکھ رُوپے (۷۵،۰۰،۰۰۰ رُوپے) کے عوض گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ دیں جس نے وعدہ کیا کہ وہ ہر سال ایک گھوڑا، بارہ بکریاں اور کشمیری شالوں کے تین جوڑے صاحب لوگوں کو بھیجا کرے گا۔

۱۵

ایک روایت کے مطابق انگریزوں اور سکھوں کی جنگ میں شیخ رفیق نے سکھوں کی فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے حصہ لیا۔[۴]

۱۶

۱۸۴۹ء میں پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ مکمل ہو گیا۔

سیالکوٹ میں انگریزوں نے اسپتال کھولا اور اینگلو ورنیکلر مڈل اسکول قائم کیا۔ پنجاب میں ڈاک کا نظام متعارف ہوا جو تیز رفتار تانگوں سے چلتا تھا۔ پکی سڑکیں بنیں جو بڑے شہروں کو ملاتی تھیں۔ چھوٹے شہروں کی طرف جانے والی سڑکیں کچی رہیں مگر راستوں پر ٹھگوں اور راہزنوں کا خطرہ قریب قریب ختم ہو گیا۔

کمپنی کی حکومت میں غلام اور کنیزیں بنانے کی ممانعت تھی۔ لڑکیوں کو اغوا کر کے اُن سے زبردستی پیشہ کروانا بھی جُرم قرار پایا۔

زمینوں کی ازسرِ نو تقسیم ہوئی۔

۱۷

پنجاب میں انگریزوں نے جو نہروں کا جال بچھایا اُس کی وجہ سے دُور دُور تک خوشحالی پھیل گئی۔ حکومت کے سامنے یہ مقصد تھا کہ رعایا کو جلد از جلد مطمئن کر دیا جائے کیونکہ مفتوحہ زمینوں کی زرخیزی پر آقاؤں کی اپنی خوشحالی کا انحصار تھا۔

''پنجاب کے اِس شہر اور ضلع (سیالکوٹ) میں جس قدر تعلیم کے فوائد کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، غالباً تمام ہندوستان میں اُس کی نظیر نہیں مل سکتی کیونکہ ... اس کے قُرب و جوار کے نوسو پچاس دیہات (میں) وہ خاص ٹیکس جو حکومت نے دیسیوں کی تعلیم کے لیے عائد کیا تھا، پیشگی ادا کر دیا گیا ہے۔''

گارسیں دتاسی۔ ۲ دسمبر ۱۸۵۵ء

۱۸

مادی ترقی کے پیچھے پیچھے عیسائی مشنری رُوحانی نجات کے تحفوں سے لدے پھندے چلے آرہے تھے۔

ہنٹر صاحب جنوری ۱۸۵۷ء میں سیالکوٹ پہنچے۔ اُن کے ساتھ ایک سیّد لڑکا محمد اسماعیل تھا جو اُن کے ہاتھ پر عیسائیت قبول کر چکا تھا۔

ہنٹر صاحب کا تعلق اسکاچ مشن سے تھا۔ اُنہوں نے ایک ماہ میں دو ورنیکلر اسکول قائم کیے جن کا مقصد نوجوان لڑکے لڑکیوں کو بائبل کی تعلیم دے کر عیسائیت میں داخل کرنا تھا۔

سیالکوٹ کے ایک جدید مورخ کا بیان ہے، ''شہروں میں اسکول قائم کرنے کے علاوہ مشنری لوگ شہر کے بازاروں میں مقامی زبان یعنی اُردو میں تبلیغ کرتے۔ ان غیر ملکی مشنریوں کے ہمراہ دیسی عیسائی بھی ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ دینی کتابچے تقسیم کرتے، دینی کتب فروخت بھی کرتے۔ لوگوں کو طبی سہولت مہیا کر کے بھی اُن کو مسیحیت کی طرف راغب کیا جاتا۔ دیہاتی لوگوں میں انہیں بڑی کامیابی ہوتی، خصوصاً کم ذات اور (نچلے طبقے) کے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔''[۵]

شیخ نور محمد جوان ہو چکے تھے مگر بچپن میں پہنی ہوئی نتھ کا نشان اب تک موجود تھا اور لوگوں میں شیخ نتھو کے نام سے زیادہ مشہور تھے۔ قد طویل تھا۔ ماں کا حسن ورثے میں پایا تھا اور خاموش طبیعت شاید بابا لول حج کے تصوف کا اثر تھی جو اَن گنت پشتوں کے بعد ان میں پوری طرح عود کر آیا تھا۔ داڑھی رکھی ہوئی تھی اور نماز روزے کے بھی پورے پابند تھے۔ اگرچہ صرف ناظرہ پڑھے ہوئے تھے مگر صوفیوں اور درویشوں کے درمیان بہت وقت گزارتے تھے۔ شائد لول حج کی طرح گھر بار چھوڑ کر ویرانوں میں جا نکلتے مگر گجری اور رفیقا اب بوڑھے ہو چلے تھے اور گھر کی ذمہ داری نور محمد کے کاندھوں پر آ گئی تھی۔

سمبڑیال میں ایک کشمیری گھرانہ آباد تھا۔ اس گھرانے کی لڑکی امام بی بی کی عمر شادی کے لائق ہوگئی تھی۔ ایک دن محمد رفیق اپنے بیٹے کی بارات لے کر پہنچے اور امام بی بی کو بڑی بہو بنا کر لے گئے۔ کچھ عرصہ بعد امام بی بی کا گھرانہ بھی سیالکوٹ ہی میں آ کر آباد ہوگیا۔

امام بی بی اور نور محمد ہم عمر تھے۔ دونوں دل کے نیک تھے اور نماز روزے کے پابند مگر اِس سے آگے اُن کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

نور محمد کی طرح امام بی بی بھی اپنے دسترخوان کی روٹی کسی دوسرے کو کھلا سکتی تھیں مگر جہاں نور محمد کے انداز میں درویش کی بے نیازی ہوتی وہاں امام بی بی کی ادا میں عنایاتِ خسروانہ کی جھلک۔ وہ بھری دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنے دل کی گہرائیوں میں کسی کو ڈھونڈتے رہتے تھے اور ان کا دل گھر کی چاردیواری میں رہتے ہوئے بھی معاشرے میں اپنے صحیح مقام کی جستجو کرتا رہتا۔

مگر اب امام بی بی اور نور محمد کے اطراف میں ایک نیا معاشرہ وجود میں آنے والا تھا اور اِس بات کا علم اُنہیں تو کیا ملکہ وکٹوریہ کو بھی نہیں تھا!

دوسرا حصہ

۱۲ اپریل ۱۸۵۷

پنجاب کے ایک اخبار میں خبر چھپی: از روئے ایک چٹھی سیالکوٹ کے ظاہر ہوا کہ یہاں کے سپاہی بھی نئے کارتوسوں کے قواعد سے ٹکراتے ہیں اور بجائے دانتوں کے ہاتھوں سے کارتوس توڑتے ہیں۔ لوگوں کے دلوں کا شک ابھی بالکل رفع نہیں ہوا۔[۱]

۱۴ مئی

ضلع سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر نے سیالکوٹ میں موجود مشنریوں کو خطرے کی اطلاع دے دی۔

صبح نو بجے امریکی مشن قلعۂ لاہور میں پناہ لینے روانہ ہو گیا۔ ہنٹر صاحب خدا کے بھروسے پیچھے رہ گئے۔

۹ جولائی

سیالکوٹ میں چند نہتے سپاہی داخل ہوئے۔ ان کا تعلق جہلم رجمنٹ سے تھا۔ ہندوستان کی کئی چھاؤنیوں میں بغاوت ہو جانے کے بعد انگریز افسروں نے ان کے ہتھیار واپس لے لیے تھے۔

ہنٹر صاحب نے فضا میں تبدیلی کے آثار دیکھ لیے اور بیوی بچوں سمیت مشن ہاؤس سے نکل کر ایک بنگلے میں پناہ لی جو چھاؤنی سے تھوڑے فاصلے پر لاہور جانے والی سڑک پر تھا۔

آدھی رات کو انہوں نے کچھ خطرہ محسوس کیا مگر اُس وقت لاہور کے لیے نکلنا ممکن نہ تھا۔

۱۰ جولائی

ہنٹر صاحب کی صبح فائروں کی آواز سے ہوئی جو انہیں صاف سنائی دے رہی تھی۔ گھوڑا گاڑی نکالی اور بیوی، بچے اور ملازم کے ساتھ بنگلے سے نکل پڑے۔

سیالکوٹ چھاؤنی میں مقامی سپاہیوں نے بغاوت کر دی تھی۔ ہنٹر صاحب نے انہیں دیکھا تو گھوڑا گاڑی قلعے کی طرف موڑ دی جہاں شہر کے تمام مشنری اور دوسرے انگریز جمع ہو رہے تھے۔ ڈسٹرکٹ جیل تک پہنچے ہوں گے کہ ان باغیوں سے سامنا ہوا جو قیدیوں کو رہا کروا رہے تھے۔ اُن میں سے کسی نے تاک کر نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ چہرے کے پرخچے اُڑ گئے۔ ہنٹر صاحب صرف تیس برس اس دنیا میں رہ پائے تھے۔

ایک اور باغی نے پستول داغا اور گولی مسز ہنٹر کو زخمی کر گئی۔ جیل کے مسلمان محافظ نے یہ دیکھا تو دوڑ کر اُن کے پاس آیا اور تلوار سے اُن کی گردن کاٹ دی۔ پھر اُن کے بچے کا سر قلم کیا۔

ہنٹر صاحب کا ملازم بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ سید حامحمد اسماعیل کے پاس پہنچا۔ جب اسماعیل زور زور سے رویا تو ملازم نے کہا، ''صاحب، ذرا آہستہ۔ آپ کی جان بھی خطرے میں ہے۔''

شاید اُسی روز

راجپوت عبدالرزّاق راٹھور نے، جو کچھ عرصہ پہلے کشمیر سے سیالکوٹ آکر انگریزی فوض میں ملازم ہوئے تھے، میجر سانڈرز اور اُس کے ساتھی پندرہ انگریز مرد اور عورتوں کو کہیں لے جا کر چھپا دیا۔

باغی عبدالرزّاق کو پکڑ کر لے گئے مگر مشہور ہے کہ راجپوت جس کی ملازمت کرتا ہے اُس کے خلاف کبھی تلوار نہیں اُٹھاتا۔ پھر یہ تو مانے ہوئے پہلوان بھی تھے۔

اگلے روز انگریزوں کو محفوظ مقام پر پہنچانے کا بندوبست ہو گیا۔ میجر سانڈرس نے عبدالرزّاق کی خدمات کے اعتراف میں ایک چٹھی لکھ دی۔

دس گیارہ دن بعد

سیالکوٹ میں امن قائم ہو گیا۔ محمد اسماعیل مضافات سے واپس آ گیا۔ مشن ہاؤس میں سوائے پھٹی ہوئی کتابوں کے اور کچھ نہ تھا۔

امریکی مشن والے لاہور سے آ گئے۔ انہوں نے اسماعیل کی کچھ مالی امداد کی۔

انگریزوں نے انصاف کرنا شروع کیا۔

۱۹ فوجی اور ۳۳ سول ملازمین کو سرِ عام پھانسی دی گئی۔

۱۴۱ فوجی ملازمین اور ۱۳ دوسرے افراد کو گولیوں کی باڑھ کے سامنے کھڑا کر کے

ہلاک کیا گیا۔

۱۱ سرکاری ملازمین کو زندان میں ڈالا گیا۔

۹۲۸ عام شہریوں کو کوڑوں کی سزا دی گئی۔

اِس گنتی میں غالباً وہ مرد اور عورتیں شامل نہیں ہیں جو فتح کی گرمی میں انگریز سپاہیوں کی بھینٹ چڑھے ہوں گے اور نہ ہی اُن گھروں کا شمار ہے جنہیں اس ہنگامے کے دوران روندا گیا ہوگا۔

جو ہندوستانی انگریزوں کے وفادار رہے تھے اُنہیں نوازا گیا۔ عبدالرزّاق راٹھور پہلے چھ روپیہ ماہوار کے ملازم تھے۔ اب اُنہیں کام پر آنے سے مستثنیٰ قرار دے کر پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرّر رہوا۔ اُن کے بعد یہ وظیفہ اُن کے بیٹے کو ملنا تھا۔

ہنٹر صاحب کی یاد میں ایک چرچ اور ایک محلّہ آباد کرنے کا فیصلہ ہوا۔

ملکہ وکٹوریہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی ختم کرتے ہوئے ہندوستان کو تاجِ برطانیہ کے مقبوضات میں شامل کرنے کا اعلان کیا۔ قیصرۂ ہند اُن کا لقب قرار پایا اور انہوں نے وعدہ کیا کہ آئندہ کسی ہندوستانی کو تبدیلیٔ مذہب پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کے ساتھ ہی سزا اور تشدد کا وہ سلسلہ بھی ختم ہوا جو پچھلے سال کے غدر کے بعد انگریزوں کی طرف سے اہلِ ہند کے خلاف جاری تھا۔

تیسرا حصہ

۲۱

۱۸۵۹ء میں نور محمد اور امام بی بی کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ شیخ عطا محمد نام رکھا گیا۔

۲۲

سید میر حسن اپنے خاندان کے باغی تھے۔

یہ امام جعفر صادق ؑ کے لڑکے ابراہیم کی نسل میں سے تھے۔کسی زمانے میں ان کا خاندان پنجاب میں آباد ہو گیا تھا۔ان کے بزرگوں کے مزار پنجاب کے کئی بڑے شہروں میں اہلِ عقیدت کی زیارت گاہیں تھے۔خاندان کے بعض لوگ شیعہ تھے اور بعض اُن کے والدین کی طرح سُنی عقیدے کے پیرو تھے۔پیشہ عام طور پر طب ہوتا تھا۔

میر حسن جب سترہ سال کے ہوئے تو انھوں نے طب پڑھنے کے بعد اُسے پیشے کے طور پر اختیار کرنے سے انکار کردیا کیونکہ تھوک اور پیشاب سے گھن آتی تھی۔گھر والوں نے کسی مسجد میں پیش امام لگوادیا کہ عربی میں شروع ہی سے تیز تھے مگر پہلی شام محلے کا ایک فرد روٹی لایا تو غیرت کے مارے ہاتھ کپکپانے لگے اور بے ہوش ہو گئے۔

اِس کے بعد انھوں نے اعلان کیا کہ وہ خیرات پر گزارہ کر کے نماز پڑھانے سے انگریز کی ملازمت کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

ضِلع اسکول والوں نے اُن کی قابلیت کے متعلق اچھی رائے قائم کی اور پندرہ روپے پر ملازم رکھ لیا مگر جب یہ وہاں سے چلنے لگے تو ایک پادری نے دریافت کرلیا کہ پہلے بھی کہیں پڑھایا ہے یا نہیں۔ان کے سچ بولنے پر تنخواہ ۱۵ روپے سے گھٹ کر ۹ روپے مہینہ ہو گئی۔[۸]

۲۳

احمد شفیع کی مادری زبان اُردو تھی مگر غدر کے حادثہ نے اُنھیں سیالکوٹ پہنچادیا تھا۔ روزی کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ناچار یہ بھی انگریز کے اسکول میں داخل ہو گئے۔

احمد شفیع کے مزاج میں اِتنی نفاست تھی کہ اُسے رحمدلی کے بجائے کمزوری سے تعبیر کیا جاسکتا تھا۔پھر بھلا میر حسن سے گہری دوستی کیوں نہ ہوجاتی جنھوں نے خود اس قسم کی کمزوریوں کی وجہ سے خاندانی پیشہ ٹھکرادیا تھا۔اِس دوستی کا میر حسن پر یہ اثر ہُوا کہ اُنھیں اُردو میں بات کرنے کا شوق ہو گیا۔سیالکوٹ میں اُردو زبان و ادب سے واقفیت

تو پہلے سے عام تھی مگر میر حسن روزمرہ عام بول چال بھی اسی زبان میں کرنے لگے۔ طلبہ سے کہہ دیا کہ کمرۂ جماعت میں پنجابی نہیں، اُردو بولی جائے گی۔

۲۴

محمد رفیق کے دُوسرے لڑکے غلام محمد کو بھی تصوف سے دلچسپی تھی مگر نور محمد کی طرح نہیں کہ دُنیا کے کام کے نہ رہیں۔ تھوڑی بہت تعلیم بھی حاصل کر رکھی تھی۔ محکمۂ نہر میں ملازم ہوئے اور روپڑ (ضلع انبالہ) چلے گئے۔

۲۵

۱۸۶۱ء میں محمد رفیق نے محلّہ کھٹیکاں چھوڑ دیا۔ مسجد دو دروازہ کے قریب ڈیڑھ سو روپے میں ایک مکان خریدا جو ایک طرف سے کشمیری محلّہ اور دوسری طرف سے چوڑی گراں میں کھلتا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا ایک منزلہ مکان تھا۔

۲۶

میر حسن کی شادی سعید بیگم سے ہُوئی جو حاجی پورہ (سیالکوٹ) کی رہنے والی تھیں اور عمر میں اُن سے تین برس چھوٹی تھیں۔

۲۷

اسکاچ مشن والے سیالکوٹ میں دوبارہ اسکول کھول چکے تھا۔ اس دفعہ یہ ادارہ پہلے سے زیادہ پختہ بنیادوں پر قائم ہُوا تھا اور حکومت سے بھی مالی امداد مل رہی تھی۔ ۱۸۶۳ء میں ایک نیا اسکول وزیر آباد میں کھولنے کا فیصلہ ہوا۔ عربی، فارسی اور اُردو کے اساتذہ کی بھرتی شروع ہوئی۔

سید میر حسن اسکاچ مشن اسکول کو ضلع اسکول سے بہتر سمجھتے تھے۔ تنخواہ زیادہ تھی، ماحول بہتر تھا۔ انہوں نے بھی درخواست پیش کی اور منتخب ہو گئے۔ گھر والوں پر قیامت

گزر گئی۔ اماموں کی اولاد عیسائی مبلغوں کی خدمت کرے!

اُس رات گھر میں دِیا نہ جلا۔

۲۸

وزیر آباد سیالکوٹ سے پچیس میل دُور تھا۔ سیالکوٹ سے وہاں جانے کے لیے عام طور پر لوگ بیل گاڑی استعمال کرتے تھے۔ میر حسن مہینے میں ایک آدھ مرتبہ واپس آتے تھے اور عموماً پیدل ہی آجاتے تھے۔ راستے میں منزلیں مقرر کر رکھی تھیں جہاں بیٹھ کر سُستا لیتے تھے۔

اسکاچ مشن کی ملازمت نے اُن کی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کو اظہار کا ذریعہ بخش دیا تھا۔ بہت جلد سب نے محسوس کیا کہ وہ دوسرے اُستادوں سے مختلف ہیں۔

حاکم رائے ایک ہندو طالبعلم تھا جو مدرسہ چھوڑ چکا تھا۔ میر حسن نے اُسے بُلایا اور اسکول میں داخل ہونے پر آمادہ کیا۔ وہ کچھ ہی عرصہ میں اسکول کے لائق طلبہ میں شمار ہونے لگا۔ دوسری طرف وہ کسی مسلمان طالب علم کو عیسائیت کی طرف مائل دیکھتے تو اُس پر خاص توجہ دے کر اسلامی عقائد کی طرف واپس لے آتے تھے۔

وزیر آباد سے چار فرلانگ کے فاصلے پر سیّد مٹھا شاہ کا مزار تھا جو داتا گنج بخش کے مریدوں میں سے ہو گزرے تھے۔ میر حسن اکثر وہاں جا کر فاتحہ پڑھتے تھے۔

۲۹

غالبؔ کے دیوان میں میر حسن کو کوئی بات نظر آئی، شاید وہی سماج سے بغاوت کی رُوح، اور اُن سے ملنے کا شوق دل میں سما گیا۔ ایک روز دامن جھاڑ کر اُٹھے اور دہلی روانہ ہو گئے۔ سفر کا کوئی وسیلہ پاس نہیں تھا۔ کہیں گھوڑا ملا تو اُس پر سوار ہوئے، نہ ملا تو پیدل چلتے گئے۔ انگریز کی عملداری تھی، ٹھگوں اور ڈاکوؤں کا خوف باقی نہ رہا تھا۔ شیر شاہ سوری کی بنائی ہوئی سڑک پر اپنے قدموں کے نشان ثبت کرتے اُس شہر میں داخل

ہوئے جہاں مغلوں کی عظمت کی قبر ابھی کچی تھی۔'

۱۸۶۳ء میں جب میر حسن غالبؔ سے ملے تو زمانے کے سب سے بڑے شاعر کی عمر ۶۶ برس تھی گویا زندگی کے آخری ۶ برس گزار رہا تھا۔ زمانے کی ناقدری، بیماری اور کبھی کبھی شراب نہ ملنا اُس کی ظرافت کا کچھ نہ بگاڑ سکے تھے البتہ جسم لاغر ہو چکا تھا۔ چوڑے چکلے ڈھانچے، کشیدہ قامت اور زبردست ہاتھ پاؤں کے ساتھ وہ اس حال میں بھی کوئی نووارد تورانی معلوم ہوتا تھا۔

میر حسن ۱۹ برس کی عمر میں یہ نہیں جان سکتے تھے کہ آگے چل کر وہ خود اُس کے اُستاد بنیں گے جس سے ملنے لوگ یونہی دُور دُور سے آیا کریں گے۔ نہ غالبؔ کو معلوم تھا کہ اُردو کے گیسوؤں کے بعد جس کے شانے پر بکھریں گے اُس عاشقِ صادق کو عشق کا پہلا سبق یہی لڑکا سکھائے گا جو ابھی اُن کے سامنے کھڑا ہے:

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

غالبؔ کو میر حسن کی صاف اُردو سُن کر خوشی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو مگر انہوں نے یہ بات ضرور دلچسپی سے سنی ہوگی کہ میر حسن سیّد زادے ہو کر مشن اسکول میں پڑھاتے ہیں:

کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

بات برائے بیت نہ تھی۔ مرزا غالب غدر سے بھی پہلے سے کہہ رہے تھے کہ انگریزوں کو دیکھو اور اُن کے آئینِ جہاں بانی سیکھو۔ اُن سے بیس سال چھوٹا ایک عزیز دوست اِس پر ناراض بھی ہوا تھا۔ معلوم نہیں غالبؔ نے میر حسن کو اُس کا قصہ سنایا یا نہیں مگر تقدیر نے شاید اُسی وقت یہ فیصلہ کرلیا کہ دس برس بعد میر حسن کو غالبؔ کے اُس دوست سے بھی ملوائے گی جب وہ شاعر کی دِکھائی ہُوئی راہ اختیار کر کے علی گڑھ تحریک کی بنیاد ڈال رہا ہوگا۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اِک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اِک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تُو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
ہم پیشہ وہم مشرب وہم راز ہے میرا
غالبؔ کو بُرا کیوں، کہو اچھا مرے آگے

۳۰

قادیان (ضلع گورداس پور) سے ایک صاحب آکر کشمیری محلے میں شیخ نورمحمد کے پڑوس میں آباد ہوئے۔ اُنتیس برس عمر تھی اور ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ملازم تھے مگر دینی علوم سے دلچسپی تھی۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ بند کمرے میں دِیا جلا کر عملیات بھی کرتے ہیں۔

یہ مرزا غلام احمد تھے۔ ایک روایت کے مطابق نورمحمد کی ان سے خاص دوستی ہوگئی۔ میر حسن وزیرآباد سے سیالکوٹ آتے تو اُن کی ملاقات بھی مرزا صاحب سے ہوتی۔ رسم وراہ بھی ہوئی مگر کچھ زیادہ اُنس پیدا نہ ہوا۔

۳۱

سردیوں کی اندھیری رات تھی۔ میر حسن اور اُن کے دوست اللہ داد یکّے پر بیٹھے وزیرآباد تحصیل کے کسی گاؤں کی طرف جارہے تھے۔ اچانک اللہ داد نے یکہ رکوایا، اُتر کر زمین سُونگھی اور اعلان کیا کہ گاؤں آگیا ہے، کسی کو آواز دو۔

یہ لوگ یہاں سائیں کیسر شاہ سے ملنے آئے تھے جن کے اللہ داد بہت معتقد تھے۔

اگلی صبح سائیں صاحب نے پوچھا، ''اللہ داد کیا کھاؤ گے؟'' اللہ داد نے گھیا توری کی فرمائش کر دی حالانکہ موسم نہ تھا۔ سائیں صاحب نے کہا، ''اچھا، چل کر دیکھتے ہیں۔'' کھیت میں گئے تو گھیا توری نظر آ گئی۔

سائیں صاحب کی باتیں عجیب ہُوا کرتی تھیں۔ ایک سُؤر پال رکھا تھا جس کی وجہ سے علاقے کے مولوی صاحبان پہلے پہل ناراض بھی ہوئے تھے۔

میر حسن نہ جانے کیا سوچ کر ایک دفعہ کسی حافظ صاحب کو اُن کے پاس لے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک مُرید نے آ کر سائیں کے سامنے سجدہ کر دیا۔ حافظ صاحب کو اپنا اِسلام یاد آیا تو سائیں صاحب نے کہا، ''مولوی صاحب! آپ حیران نہ ہوں۔ جیسے یہ لوگ ہیں، اِن کا خدا بھی میرے جیسا ہوتا ہے۔''[10]

ایک دیوان صاحب عمر بھر کی کمائی اپنے لڑکے کی شادی پر لٹا کر سائیں کے پاس آئے اور اپنے نام و نمود کا نقشہ اُتارنا شروع کیا۔ اِتنے میں کھانے کا وقت ہُوا اور سائیں صاحب نے دیوان سے کہا، ''ذرا بازار سے جا کر ایک مُولی تو لے آؤ۔ ہمیں یہی سالن کا کام دے گی۔'' دیوان صاحب کی جیب میں اُس وقت کوئی پیسہ نہیں تھا۔ اُن کی پریشانی دیکھتے ہُوئے سائیں نے کہا، ''بیٹے کی شادی پر تم نے جو نام و نمود حاصل کیا ہے وہ دے کر ایک مُولی لے آؤ۔'' دیوان صاحب نے معذوری ظاہر کی تو سائیں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا، ''بھائی، جس نمود و نمائش کی قیمت ایک مُولی بھی نہیں پڑتی اُس کے حصول سے فائدہ ہی کیا!''[11]

۳۲

میر حسن کی شیخ نور محمد سے دوستی ہوگئی تھی۔ میر حسن کی عادت تھی کہ ہمیشہ لوگوں کو اُن کے صحیح نام سے پُکارتے تھے لہٰذا سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ شیخ نور محمد کو بھی دوسروں کی طرح نتھو پکارنے کی بجائے نور محمد یا شیخ صاحب ہی کہتے ہوں گے۔

شیخ نور محمد نے تعلیم حاصل نہ کی تھی مگر حروف کی پہچان رکھتے تھے۔ دوستوں کی محفلوں میں جو کچھ سنا تھا اُس پر ہمیشہ غور کرنے کی عادت سے تصوف کے مسائل پر رائے دینے کے اہل بھی ہو گئے تھے۔ میر حسن نے اُنہیں ''اَن پڑھ فلسفی'' کا خطاب دے دیا جس کی وجہ سے ہم چشموں میں اعتبار بڑھ گیا۔

دونوں کی دوستی کا آغاز کب ہوا یہ معلوم نہیں مگر وقت آیا جب دونوں ہر کام باہمی مشورے سے کرنے لگے۔

۴۳

اِس دفعہ نور محمد اور امام بی بی کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ فاطمہ بی نام رکھا گیا۔

۴۴

۱۸۶۸ء میں حکومت نے ضلع اسکول بھی اسکاچ مشن کی تحویل میں دے دیا۔ اسکاچ مشن اب ایک معتبر ادارہ بن چکا تھا اور پھیل رہا تھا مگر مشرقی مضامین کا شعبہ بہت پیچھے تھا۔ ۱۸۶۸ء میں اسکاچ مشن سیالکوٹ نے میر حسن کو وزیر آباد سے بلوالیا کیونکہ اُن کی موجودگی سے ادارے میں عربی اور فارسی کی تعلیم کا معیار بلند ہونے کی توقع تھی۔ بیس روپے تنخواہ مقرر ہوئی۔

۴۵

سیالکوٹ کے ڈپٹی وزیر علی بلگرامی جو ۱۸۶۵ء میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بن کر آئے تھے اِس لحاظ سے ذرا مختلف تھے کہ سیّد تھے اور درویش طبعیت کے آدمی تھے۔ شیخ نور محمد سے دوستی ہوئی تو سنگر سلائی مشین خریدی اور اُنہیں اپنے یہاں ملازم رکھ لیا تا کہ ایک شخص ہمہ اوست کے قصے سننے کے لیے ہر وقت موجود ہوا کرے۔ اُن کے دل میں خیال آیا کہ روزی حلال نہیں کیونکہ بغیر محنت کیے حاصل ہو رہی ہے۔ ڈپٹی صاحب نے سنا تو کام چھوڑنے کی اجازت دے دی اور سلائی مشین بھی اُن کے حوالے کر دی کہ وہ

بھلا اور کس کام کی!

سیالکوٹ والوں کے لے یہ مشین عجوبے سے کم نہ تھی۔ نور محمد کا مکان اس کی زیارت کرنے والوں سے آباد رہنے لگا۔ اِس دوران شاید اُن میں چھپا ہوا تخلیقی رجحان اُبھر آیا کہ اُنہوں نے ایک نئی قسم کی ٹوپی ایجاد کر ڈالی۔ عورتیں اِسے بُرقعے کا حصہ بنا سکتی تھیں اور مرد اپنے سروں پر رکھ کے گھر سے باہر نکل سکتے تھے۔

یہ کاروبار چل نکلا اور ''میٹھو ٹوپیاں والے'' سیالکوٹ کی مشہور شخصیت بن گئے۔ عورتوں میں اُن کا گھرانہ ''ٹوپیاں والوں کا گھرانہ'' کہلانے لگا۔

۳۶

مرزا غلام احمد ۱۸۶۸ء میں سیالکوٹ سے چلے گئے۔

۳۷

۶ ستمبر ۱۸۷۰ء کو امام بی بی اور نور محمد کے یہاں ایک اور لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کا نام طالع بی رکھا گیا۔

۳۸

شیخ غلام محمد کے یہاں ایک بیٹی تھی، گلاب بی۔ جب وہ اپنے بھائی نور محمد کے لڑکے عطا کو دیکھتے تو اُنہیں اور اُن کی بیوی کو خواہش ہوتی کہ اُن کے یہاں بھی لڑکا ہوتا۔ شاید اسی وجہ سے اُنہیں عطا محمد سے بڑی محبت تھی۔ ایک دفعہ نور محمد نے عطا محمد کو کافی عرصہ کے لیے اُن کے پاس رہنے بھیج دیا۔

۳۹

غلام محمد کی بیوی نے ایک دفعہ پھر لڑکی کو جنم دیا تھا۔ امام بی بی کے یہاں ایک اور لڑکا ہُوا تھا۔ اُنہوں نے دیورانی کو اپنا لڑکا دے دیا اور اُن کی لڑکی لے لی۔ اُس کا نام مہتاب

رکھا گیا۔

۴۰

''اپنی مشرقی مضامین کی جماعتوں پر ہمیں جو فخر ہے وہ میرے خیال میں بالکل جائز ہے،'' اسکاچ مشن کے سیکرٹری جے پی لینگ نے اپنی رپورٹ میر حسن کے بارے میں لکھا۔ ''آج تک میں نے جتنے بھی اُستاد دیکھے ہیں وہ اُن میں سب سے بہتر اور اپنے پیشے سے زیادہ گہری شخصیت رکھنے والا اُستاد ہے۔ عربی فلسفہ اور فارسی شاعری کے لیے جو بے پناہ جوش اُس میں ہے اُسے طالبعلم میں منتقل ہوتے زیادہ دیر نہیں لگتی۔''

۱۸۷۳ء میں میر حسن ہیڈ اورینٹل ٹیچر کے عُہدے پر ترقی کر چکے تھے۔ اُن کی تنخواہ اب پچیس روپے ماہانہ تھی۔

۴۱

دیورانی کی گود میں چند روز زندہ رہنے کے بعد لڑکا مر گیا۔ امام بی بی نے اُنہیں لڑکی واپس کر دی۔

۴۲

۱۸۷۳ء میں میر حسن نے یہ خبر نہایت دلچسپی سے سنی ہوگی کہ سرسیّد احمد خاں لاہور آنے والے ہیں۔

سرسیّد کے اِس دورۂ پنجاب میں میر حسن کی اُن سے ملاقات ہوئی۔ میر حسن اُنتیس برس کے تھے۔ سرسیّد کی عمر چھپن سال تھی۔ ملاقات کی کوئی تفصیل معلوم نہیں مگر اندازہ ہوتا ہے کہ میر حسن کو جس رہنما کی تلاش تھی وہ اُنہیں مل گیا۔ سرسیّد احمد خاں وہی مقصد لے کر اُٹھے تھے جسے حاصل کرنے میں اُن کا ہم نام تیس پینتیس برس پہلے ناکام ہو چکا تھا مگر اِن کی تحریک اور اُس تحریک میں دو بنیادی فرق تھے۔ پہلا یہ تھا کہ تلوار کی جگہ تعلیم کو ہتھیار بنایا گیا تھا۔ دوسرا فرق زیادہ گہرا تھا۔ اُن کی علمی تحریک اِس بنیاد پر قائم تھی کہ

سائنس مادّی کائنات کے قوانین دریافت کرتی ہے اور مذہب انسانی معاشرے، افراد اور اقوام کی رہنمائی کے قوانین بتاتا ہے مگر چونکہ مذہبی قوانین بھی اُسی سرچشمہ قدرت سے پھوٹے ہیں جس نے مادّی کائنات تشکیل دی ہے لہٰذا اِن دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا۔ مذہب بھی قانونِ قدرت ہے لہٰذا مکمل غیر جانبداری کے ساتھ تلاشِ حقیقت کی جائے تو نتیجے میں صرف اسلام کی سچائی ہی سامنے آئے گی اور اِس سچائی کا تعلق اقوام کی زندگی کے اُن اصولوں سے ہوگا جو اَب تک پوشیدہ تھے۔

جس طرح مغربی سائنس دانوں نے مادّی کائنات کے قوانین دریافت کیے تھے اُسی طرح سرسید وہ قوانین دریافت کرنے چلے تھے جو اقوام کی زندگی کے باطن میں کارفرما ہوتے ہیں۔ تین سال پہلے خطباتِ احمدیہ کے دیباچے میں سرسید نے یہ بات تفصیل کے ساتھ بیان کی تھی مگر جن کی سمجھ میں نہیں آتی تھی وہ کہتے تھے کہ سرسید اِسلام کو جدید زمانے کے مطابق بنانے کی کوشش کررہے ہیں۔

''ہماری قوم کے لیے ہماری قوم میں تعلیم وتربیت کا کچھ بھی سامان ہندوستان میں موجود نہیں ہے،'' سرسید نے لاہور میں لیکچر دیتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے چھوٹے مکتب جو لوگوں نے تھوڑے تھوڑے ماہواری یا ششماہی چندہ سے قائم کیے ہیں۔ جن میں ایک بے ترتیب اور غیر مفید تعلیم ہوتی ہے اور بوڑھے شخص اس میں کافیہ اور مُنیہ قدوری پڑھتے ہیں اور مسجدوں میں سے یا لوگوں کے گھروں میں سے روٹی پاتے ہیں۔ کیا یہ سامان ہماری قومی تعلیم وتربیت وقومی عزت کے لیے کافی ہیں؟ میں قبول کرتا ہوں کہ جس قدر (دینی علوم) پڑھائے جاتے ہیں وہ فائدے سے خالی نہیں مگر اور دُنیاوی علوم جو ہماری زندگی کے لیے مثل غذا کے ضروری ہیں، اُن کا کیا بندوبست ہے اور اُن کی کیا تعلیم ہے؟''[۱۲]

۴۳

انبالے میں ہیضے کی وبا پھوٹ نکلی۔ غلام محمد تو بیمار ہوئے ہی، محمد رفیق بھی، جو اُن

سے ملنے آئے ہُوئے تھے، بستر کے ہو گئے۔ دونوں میں سے کوئی نہ بچ سکا۔

خاندانی روایت نے بڑے بھائی سے پہلے چھوٹے بھائی کا جنازہ طلب کرلیا تھا۔ نور محمد کو خبر ہُوئی تو وہ رو پڑ چلے آئے۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ باپ اور بھائی کے اکٹھے جنازوں میں شرکت کرنے کے مقابلے میں اُنھوں نے وبا کا اندیشہ بھی نہ کیا ہو گا۔

۴۴

کنبے کا دوگنا ہو جانا معمولی بات نہ تھی۔

نور محمد کے گھر میں اپنی بیوی، دو لڑکیاں اور ایک لڑکا پہلے سے موجود تھے۔ راتوں رات ایک عورت اور دو لڑکیوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ دوسری طرف دو کمانے والے چل بسے تھے اور یہ سارا بوجھ اُن کندھوں پر آ گیا تھا جس پر وہ اُس رومال کے سوا کوئی اور بوجھ برداشت کرنے کے شوقین نہیں تھے جسے گھر سے نکلتے ہوئے عادتاً ڈال لیتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے ٹوپیاں بنانے سے جو کاروبار چمکا تھا وہ بھی ماند پڑ چکا تھا۔ ایک چیز ایجاد کرنے کے بعد اُس میں دلچسپی برقرار رکھنا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔

عطا محمد نے کوئی خاص تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور روپے پیسے کے معاملے میں بھی محتاط نہ تھے۔ یوں بھی اگر یہ واقعہ ۱۸۷۳ء ہی کا ہے تو پھر وہ صرف تیرہ چودہ برس کے رہے ہوں گے۔

شاید اِسی موقع پر ٹوپیوں والوں کے گھرانے کی عورتوں نے کاروباری سرگرمی میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ گھر کے دوسرے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد عورتیں اور بچیاں ازار بند بُننے بیٹھ جاتی تھیں اور رات گئے تک اِس کام میں مصروف رہتی تھیں۔ یہ ازار بند نور محمد اپنی دکان پر بیچ دیتے تھے۔

۴۵

''بعد اس کے ایک نوجوان آگے بڑھا جس کا حسن شبابِ نوخیز اور دل بہادری اور

شجاعت سے لبریز تھا،'' محمد حسین آزاد نے شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا۔ ''سر پر تاجِ شاہی تھا مگر اس سے ایرانی پہلوانی پہلو چراتی تھی، ساتھ اس کے حکمتِ یونانی سر پر چتر لگائے تھی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا مگر سب اُسے دیکھ کر ایسے محو ہو گئے کہ کسی نے جواب نہ دیا۔ بہت سے مورخ اور محقق اس کے لینے کو بڑھے مگر سب ناواقف تھے۔ وہ اُس تخت کی طرف لے چلے جو کہانیوں اور افسانوں کے ناموروں کے لیے تیار ہوا تھا چنانچہ ایک شخص جس کی وضع اور لباس سب سے علیحدہ تھا ایک انبوہ کو چیر کر نکلا۔ وہ کوئی یونانی مورخ تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے جا کر سب سے پہلی کرسی پر بٹھایا۔ فرشتۂ رحمت نے میرے کان میں کہا کہ تم اس گوشے کی طرف آ جاؤ تا کہ تمہاری نظر سب پر پڑے اور تمہیں کوئی نہ دیکھ سکے، یہ سکندر یونانی ہے جس کے کارنامے لوگوں نے کہانی اور افسانے بنا دیے ہیں۔

''اس کے پیچھے ایک بادشاہ آیا کہ سر پر کلاہِ کیانی اور اس پر درفشِ کاویانی جھومتا تھا اور پھریرا علم کا پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس طرح آتا تھا گویا اپنے زخم کو بچائے ہوئے آتا ہے۔ رنگ زرد تھا اور شرم سے سر جھکائے تھا۔ جب وہ آیا تو سکندر بڑی عظمت کے ساتھ استقبال کو اٹھا اور اپنے برابر بٹھایا۔ باوجود اس کے جس قدر سکندر زیادہ تعظیم کرتا تھا اس کی شرمندگی زیادہ ہوتی تھی۔ وہ دارا بادشاہِ ایران تھا۔

''دفعتۂ سکندر نے آواز دی، 'انہیں لاؤ' جو شخص داخل ہوا وہ ایک پیر مرد بزرگ صورت تھا کہ منقیشی ڈاڑھی کے ساتھ بڑھاپے کے نور نے اس کے چہرے کو روشن کیا تھا، ہاتھ میں عصائے پیری تھا۔ جس وقت وہ آیا سکندر خود اٹھا، اس کا ہاتھ پکڑ کر لایا، اپنے برابر کرسی پر بٹھایا اور پانچ لڑی کا سہرا اس کے سر پر باندھا۔ معلوم ہوا کہ یہ نظامی گنجوی ہیں اور اس سہرے میں خمسہ کے مضامین سے پھول پروئے ہیں ہیں۔ سکندر پھر اٹھا اور تھوڑا سا پانی اس پر چھڑک کر کہا، 'اب یہ پھول کبھی نہ مرجھائیں گے۔'

''بعد اس کے جو شخص آیا اگرچہ سادہ وضع تھا مگر قیافہ روشن اور چہرہ فرحتِ روحانی

سے شگفتہ نظر آتا تھا۔ جو لوگ اب تک آ چکے تھے اُن سب سے زیادہ عالی رتبہ کے لوگ اس کے ساتھ تھے۔ اس کے داہنے ہاتھ پر افلاطون تھا اور بائیں پر جالینوس، اُس کا نام سقراط تھا۔ چنانچہ وہ بھی ایک مسند پر بیٹھ گیا۔ لوگ ایسا خیال کرتے تھے کہ ارسطو اپنے اُستاد یعنی افلاطون سے دوسرے درجے پر بیٹھے گا مگر اس مقدمہ پر کچھ اشخاص تکرار کرتے نظر آئے کہ ان کا سرگروہ خود ارسطو تھا۔ اس منطقی زبردست نے کچھ شوخی اور کچھ سینہ زوری سے مگر دلائل زبردست اور براہینِ معقول کے ساتھ سب اہلِ محفل کو قائل کر لیا کہ یہ مسند میرا ہی حق ہے اور یہ کہہ کر اول سکندر کو آئینہ دکھایا اور پھر نظامی کو سلام کر کے بیٹھ ہی گیا...''

جو مضمون وہ لکھ رہے تھے پچھلی صدی کے انگریز انشا پرداز اڈیسن کے مضمون سے ماخوذ تھا لیکن مشرق و مغرب کو انہوں نے جس طرح ملا کر دکھایا وہ ان کا اپنا حصہ تھا۔ صدیوں پہلے مولانا نظامی گنجوی نے بھی یہ کام کیا تھا اور شائد اسی لیے محمد حسین آزاد نے انہیں ارسطو سے سلام کروایا۔

'شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار' انجمن مفید عام قصور کے رسالے میں جولائی ۱۸۷۶ء میں شائع ہوا۔

۴۶

میر حسن کی بڑی بہن جنہیں خاندان والے ''بزرگ بی بی'' کہتے تھے، سخت بیمار تھیں۔ عمر میں ان سے بہت بڑی تھیں اور یہ اُن سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔

ایک روز کہنے لگیں، ''میں مر جاؤں گی اور قبر میں اکیلی رہوں گی۔ کوئی دُعا کے لیے بھی وہاں نہیں جائے گا۔'' میر حسن نے کہا، ''میں عہد کرتا ہوں کہ جب تک مجھ میں چلنے پھرنے کی طاقت رہے گی، روزانہ تمہاری قبر پر آؤں گا۔''

۷ دسمبر ۱۸۷۶ء کو بزرگ بی بی فوت ہو گئیں۔

۴۷

میر حسن کے چچا سیّد فیض اللہ مرحوم بڑی شہرت کے حکیم تھے۔

اُن کے بیٹے سیّد میر حسام الدین تھے۔ بڑے کھرے مگر سخت مزاج آدمی تھے۔ جس بات کی ٹھان لیتے تھے پھر اُس سے مشکل ہی سے ہٹتے۔

۱۸۷۶ء میں انہوں نے اپنے محلے میں مسجد بنائی جس کا نام مسجد حسام الدین رکھا۔

۴۸

۸ جنوری ۱۸۷۷ء کی دوپہر تھی۔

وائسرائے لارڈ لٹن، لیڈی صاحبہ اور اُن کے حاشیہ بردار عالی شان بگھیوں سے اُترے۔ سرسید نے خود اُن کا استقبال کیا اور اُنہیں ہمراہ لے کر شامیانے میں داخل ہُوئے۔ وہاں بہت سے مسلمان روسا اور معززین موجود تھے۔ وہ احتراماً کھڑے ہو گئے۔

آج ایک عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا جا رہا تھا۔ سرسیّد اس موقعہ پر میر حسن کو دعوت نامہ بھیجنا نہیں بھُولے تھے چنانچہ وہ بھی موجود تھے۔ سرسیّد کے فرزند بیرسٹر سیّد محمود انگریزی میں خطاب کر رہے تھے، ''ہندوستان کے محمڈنز (مسلمانوں) کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ ایک کالج قائم ہوا ہے جس کے قیام کی وجہ کسی ایک فرد کی فراخ دلی یا علم دوستی نہیں، کسی بادشاہ کی شاہانہ مہربانی نہیں بلکہ ایک پوری برادری کی مشترکہ خواہشات اور متحدہ کاوشیں ہیں۔ اس کی بنیاد بعض ایسے اسباب پر ہے جو اِس ملک کی تاریخ میں پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئے تھے... ہندوستان پر برطانوی حکومت وہ سب سے اچھی چیز ہے جو اس دُنیا نے آج تک دیکھی ہے۔''

عزت مآب وائسرائے سلامت جوابی تقریر کرنے کے بعد شامیانے کے اختتام تک تشریف لے گئے اور رسمی طور پر سنگِ بنیاد رکھا جسے مسٹر نوایز، ایگزیکٹیو انجینئر کی نگرانی میں اُس کے صحیح مقام پر اُتارا گیا تھا۔ بنیاد کے ایک خلاء میں ایک بوتل رکھی گئی جس میں

خطوط اور سکے تھے۔ اِن سب کے اوپر دھات کی ایک پلیٹ رکھ دی گئی جس پر مناسب عبارت کندہ تھی۔ جناب وائسرائے نے پتھر کو تین مرتبہ لکڑی کی ہتھوڑی سے بجا کر فرمایا، ''میں اِس پتھر کو خوب درست طریقے سے رکھا ہوا قرار دیتا ہوں۔''[۱۳]

۴۹

رات کے کھانے پر سرسیّد نے وائسرائے کے ساتھ کوئی ساٹھ مہمانوں کو دعوت دی تھی جن میں مسلمانوں اور انگریز تقریباً برابر تعداد میں شامل تھے۔ کھانے کا اہتمام خالص انگریزی طرز پر کیا گیا تھا یعنی شراب موجود تھی۔ سرسیّد نے میر حسن سے شریک ہونے کے لیے کہا تو اُنہوں نے معذرت پیش کر دی، ''میں ایسی دعوتوں میں نہیں جا سکتا۔'' سرسیّد نے دعوت سے پہلے اُن کے کھانے کا علیحدہ انتظام کر دیا۔

''علی گڑھ میں سرسیّد کے مکان پر ہم بھی قیام رکھتے تھے اور اتفاقاً ایک ہی کمرے میں شب باش تھے،'' میر حسن کا بیان ہے۔ ''آدھی رات کو جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ سرسیّد اپنے پلنگ پر موجود نہ تھے۔ اِدھر اُدھر دیکھا، نظر نہ آئے۔ آخر دیکھا کہ برآمدے کے ایک گوشے میں اندھیرے میں ٹہل رہے تھے اور رو رہے تھے۔ دریافت کیا تو... جواب دیا، 'قوم کی خستہ حالت پر غور کرتے ہوئے کوئی... موثر نسخہ نظر نہیں آتا... رو رہا ہوں کہ یا اللہ! اِس ہندوستانی قوم کا ہندستان میں کیا انجام ہوگا۔ صرف تیری رحمت کا آسرا ہے... مولوی صاحب! آپ بھی میرے ساتھ شامل ہو جایئے۔'''[۱۴]

۵۰

اُس چرچ میں جو ہنٹر صاحب کی یاد میں قائم کیا گیا تھا، ۲۷ فروری ۱۸۷۷ء کو اسکاچ مشن اسکول کا ایک طالبعلم امام الدین عیسائی ہو گیا۔

''اُس کا باپ شہر میں سب سے بڑا محمڈن صراف ہے اور بہت مالدار بتایا جاتا ہے،'' پادری ہارپر نے اپنی رپوٹ میں لکھا۔ ''اِس خبر نے سارے شہر کو ہلا کر رکھ دیا۔ اگلے روز

صبح ہی صبح اُس کے بھائیوں میں سے تین اُس سے بات کرنے پہنچ گئے اور اُس کے بعد جو منظر پیش آیا اُسے بآسانی بیان نہیں کیا جاسکتا۔

''جیسے ہی وہ نمودار ہوا ایک بھائی کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ بڑے بھائی نے جو اُس کے باپ کی نمائندگی کررہا تھا اُس سے بحث کی۔ اُس نے اُسے منہ مانگے روپے کی پیشکش کی اور بدکاری کی کھلی اجازت دے دی... جب ہر حیلہ ناکام ہُوا تو مٹھی بھر خاک اُٹھا کر اُس پر ڈال دی جو گویا تدفین کی علامت تھی اور کہا کہ اس کے بعد وہ اُن کے لیے اور اپنے خاندان کے لیے مردہ ہے۔ اس پر ایک اور بھائی جو تمام وقت اُونچی آواز میں روتا رہا تھا ایک ناقابلِ برداشت جوش سے مجبور ہو کر آگے بڑھا اور اُسے قتل کردینا چاہا۔ تاہم مَیں نوجوان کو وہاں سے ہٹا کر ایک طرف لے گیا...''

شہر کے مسلمانوں کے ایک گروہ نے ڈپٹی وزیر علی کے ساتھ مل کر فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے لیے ایسا اسکول کھولنا چاہیے جو مشنریوں کے اثرات سے پاک ہو۔ دس سال تک اِس فیصلے پر عمل نہ ہوسکا۔

اُسی مہینے ایک ہندو طالبِ علم عیسائی ہوا اور ہندوؤں نے فوراً اپنا علیحدہ اسکول کھول لیا۔

۵۱

میر حسن کے ایک ہندو دوست بھیم سین وکیل تھے۔ میر حسن اُن کے ساتھ اکثر شطرنج کھیلتے تھے۔ ۱۸۷۷ء میں مرزا غلام احمد دوبارہ سیالکوٹ آئے اور بھیم سین کے مکان پر ٹھہرے۔ حکیم حسام الدین کو اُن سے عقیدت ہوگئی تھی اور اُنہوں نے ایک روز مرزا صاحب کو دعوت دے کر اپنے گھر بھی بُلایا۔

سیالکوٹ کے مسلمانوں میں مشنریوں کے خلاف غم و غصّے کا زمانہ تھا۔ مرزا صاحب نے مشنریوں سے مناظرے کا اعلان کیا تو بہت لوگ اُن کے ہمدرد ہوگئے۔

مناظرے میں کسی کو حَکم بنانا تھا۔ ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جس پر عیسائی اور

مُسلمان دونوں بھروسہ کرتے ہوں۔ایسی شخصیت میر حسن تھے۔

۵۲

''میں نے دیکھا ایک بڑے میدان میں بہت سے لوگ کھڑے ہیں،'' نور محمد نے بتایا۔''فضا میں ایک نہایت خوبصورت رنگا رنگ پروں والا پرندہ اُڑ رہا ہے۔اُس کی دل کشی و دل فریبی کا یہ عالم ہے کہ لوگ دیوانہ وار اپنے بازو اُٹھا اُٹھا کر اُس کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔آخر وہ سراپا جمال پرندہ ایک دم فضا سے اُترا اور میری گود میں آن گرا۔''

امام بی بی اُن دنوں پھر اُمید سے تھیں۔نور محمد کے ذہن میں اپنے خواب کی جو تعبیر آئی وہ یہ تھی: ''میرے یہاں کوئی بچہ پیدا ہوگا جو خدمتِ اسلام میں ناموری حاصل کرے گا۔''[۱۵]

۵۳

لڑکا جمعے کے دن پیدا ہوا۔اُس روز ۳ ذی قعد ۱۲۹۴ ہجری تھی۔انگریزی تاریخ ۹ نومبر ۱۸۷۷ تھی۔[۱۶]

محمد اقبال!

نہیں معلوم یہ نام امام بی بی کے اَن پڑھ ذہن میں آیا تھا یا شیخ نور محمد کے بے پڑھے فلسفی ذہن میں یا کسی اور نے تجویز کیا تھا۔[۱۷]

۵۴

''زمانہ کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پُرانی شاعری سے دل بیزار ہو گیا تھا..قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے آ کر غیرت دلائی کہ...قوم کی حالت تباہ ہے۔عزیز ذلیل ہو گئے ہیں۔شریف خاک میں مل گئے ہیں۔علم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔دین کا صرف نام باقی ہے۔

افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ پیٹ کی چاروں طرف دُہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہُوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ اُمرا جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں غافل اور بے پروا ہیں۔ علما جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے تو بہتر ہے ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں جس کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے۔ ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ مگر نظم جو کہ بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے قوم کے بیدار کرنے کے لیے اب تک کسی نے نہیں لکھی۔''

الطاف حسین حالیؔ

دیباچہ مسدّس مدوجزر اسلام

۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء)

۵۵

''مخدومی مکرمی۔

''جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہُوئی ہاتھ سے نہ چھوڑی اور جب ختم ہُوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی... حق ہے۔ جو بات دل سے نکلتی ہے وہ دل میں بیٹھتی ہے۔ بے شک مَیں اِس کا محرک ہُوں اور اِس کو میں اپنے اُن اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہُوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تُو کیا لایا۔ میں کہوں گا کہ حالیؔ سے مسدّس لکھوا کر لایا ہوں۔

سیّد احمد

علی گڑھ''

جونک مشرقی طب میں ایک خاص مقام رکھتی تھی ۔ اس کی مدد سے جسم کا فاسد لہو خارج کیا جا سکتا تھا۔

ٹھیک انہی دنوں جب مسدسِ حالی کے اولین نسخے کتب فروشوں کے پاس پہنچ رہے تھے دو سالہ اقبال کے گھر والوں نے انہیں جونکیں لگوائیں جنہوں نے داہنی آنکھ کے قریب سے کچھ خون چوس لیا۔

اس وقت شاید کسی کو یہ بات معلوم نہ ہو سکی کہ ضرورت سے زیادہ خون نکل گیا ہے جس کی وجہ سے بچہ اپنی داہنی آنکھ کی بینائی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا ہے۔[۱۸]

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

باب ۲

ماں کی آغوش کی وُسعت

۱۸۷۹ء تا ۱۸۸۳ء

۱

''مجھے اپنے ہوش میں مطلق یاد نہیں کہ میری (داہنی) آنکھ کبھی ٹھیک تھی بھی یا نہیں...تا ہم میں نے اس آنکھ کی کمی کبھی محسوس نہیں کی۔ایک آنکھ سے دن کو تارے دیکھ لیا کرتا تھا!'' اقبال نے کہا۔[1]

۲

سب سے اہم علامت نور تھی۔

میاں جی (باپ) کا نام نور محمد تھا۔

بے جی (ماں) کہتی تھیں کہ اُن کی موجودگی میں بے چراغ کمرے میں تاریک شب میں عجیب قسم کا نور ظاہر ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سورج نکل آیا ہو۔[2]

۳

بہن پیدا ہُوئی۔کریم بی نام رکھا گیا۔اقبال تین برس کے تھے۔

''میرے والد ایک روز گھر آرہے تھے،'' اقبال نے کہا۔''ہاتھ میں رومال تھا...رومال میں تھوڑی سی مٹھائی...کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کتا بھوک کے مارے دم توڑ رہا ہے...مٹھائی سمیت رومال اُس کے آگے ڈال دیا...اُسے کسی نہ کسی طرح پانی بھی پلا دیا...رات کو سوئے تو خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مکان ہے جس میں مٹھائی کے طبق ہی طبق رکھے ہیں...صبح آنکھ کھلی تو اس احساس کے ساتھ کہ...ہمارے دن

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002

پھرنے والے ہیں...''[۳]

''(ہمارے والد کے دادا یا پڑدادا شیخ اکبر نے سادات کے جس خاندان کی خدمت کی)...اُسی خاندان کا ایک فرد والد ماجد کے پاس آیا اور کہنے لگا آپ دُھسّوں کی تجارت کیوں نہیں کرتے؟...کافی روپیہ جمع ہو گیا۔بس یہ ابتدا تھی ہمارے دِن پھرنے کی!''

۴

عطا محمد اِکیس برس کے ہو چکے تھے۔

''بڑے جابر آدمی تھے،'' ایک رشتہ دار نے بتایا۔ ''ایک دفعہ بازی بد کر تاش کھیل رہے تھے کہ پولیس آ گئی۔انہوں نے اطمینان سے دروازہ کھولا اور پولیس والے کو دھکا دے کر صاف نکل گئے۔''[۴]

۵

''میری پیدائش کے بعد ۱۸ سال تک والدین کے ہاں کوئی لڑکا پیدا نہ ہُوا سوائے ایک کے جو شیر خواری کے ایاّم میں ہی فوت ہو گیا،'' شیخ عطا محمد کا بیان ہے۔ ''لڑکپن میں ایک چھوٹے بھائی کی کمی شدت سے محسوس کرتا تھا۔اقبال پیدا ہوا تو مجھے اِس سرخ وسفید گول مٹول بچے سے بڑی محبت ہو گئی۔''

حقیقت ہے کہ عطا محمد اور اقبال کے باہمی تعلقات میں بھائیوں کی محبت سے زیادہ باپ کی شفقت اور بیٹے کی سعادت مندی کی جھلک نظر آتی تھی۔[۵]

۶

امام بی بی کی چچیری بہن کی شادی عبدالرزّاق راٹھور کے لڑکے خواجہ رحیم بخش سے ہُوئی تھی۔اُنہوں نے عطا محمد کے لیے عبدالرزّاق کی لڑکی کا رشتہ مانگ لیا۔

شادی کے وقت عطا محمد کی عمر اکیس برس کے قریب رہی ہو گی۔ اقبال کے ذہن میں اِس شادی کے دھندلے نقوش اولین یادوں کی صورت میں باقی رہے ہوں گے کیونکہ وہ خود اُس وقت تین برس کے تھے۔

۷

عبدالرزّاق نے اپنے اثر و رسوخ سے عطا محمد کو رسالے میں سپاہی بھرتی کروادیا۔
۹ جون ۱۸۸۰ء کو اُن کی ملازمت کا آغاز ہُوا۔[۱]

۸

تین چار برس کی عمر میں اقبال کے ذہن پر ماں، باپ اور بھائی کے تعلقات کے حوالے سے کیا اثرات مرتب ہوئے ہوں گے، اِن کے متعلق ایک دلچسپ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ عطا محمد اور اقبال میں سے بڑے بھائی اپنی والدہ پر گئے تھے اور قبال اپنے والد پر۔ پھر عطا محمد چونکہ عمر میں بھی اُن سے اٹھارہ سال بڑے تھے اور جب اقبال نے ہوش سنبھالنے کے بعد انہیں دیکھا تو وہ نہ صرف اُن کے باپ کی طرح شادی شدہ تھے بلکہ باپ سے بہتر نوکری بھی کر رہے تھے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ گھر کے مسائل پر بے جی کے ساتھ کافی ذمہ داری کے ساتھ گفتگو کرتے نظر آتے ہوں گے۔ تین چار سال کی عمر میں بچہ اپنی ماں کی محبت میں کمی محسوس کرتا ہے اور اُسے دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اقبال کے لاشعور میں یہ خیال کرم فرما نظر آتا ہے کہ یہ محبت اُن کے بھائی کو اُن سے زیادہ ملی ہے۔

بعد میں اقبال نے ایک ایسے حُسن کا تصور پیش کیا جس کی طرف بڑھ کر عشق خود حسین ہو جاتا ہے۔ نیز اُن کے تصورِ حُسن میں جو طاقت اور رُعب کا امتزاج نظر آتا ہے اُس کی داغ بیل بہت ممکن ہے کسی ایسے موقع پر پڑی ہو جب قابلِ محبت بے جی نے

ہاتھ میں ڈنڈا لے کر پہلی دفعہ اُن کی پٹائی کی ہو۔

بچہ عام طور پر اپنی ماں کی محبت حاصل کرنے کے لیے خود کو اپنے باپ کے ساتھ شناخت کرنے لگتا ہے مگر اقبال کے سامنے اپنے باپ کے علاوہ بڑا بھائی بھی تقریباً باپ کے کردار ہی میں موجود تھا۔ اگر اُنہوں نے اپنے آپ کو ان دونوں سے شناخت کیا تو پھر اُن کے وجود میں جو بیخودی اور کیف و مستی کی خودی اور قوتِ عمل کے ساتھ کشمکش نظر آتی ہے اُس کی وجہ بھی سمجھی جا سکتی ہے۔ بیخودی اور کیف و مستی نور محمد تھے اور قوتِ عمل اور خُودی عطا محمد۔ ممکن ہے کہ اقبال لاشعوری طور پر یہ دونوں آئیڈیل حاصل کرنا چاہتے ہوں تا کہ اُس حسن کو متوجہ کر سکیں جو ماں کی صورت میں اُن کے سامنے موجود تھا۔ یہ حُسن مہربان بھی تھا اور قاہر بھی، اور خداترسی کے ساتھ ساتھ دُنیاوی عزت و حیثیت کو ایک خاص اہمیت دیتا تھا۔

''میرے لیے دنیا کے معاملات میں دلچسپی لینا اور دنیا میں بڑھنے کی خواہش کرنا صرف (والدہ) کے دم سے وابستہ تھا،'' بڑے ہو کر اقبال نے کہا۔

۹

سرسیّد کی تفسیرِ قرآن کی پہلی جلد ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی۔ غالباً میر حسن سب سے پہلے خریدنے والوں میں رہے ہونگے۔

۱۰

اُسی برس مرزا غلام احمد نے قادیان سے اپنی کتاب براہین احمدیہ کی پہلی جلد شائع کی۔ اِس میں اسلام کی سچائی کے ثبوت پیش کیے گئے تھے مگر یہ دعویٰ موجود تھا کہ مصنف کو الہام ہوتا ہے۔

۱۱

''والدِ مکرم مجھے (صرف) عُلوم دین پڑھانا چاہتے تھے،'' اقبال نے کہا۔

میر حسن کے چچا فیض اللہ کی بیٹی یعنی حکیم حسام الدین کی بہن مہتاب بی بی، مولوی عمر شاہ سے بیاہی ہُوئی تھیں جو اُن کے تایا کے بیٹے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے حکیم حسامُ الدین نے جو مسجد تعمیر کروائی تھی وہیں یہ عمر شاہ لڑکوں اور لڑکیوں کو قرآن مجید ناظرہ پڑھاتے تھے۔

غالباً ۱۸۸۲ء کے اوائل میں نور محمد نے اقبال کو مولوی عمر شاہ کے مکتب میں لے جا کر بٹھا دیا۔[8] تعلیم تو میر حسن بھی دیتے تھے اور جبکہ وہ اور نور محمد ایسے گہرے دوست تھے کہ نور محمد بغیر اُن کے مشورے کے کوئی کام نہیں کرتے تھے تو پھر نور محمد نے اپنے بیٹے کو پہلے ہی میر حسن کے مکتب میں کیوں نہ داخل کروادیا؟

اِس کا یہی جواب سمجھ میں آتا ہے کہ نور محمد صُوفی تھے۔ جس بیٹے کو اسلام کی یا دوسرے الفاظ میں تصوّف کی خدمت کرنی تھی اُسے ایک ایسے شخص کے حوالے نہیں کر سکتے تھے جو سر سید جیسے مشہور وہابی اور نیچری کی تقلید کرتا ہو۔

۱۲

جس روز اقبال نے قاعدے میں پہلے الف پر اُنگلی رکھی ہوگی اُن کی زندگی میں وہ دن اُتنا ہی اہم رہا ہوگا جتنا کائنات کی تاریخ میں وہ دن جب سورج وجود میں آیا تھا یا وہ دن جب ایک زبردست بھونچال کے ساتھ زمین کے سپاٹ سینے پر ہمالیہ پہاڑ نمودار ہوا تھا۔ عقل کے ساتھ وہ مضبوط تعلق جسے اقبال کبھی نہ توڑ سکے، علم کی شراب کا وہ نشہ جو کبھی اُن کے سر سے اُتر نہیں سکا اور کتابوں کے اَوراق سے وہ محبت جس نے بالآخر اُنہیں دُنیا کے کسی کام کے لائق نہ رکھا، سب اُسی پہلے الف کے ساتھ شروع ہوئے جو اقبال نے اُس وقت سیکھا جب اُن کی عمر شاید چار سال چار ماہ رہی ہوگی۔

''اقبال بڑا شریر تھا،'' اُن کی ہم سبق کرم بی بی کا بیان ہے۔ ''طرح طرح کی شرارتیں کرتا۔ خود ہنستا، ہمیں ہنساتا۔ پڑھنے لکھنے میں بلا کا تیز۔ معلوم ہوتا تھا اُسے پہلے ہی سے سب کچھ یاد ہے۔''

ایک روز اقبال نے غلط کو ''غلت'' لکھ دیا۔ اُستاد نے کہا، ''اِسے صحیح کر دو۔'' اقبال نے جواب دیا، ''غلط تو غلط ہی رہے گا۔''

۱۳

عبدالرزّاق راٹھور اپنے داماد کو خوش حال دیکھنا چاہتے ہوں گے۔
اُسی برس عطا محمد نقشہ نویسی کی ٹریننگ کے لیے منتخب ہو گئے۔ ماں، باپ، بھائی، بہنوں اور بیوی سے رُخصت ہو کر وہ روانہ ہوئے تاکہ رُڑکی میں واقع تھامسن کالج سے نقشہ نویسی کی سند حاصل کریں اور ترقی پائیں۔

۱۴

۱۸۸۲ء میں سر ولیم ہنٹر نے اپنی تعلیمی رپوٹ شائع کی۔ سر سیّد احمد خان پہلے دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے حق میں رہے تھے مگر اب اُن کے خیالات میں انقلاب آیا اور اُنہوں نے کہا کہ اگر مسلمانوں کو ترقی کرنی ہے تو اُنہیں انگریزی میں تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔
شاید یہی موقع رہا ہو جب مولوی میر حسن نے انگریزی سیکھنے کی کوشش کا آغاز کیا۔ اگرچہ اُن کی عمر چالیس کے قریب تھی مگر اُن کے باطن کا طالب علم ابھی جوان تھا۔

۱۵

نور محمد کے گھر میں ابن عربی کی فُصُوصُ الحِکَم کے درس شروع ہوئے:[۱۰]

بعد حمد و ثنا کے معلوم ہو کہ میں نے رسول اللہؐ کو محروسۂ دمشق میں خواب میں دیکھا۔ اور یہ خواب ۶۲۷ھ کو اخیر عشرۂ محرم میں دکھلایا گیا۔
آنحضرتؐ کے دستِ مبارک میں ایک کتاب تھی۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ فُصُوصُ الحِکَم ہے۔ تُم اِس کو لے کر لوگوں کے پاس جاؤ... پس میں نے نیّت کو خالص کر کے

اس کتاب کو بغیر کمی اور بیشی کے ظاہر کرنے کا ارادہ اور ہمت باندھی... اور میں نے اللہ سے چاہا کہ مجھ کو اُن سب چیزوں میں جن کو میری اُنگلیاں لکھتی ہیں اور میری زبان بیان کرتی ہے اور میرا دل ان پر محتوی ہے، اپنی طرف سے القأ سبوحی... عطا کرے تا کہ میں ترجمہ کرنے والا بنوں نہ کہ اپنی طرف سے لکھنے والا۔ مَیں اُمّید کرتا ہوں کہ مَیں اِس کتاب میں وہی لکھ رہا ہوں جو مجھ پر خدا کی طرف سے القاٗ کیا گیا ہے۔

(ابن عربی: فُصُوصُ الحِکَم)

۱۶

۱۸۸۳ء میں عمر شاہ نے پڑھانا بند کر دیا۔

نور محمد اقبال کو لے کر شوالہ تیجہ سنگھ کی مسجد چلے آئے جہاں مَولوی غُلام حَسن پڑھاتے تھے۔"

نور محمد نے اقبال کو اسکاچ مشن اسکول کی پہلی کچی جماعت میں داخل کروایا یا نہیں اِس کے بارے میں شواہد خاموش ہیں مگر معلوم یہی ہوتا ہے کہ بڑے لڑکے کے فوج میں بھرتی ہونے کے بعد نور محمد اپنے گھرانے کی مادّی ضروریات کے بارے میں مطمئن ہو چکے تھے اور چھوٹے لڑکے کو اپنے خواب کی تکمیل کے لیے وقف کرنا چاہتے تھے۔ ممکن ہے اِس موقع پر امام بی نے اُن سے اختلاف بھی کیا ہو اور کہا ہو کہ اقبال ذہین ہے اِس لیے اُسے دُنیاوی تعلیم دلوانی چاہیے۔

۱۷

نور محمد کے گھر ایک اور لڑکی پیدا ہوئی۔ اُس کا نام زینب بی رکھا گیا۔ یہ اُن کی آخری اولاد تھی۔

۱۸

چھ سالہ اقبال اگر پڑھنے میں تیز تھے، تو اپنی بہن کریم بی کی گڑیاں توڑنا، محلے میں

پتنگ اُڑانا اور ہر طرح سے دُوسروں کی توجہ حاصل کرنا بھی اُن کا معمول تھا۔[12] ممکن ہے اُنہوں نے اپنے بڑوں کو کہتے سنا ہو، ''لڑکا بہت ذہین ہے'' اور اب اِس مفروضے کو ہر حال میں صحیح ثابت کرنے کے لیے ہر طرح اپنی ذات کا اظہار کر رہے ہوں۔ اِس سلسلے میں جہاں گھر والوں کی طرف سے اُن کی حوصلہ افزائی ہوئی ہوگی وہیں بے جی کی سخت گیری اور عطا محمد کا فوجی ڈسپلن بھی آڑے آیا ہوگا۔ اُن کے بچپن کے اُن دنوں کا تصور کرنا زیادہ دُشوار نہیں جب وہ اپنی ذہانت کے کسی غیر معمولی مظاہرے کے بعد بے جی یا چھٹیوں پر گھر آئے ہوئے عطا محمد سے ڈر کر میاں جی کے عفوِ بندہ نواز میں پناہ ڈھونڈتے ہوں۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ جب وہ خود باپ بنے تو اولاد کے معاملے میں میاں جی سے زیادہ بے جی کے نقشِ قدم پر چلے۔

۱۹

سید میر حسن شوالہ تیجہ سنگھ کی مسجد میں آئے ہُوئے تھے۔ غلام حسن بچّوں کو سبق یاد کرنے کا کہہ کر میر حسن سے گفتگو میں مصروف ہوں گے جب میر حسن کی نظر اقبال پر ٹھہر گئی۔ نہیں معلوم اقبال شرارت کر رہے تھے یا دانائی کا ثبوت دے رہے تھے مگر کوئی بات ایسی تھی کہ انہوں نے پوچھ لیا، ''کس کے لڑکے ہو؟''

سوانح نگار بتاتے ہیں کہ اِس کے بعد میر حسن، سید نور محمد کے پاس پہنچ گئے۔[13] پھر جب وہ اور نور محمد اِس پر بحث کر رہے ہوں گے کہ اقبال کو میر حسن کے مدرسے میں داخل ہونا چاہیے یا نہیں تو شاید اُن دونوں میں سے کسی کو بھی اس بات کا پوری طرح اندازہ نہ رہا ہو کہ اُن کے اُس روز کے فیصلے کا آنے والے وقتوں پر کتنا گہرا اثر ہوگا۔ تاریخ میں ایسے لمحات کم ہوں گے جب ایک قصباتی اسکول ماسٹر اور نیم پڑھے درزی کے کسی نجی فیصلے نے ایک بّرِصغیر میں بولی جانے والی ایک اہم زبان اور ایک قوم کی آیندہ نسلوں کے علاوہ اُس بّرِصغیر کے جغرافیے کا تعین بھی کر دیا ہو۔

بہرحال میر حسن اپنے دوست کو یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے کہ اُن کا مکتب چھ سالہ اقبال کے لیے بُری جگہ نہیں ہے۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

باب۳

خاندانِ مرتضیٰ کی بارگاہ

۱۸۸۴ء تا ۱۸۹۳ء

۱

سیّد میر حسن صبح اسکول جانے سے پہلے درس دیتے تھے۔

بیٹھک میں بہت سے بوریے رکھے ہوئے تھے۔ اقبال اور دوسرے بچے انہی پر بیٹھ جاتے۔ کوئی قواعدِ بغدادی پڑھتا کوئی قرآن شریف۔ کوئی سعدی کی فارسی نظمیں اور کوئی اُردو شاعری۔ میر حسن باری باری ہر ایک کو اپنے پاس بلاتے کہ وہ اپنی کتاب کا کوئی حصہ اُنہیں پڑھ کر سنائے۔ جب وہ پڑھ رہا ہوتا تو یہ اُسے مشکل الفاظ کے معنی بتاتے رہتے۔ پورا حصہ ختم ہو جاتا تو پوچھتے، ''اِس ساری بات کا کیا مطلب ہوا؟''

بعض اوقات کسی شعر کا مطلب واضح کرنے کے لیے اُس کے ہم معنی اُردو، فارسی اور پنجابی کے اشعار سُناتے تھے۔[۱]

۲

یکم جنوری ۱۸۸۴ء کو ریل گاڑی کا دھواں اُڑاتا ہوا اِنجن سیالکوٹ میں پہلی دفعہ داخل ہوا۔ یہ وزیر آباد سیالکوٹ راستے کا افتتاح تھا جس پر بعد میں اقبال نے کئی دفعہ سفر کیا۔

ریل گاڑی انگریزوں کی سائنسی ترقی کی سب سے بڑی علامت تھی۔ اس کی سیٹی، اِس کا دھواں، اِس کی رفتار، اِس کے فائدے سب کا پیغام بہت واضح تھا: دُنیا آگے بڑھ رہی ہے۔

۳

نور محمد اپنے گھرانے کی مادی ضروریات کی طرف سے مطمئن ہو گئے تھے۔ اب اقبال سے اُس تقدیر کی تکمیل کروانا چاہتے تھے جو ایک خوبصورت پرندے کی شکل میں اُنہیں نظر آئی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ اقبال کو صرف دینی تعلیم دلوائی جائے۔

میر حسن اِس بات سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ اُنہوں نے نور محمد کو سمجھایا جس کے لیے دلائل تلاش کرنے میں اُنہیں زیادہ دشواری نہیں ہوئی ہو گی کیونکہ سرسید کے گزٹ کے غالباً سبھی شمارے اُن کے مطالعے میں آ چکے تھے۔ نور محمد کو قائل ہونا پڑا اور اقبال کو قلعے پر واقع اسکاچ مشن اسکول کی شاخ میں داخل کروا دیا گیا۔ ماہانہ فیس ایک آنہ تھی۔

نور محمد جانتے تھے کہ مشن اسکول میں تعلیم پانے کے خطرات کیا ہیں۔ تقریباً یقینی بات ہے کہ اُنہوں نے اقبال کو عیسائیت سے محفوظ رکھنے کے لیے بہت سی ایسی باتیں بتائی ہوں گی جو اِس اجنبی مذہب سے اُن کا فاصلہ بڑھا دیں یا پھر اقبال کے سابقہ استاد غلام حسن کے درس میں ساتھ لے گئے ہوں گے جہاں عیسائیت کی طرف مائل طلبہ کا ذہنی علاج کیا جاتا تھا۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ مشن اسکول کے ماحول نے اقبال کی مذہبی نشوونما پر اُلٹا اثر ثبت کیا یعنی اُن کی طبیعت میں مسیحیت کے خلاف ردِ عمل پیدا ہو گیا۔

۴

رُڑکالج نے مارچ میں شیخ عطا محمد کو نقشہ نویسی کی سند دے دی۔ وہ اپنی کلاس میں اوّل آئے تھے۔ اگلے مہینے اُنہیں فوج کے پبلک ورکس کے شعبے میں سب اوورسیئر (sub-overseer) کا عہدہ مل گیا۔[۲]

عطا محمد کو روپیہ سنبھالنے کا سلیقہ کبھی نہ آیا۔ وہ سارا روپیہ یا اپنے گھر والوں پر خرچ کر دیتے تھے یا اچھے کپڑے سلوا لیتے تھے۔ اگر بعض لوگوں کی جیب میں سوراخ ہوتا ہے تو پھر عطا محمد کے متعلق یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ اُن کی جیب ہی نہ تھی۔ سارا روپیہ ہاتھوں سے نکل جاتا تھا۔ اگر امام بی بی کی دُنیاوی سمجھ وقتاً فوقتاً اس روپے کو محفوظ کرنے

کی کوئی صُورت نہ نکالتی رہتی تو گھر کی حالت کبھی نہ بدلتی مگر حالت بدل رہی تھی۔ ۴

فاطمہ بی بڑی ہو چکی تھیں۔ اُن کی شادی ایک نوجوان کرم الٰہی سے کر دی گئی جس کی کھیلوں کے سامان کی دوکان تھی۔ غالباً اِس دکان پر ریکٹ وغیرہ فروخت ہوتے ہوں گے جو یورپ اور انگلستان سے درآمد کیے جاتے تھے اور ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کے کام آتے تھے۔

۵

جملے کے درمیان وقفہ دینا ہو تو نشان (۔) لگاتے ہیں اور جملہ ختم کریں تو چار نقطے (v)۔ ہی کے نیچے زیر ہو تو ''ہی'' پڑھیں گے زبر ہو تو ''ہَے''۔

پہلی جماعت کا امتحان یکم اپریل ۱۸۸۵ء کو ہونے والا تھا۔

اس امتحان کی تیاری کے لیے اقبال نے محمد حسین آزاد کی اُردو کی پہلی کتاب یاد کی ہوگی جس کا پہلا سبق تھا:

بڑا نیک بچہ ہَی v

نازکا پلا ہُوا ہَی v

بہت شوخ بھی نہیں v

اِس کو بڑا شوق ہَی v

ایک بار میں بھی لوں؟ دُودو پیو v

۶

امتحان لینے لاہور سرکل کے اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز رائے گوپال سنگھ سیالکوٹ تشریف لائے۔ اُنہوں نے تین دن میں اپنی کاروائی مکمل کی اور ۸ اپریل کو تحریری رپوٹ پیش کر دی۔

اسکاچ مشن کے برانچ اسکول میں پہلی جماعت کے چالیس طلبہ میں سے دس فیل

ہوئے۔ چھ کو رعایتی نمبر ملے اور چوبیس باقاعدہ پاس ہُوئے۔ سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے بچے کا نام سب سے اوپر درج تھا: اقبال۔

ے

برانچ اسکول میں تیسری جماعت نہیں تھی۔

خیال یہ ہے کہ اقبال نے دوسری اور تیسری جماعتیں اکٹھی پڑھی ہوں گی یعنی اپریل ۱۸۸۵ء سے شروع ہونے والے تعلیمی سال میں اُن کی یہ دونوں جماعتیں مکمل ہوگئی ہوں گی۔

اُردو کی دوسری کتاب

تیسری جماعت میں اُردو کی تیسری اور چوتھی کتاب میں سے اِملا کروائی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب۔ حساب (سود مرکب)۔ پنجاب اور ہندوستان کا نقشہ۔

All rights reserved

اُردو زبان کی حقیقت

ہے زبان ایک اور چار مزی۔ اُسکی ہر بات میں ہزار مزی

ہندوؤں کی راج میں ہندوستان کی مختلف صُوبوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اوراس وجہ سی کہ سنسکرت سی نکلی تھیں پراکرت کہلاتی تھیں کیونکہ اُس زبان میں اِس لفظ کی معنی نکلی ہوئی کی ہیں۔ وہ زبان جو متھرا اور آگرہ کی نواح میں بولی جاتی تھی اُسکا نام... بھاشا تھا۔ ۱۱۹۱ء میں جب دہلی کی اندر مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوئی تو بادشاہی دفتر فارسی ہوگیا مگر رِعایا کی زبان وہی پراکرت رہی۔ اور مسلمانوں نی اُسکا نام ہندی رکھ دیا۔

صفحہ ۱

اُردو کی تیسری کتاب

مرتبہ ماسٹر پیارے لال

کیوریٹر سنٹرل بک ڈپو گورنمنٹ پنجاب

حسب الحکم

جناب میجر ہالرائڈ صاحب بہادر

ڈائریکٹر مدراس ممالک پنجاب وغیرہ

۸

''اب ہم لڑکوں کی ذہن کی تیزی کی لئے کچھ پہلیاں اور نسبتیں اور اشعار لکھتے ہیں...''

اصل میں لڑکوں کے ذہن کی تیزی محض بہانہ تھی۔ پیارے لال نے پہیلیاں بھی حسب الحکم کرنل ہالرائڈ صاحب ہی لکھی ہوں گی کیونکہ ہر پہیلی سے پہلے جلی قلم کے ساتھ اُس کا حل لکھا ہوا تھا جس کے بعد ذہن کی تیزی کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی تھی۔

ڈھال

ایک ناز بھنورا سی ۔ کالی
کان نہیں ۔ وہ پہنی بالی
ناک نہیں ۔ وہ سونگھے پھول
جتنا عرض ۔ وِتنا ہی طول

ارگجا

آدھا ارنا ۔ سارا ہاتھی
جن دیکھا اُن لایا چھاتی

۹

دسمبر میں بمبئی کے ایک اجلاس میں ستر کے قریب مندوبین نے ایک سیاسی جماعت

کو جنم دیا جس کے تین مقاصد تھے:

۱۔ ہندوستانی آبادی کے اُن تمام مختلف عناصر کو جو حالیہ زمانے تک ایک دوسرے کے ناموافق تھے متحد کر کے ایک سالم قوم بنانا۔

۲۔ اِس طرح وجود میں آنے والی قوم کا ذہنی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی خطوط پر احیا کرنا۔

۳۔ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان تعلق کے سبب ہندوستان کی جو حق تلفی ہوتی ہو یا اِس ملک کو جو نقصان پہنچتا ہو، اُس کا سدِ باب کرنا۔

جماعت کا نام انڈین نیشنل کانگریس رکھا گیا۔ اِس کا بانی ریٹائرڈ انگریز سول سرونٹ تھا مگر سرسید کے نزدیک اِس میں ہندوؤں کا مفاد پنہاں تھا۔ اُنہوں نے کہا، ''کیا یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ ہندوستان میں ایک نیشن ہے؟''

۱۰

زمیندار یہ ماجرا دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔ لیکن جب اُسنے موتی کو پچانا کہ۔ اُس مردہ بھیڑیے کی چھاتی پر کود رہا تھا۔ تو اور بھی اُسکی حیرانی دوچند ہُوئی۔ چرواہی کو پکار کر بولا کہ سن! اب میری دلپر یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی کہ۔ جو اپنی زندگی کاہلی۔ اور سستی میں کاٹتی ہیں اُن سی دلیری کا بھروسا رکھنا محض خطاہی۔ اور محنت اور کثرت۔ اور تادیب۔ اور تربیت سی ناچیز۔ اور بی حقیقت بھی اکثر اچھی اور کام کی بنجاتی ہیں۔

اِس کے بعد پیارے لال نے کہانی کا ماخذ درج کیا تھا اور تمّت لکھ کر اُردو کی تیسری کتاب ختم کر دی تھی۔

۱۱

اقبال نے مارچ یا اپریل ۱۸۸۶ء میں دُوسری اور تیسری جماعتیں پاس کر لیں۔ اِس امتحان کو ''لوئر اسکول اگزامینیشن'' کہتے تھے۔

اگلی جماعت میں وہ انگریزی پڑھنے والے تھے مگر شاید اسکول سے پہلے ہی اس زبان کے کچھ درس لے چکے تھے کیونکہ بعد میں یہی مشہور ہُوا کہ اُنہوں نے انگریزی کا پہلا سبق میر حسن کے چچا زاد بھائی میر حسام الدّین کے لڑکے میر حامد شاہ سے پڑھا تھا۔[۴]

۱۲

اَپر پرائمری میں چوتھی اور پانچویں جماعتیں ہوتی تھیں۔

اسکاچ مشن کی اَپر پرائمری میں انگریزی پڑھائی جاتی تھی مگر اُردو میں:

اے۔بی۔سی۔ڈی۔ای۔ایف۔جی۔ایچ۔آئی۔جے۔کے۔ایل... پہلا سبق تھا ''نام حروفِ تہجی۔''

دوسرے سبق میں شاید کچھ انگریزی الفاظ پڑھائے جاتے ہوں کیونکہ کتاب میں لکھا تھا۔جا۔نہیں۔ایسا۔کر۔کو یا پاس۔تم۔یاتمکو۔کل پینتالیس اسباق تھے۔قیمت پانچ آنے چھ پائی۔

یہ تھا ''انگلش پرائمری کا با محاورہ اُردو میں ترجمہ جسکو غلام حیدر سیکنڈ ماسٹر مدرسہ پنڈ دادن خان ضلع جہلم نے برائے افادہ طلباء چہارم پرائمری جماعت انگریزی مدارس پنجاب حسب ایمائے منشی گلاب سنگھ صاحب مالک مطبع مفیدِ عام لاہور کے تالیف کیا۔''

(بے اجازت کوئی نہیں چھاپ سکتا)

۱۳

میر حسن کے تین لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں۔اور اُنتالیس سالہ سعید بیگم ایک دفعہ پھر ماں بننے والی تھیں۔

۱۸ جون کو لڑکا پیدا ہوا مگر سعید بیگم کی حالت بگڑ گئی۔چند گھنٹوں میں چل بسیں۔

بچے کا نام مظہر رکھا گیا۔

”آپ کے اہلِ خانہ کی خبر سے سخت افسوس ہوا۔۔۔خدا آپ کا مددگار ہو۔۔۔دنیا میں۔۔۔ اِس قسم کے رنج والم پیش آجاتے ہیں۔ دوست تسلّی دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں، صبر کرو۔مگر۔۔۔صبر کرنا بھی مجبوری ہے۔صبر نہ کرے تو کیا کرے۔سُورۂ انفال کی تفسیر چھپ رہی ہے۔ اور بہت جلداس کے اوراق تقسیم ہونے شروع ہوں گے۔۔۔ والسلام۔خاکسار سیّداحمد۔علی گڑھ۔۳۱ اگست ۱۸۸۶ء۔“

۱۴

نوبرس پہلے علی گڑھ میں کالج کی بنیادرکھتے ہوئے سرسید کے صاحبزادے نے کہا تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک کالج کے قیام میں آنے کی وجہ ”پوری برادری کی مشترکہ خواہشات اورمتحدہ کاوشیں ہیں“۔

اب اسی جمہوری اصول کے تحت پورے ہندوستان کی مسلمان قوم کے نمائندوں کو دعوت دی گئی کہ دسمبر میں علی گڑھ جمع ہوکر اس فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کریں کہ اپنی قومی زندگی کی بقا کے لیے کون سا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ ”اِس وقت تک ہمارا یہ حال ہے کہ گو ہم ایک مسلمان قوم کہلاتے ہیں مگر ایک جگہ کے رہنے والے دُوسری جگہ کے رہنے والوں سے ایسے ناواقف ہیں جیسے کوئی اجنبی قوم“، سرسید نے کہا۔ اتفاقِ رائے سے فیصلہ ہوا کہ تنظیم کا نام محمڈن ایجوکیشنل کانگریس رکھا جائے اور اس کے مندرجہ ذیل مقاصد ہوں:

۱۔مسلمانوں میں یورپین سائنس لٹریچر کی اشاعت اوراعلیٰ تعلیم کی کوشش کرنا

۲۔مسلمانوں کے قدیم علوم کے متعلق تحقیقات کرنا اور اُردو اور انگریزی میں رسالے لکھوانا

۳۔مشہور علماٴ اور مصنّفین اسلامک کے سوانح حیات اُردو اور انگریزی میں مرتب کرنا

۴۔مُسلم مصنّفین کی قدیم تصانیف کی فراہمی

۵۔زمانۂ قدیم کے تاریخی واقعات کی تحقیق و اشاعت

۶۔دُنیاوی علوم کے مسائل کی تحقیق و اشاعت

۷۔شاہی فرامین کو جمع کر کے ایک کتاب انشا ٔ مرتب کرنا

۸۔مسلمانوں کی انگریزی تعلیم کی درس گاہوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا

۹۔علومِ مشرقی اور دینیات کے علما ٔ سے ربط قائم کرنا اور اُن کی تعلیم میں ترقی کی کوشش

۱۰۔قدیم مکاتب کی اصلاح وترقی ٥

۱۵

عطامحمد کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی۔اُس کا نام برکت بی بی رکھا گیا۔

جس شادی کے نتیجے میں عطامحمد کو ملازمت ملی تھی اُس کے ثمر کو یہی کہلانا چاہیے تھا مگر پھر یہ ہُوا کہ عبدالرزاق راٹھور کی بیٹی کو افیون کھانے کی عادت پڑ گئی۔بظاہر اس کی وجہ یہ ہوسکتی تھی کہ اُس زمانے میں شیر خوار بچوں کو افیون کھلا کر سلانے کا رواج تھا۔ممکن ہے برکت بی بی کی ماں نے بھی اپنی بچی پر یہ طریقہ آزمایا ہو اور کسی موقع پر خود تھوڑی سی چکھنے کے بعد باقاعدگی سے استعمال کرنے کی عادت پڑ گئی ہو مگر عطامحمد نے اُنہیں طلاق دے دی۔

جب نو دس برس کے اقبال نے پوچھا ہوگا کہ بھابھی اپنے شوہر کو چھوڑ کر کہاں چلی گئی تو بزرگوں نے اُنہیں طلاق کا مفہوم کس طرح سمجھایا ہوگا؟ طلاق کے حوالے سے گھر کے بزرگوں کے درمیان بحث کا نو دس سالہ بچے نے کیا مطلب سمجھا ہوگا؟ عطامحمد کی پہلی شادی اور اقبال کی آیندہ ہونے والی پہلی شادی کے درمیان مماثلتوں پر غور کریں تو اِس واقعے کی اہمیت بڑھتی نظر آتی ہے۔کیا یہ ممکن ہے کہ اس کچی عمر میں اقبال کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ جس بیوی کی طرف سے شکایت پیدا ہو اُسے علیحدہ کردیا جاتا ہے یا کم سے کم پہلی شادی کا قدرتی انجام علیحدگی ہے؟ عجیب بات ہے

کہ نور محمد اور امام بی بی کی اولاد میں سے اکثر کی شادیاں ناکام رہیں مثلاً آیندہ اقبال کی بعض بہنوں کی بھی اپنے شوہروں سے ناچاقی ہوئی۔

عطا محمد کی پہلی بیوی کے متعلق ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اگر اُن کی شخصیت اور بالخصوص امام بی بی کے ساتھ اُن کے تعلقات کا حال معلوم ہوتا تو شاید اقبال کے ذہن کا کوئی اور گوشہ بھی روشنی میں آ سکتا۔

۱۶

میر حسن نے عطا محمد سے کہا، ''تم نے ظلم کیا۔ اگر خود تمہیں افیون کی عادت پڑ جائے تو...؟''

۱۷

جو ظلم شیخ عطا محمد نے کیا تھا وہی میر حسن کے چھوٹے بھائی عبدالغنی کر چکے تھے۔ پہلی بیگم کو طلاق دے کر ایک برکت بی بی سے شادی کی تھی۔

اب برکت بی بی خود طلاق مانگ رہی تھیں۔ عبدالغنی سے ناخوش تھیں۔ آخر طلاق ہو گئی۔

میر حسن کی والدہ بہو کو گھر سے نکالنا نہیں چاہتی تھیں۔ انہوں نے میر حسن سے کہا کہ وہ برکت بی بی سے نکاح پڑھوالیں۔ اگر میر حسن کی پہلی بیوی زندہ ہوتیں تو شاید وہ ایک دفعہ پھر خاندان سے بغاوت کرتے کیونکہ سرسید کی تہذیبِ اخلاق میں ایک بیوی تک محدود رہنے کی بڑی اہمیت تھی مگر سعید بیگم وفات پا چکی تھیں اور شاید اسی لیے میر حسن برکت بی بی سے شادی کرنے پر راضی ہو گئے جو اپنے سات برس کے لڑکے احسان کے ساتھ میر حسن کے پاس آ گئیں۔

۱۸

۱۸۸۷ء کے ابتدائی مہینوں میں کسی وقت چوتھی جماعت کا امتحان ہُوا اور قبال

پانچویں میں آ گئے۔ اُن کی عمر دس برس تھی۔

انگریزی۔ فرسٹ ریڈر

اُردو کی پانچویں کتاب

قواعدِ اُردو مرتبہ پیارے لال آشوب

حساب (مشق کرنا۔ رول آف تھری۔ مربع کی پیائش۔ سُود)

فارسی کا انتخاب

فارسی گرامر (ترکیب نحوی۔ ترجمہ)

مفتاح الارض (دنیا کے ملکوں کے نام، دارالحکومت، قدرتی تقسیم، نیز پچھلے اسباق کا اعادہ)

۱۹

میر حسن اور سعید بیگم کا سب سے چھوٹا بچہ مظہر ساڑھے آٹھ ماہ کی عمر پا کر چل بسا۔ ۳ مارچ ۱۸۸۷ء۔

۲۰

عطا محمد کی دوسری شادی ہو گئی۔

اگر طلاق کی وجہ سے گھر کی فضا پر کوئی بوجھل پن طاری ہوا تھا تو وہ مہتاب بیگم کے آنے سے دُور ہو گیا ہو گا۔ وہ گھر کی عورتوں میں گھل مل گئیں۔ نور محمد نے جنہیں اب گھر میں میاں جی کہا جانے لگا تھا بتایا کہ وہ کس قسم کا حقہ پینا پسند کرتے ہیں چنانچہ مہتاب بیگم تمباکو کو کئی دن تک دھوپ میں سکھانے کے بعد اوکھلی میں کُوٹ کر اُس میں ایک خاص تناسب سے رَاب یعنی گنے کا رس ملاتی تھیں۔ یہ کام جو پہلے میاں جی کو خود کرنا پڑتا تھا اب مہتاب بیگم نے اپنے ذمے لے لیا۔ میاں جی کو اُن کے ہاتھ کی بھری ہوئی چلم کی ایسی عادت پڑی کہ پھر زندگی بھر کسی اور کو چلم نہ بھرنے دی۔

رات ہوتی تو مہتاب بیگم بے جی کی نگرانی میں گھر کی دوسری عورتوں کے ساتھ دیر تک ازار بند بنتی رہتیں۔ اقبال، جو اُنہیں بھابھی جی کہا کرتے تھے اُن سے ایک خاص اُنس محسوس کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ مہتاب بیگم کو سب بھابھی جی کہنے لگے اور گھر میں یہی اُن کا نام ہو گیا۔

بھابھی جی کے لیے اُن کا دس سالہ دیور اُن تمام بچوں سے مختلف تھا جو اُنہیں آج تک نظر آئے تھے۔ رات کو نیند میں اُٹھ اُٹھ کر پڑھتا رہتا اور امام بی بی سونے کو کہتیں تو جواب دیتا، ''بے جی! سویا ہوا ہی تو ہوں۔'' پھر بھابھی جی اُسے بستر پر لٹا دیتیں مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ریاضی کے جو سوالات وہ سوتے ہوئے حل کرتا تھا وہ بالکل درست ہوتے تھے۔[۷]

''مجھے تعلیم کے لیے سکول جانے کا اتنا شوق تھا کہ رات کو نیند میں بھی سکول کے ہی خواب دیکھتا ہوں گا،'' اقبال نے بعد میں کہا۔ ''ایک رات خواب ہی دیکھا ہوگا کہ سکول جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ اُٹھ کر نیند میں ہی بستہ بغل میں داب گھر کے بند دروازے پر پہنچ گیا۔ اتنے میں بھابھی جی کی آنکھ کھل گئی۔ اُنہوں نے آ کر مجھے پکڑ لیا اور پوچھا اس وقت کہاں جا رہے ہو؟ میں نے کہا، سکول۔ اُنہوں نے کہا، آنکھیں کھول کر دیکھو۔ ابھی تو آدھی رات ہے۔ پھر مجھے بستر پر لا کر سلا دیا۔ اُس دن سے میری چارپائی کے ایک طرف بے جی کی چارپائی بچھتی اور دُوسری طرف بھابھی جی کی تاکہ میں پھر کبھی رات کو سکول جانے کے لیے باہر نہ نکل کھڑا ہوں۔''[۸]

۲۱

پرنسپل نے کلاس میں شور سنا تو سمجھا کہ کوئی اُستاد نہیں مگر کلاس میں جھانکنے پر معلوم ہوا کہ میر حسن بیٹھے ہیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' پرنسپل نے پوچھا۔

''کچھ نہیں،'' میر حسن نے معصومیت سے جواب دیا۔ ''بچوں کو پڑھا رہا ہوں۔''

۲۲

شیخ گلاب دین بارہ تیرہ برس کا لڑکا تھا۔ بلا کا ذہین مگر شرارتی۔ چونکہ ہر اُستاد میر حسن نہیں ہوتا لہٰذا گلاب دین کو اسکاچ مشن اسکول سے نکال دیا گیا۔ اُس کا ذہن دُوسرے معاملات میں خاصا تیز تھا، اُس نے ماچسیں خریدیں اور بازار میں پھیری لگانی شروع کر دی۔[۱۰]

۲۳

محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں ۸ مئی کو منعقد ہوا۔ اِس کی سب سے خاص بات ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' کے عنوان سے پڑھا جانے والا تحقیقی مقالہ تھا جسے علی گڑھ کے عربی کے نوجوان اُستاد محمد شبلی نے تحریر کیا تھا۔ شبلی جو امام ابو حنیفہ سے عقیدت میں اپنے نام کے ساتھ نعمانی کا اضافہ کرتے تھے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز سال اعظم گڑھ (لکھنؤ) میں پیدا ہوئے تھے۔ والدہ کا رجحان مشرقی علوم کی طرف تھا مگر والد صاحب انگریزی تعلیم دلوانا چاہتے تھے۔ یہ والدہ کے طرف دار تھے لہٰذا گھر سے بھاگ نکلے اور مولانا فاروق چریاکوٹی سے جو حالؔی اور سرسیّد کے بہت بڑے مخالف تھے، عربی کی تعلیم حاصل کی۔ باپ کا دل رکھنے کو وکالت کا امتحان بھی پاس کر لیا مگر کبھی وکالت کی طرف مائل نہ ہوئے۔ کعبہ اور کلیسا کی یہ کشمکش علی گڑھ لے آئی جہاں وسیع کتب خانے سے متاثر ہو کر اُنہوں نے چالیس روپے ماہوار کی نوکری منظور کر لی۔

مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم والا مقالہ سرسید کی فرمائش پر ایک سال کے عرصہ میں لکھا گیا۔ اِس کی خاص بات یہ تھی کہ کثرت سے مغربی اور مشرقی اہلِ قلم کے حوالے دیئے گئے تھے اور عربی کی جن کتب سے شبلی نے استفادہ کیا تھا اُن میں سے بہت ایسی تھیں جن سے قدیم عربی مدرسے واقف نہ تھے۔ یہ کتب اکثر یورپ میں شائع ہو کر سرسید

کے ذاتی کتب خانے یا علی گڑھ کالج کی لائبریری میں پہنچی تھیں۔ مغرب کی یلغار نے ہندوستان کے مسلمان معاشرے کو جس اضطراب سے آشنا کیا تھا شبلی نعمانی علمی سطح پر اُس کی پہلی نمایندہ تخلیق تھے۔

اُن کی آیندہ کتاب کا موضوع عباسی خلیفہ المامون تھا جس کی کسی اور خصوصیت سے زیادہ وہ اس بات سے متاثر تھے کہ اُس نے پرانے زمانے میں اسلام کا دامن مغربی علوم سے بھرا تھا۔

۲۴

اسکاچ مشن اسکول میں ایک درویش داخل ہوا اور کسی سے کچھ کہے سنے بغیر اندر گھستا چلا گیا۔ پھر اُستاد کی پرواہ کیے بغیر ایک کمرۂ جماعت میں گیا اور بڑی شفقت سے ایک بچے کے سر پر ہاتھ پھیر کر اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس سے پہلے کہ اُستاد صاحب کچھ سمجھ پاتے درویش وہاں سے جا چکا تھا۔

یہ بچہ اقبال تھے۔ اُستاد نے اُن سے درویش کے متعلق دریافت کیا مگر وہ کچھ نہ بتا سکے۔ کہتے ہیں کہ وہ درویش اِس کے بعد بھی اقبال کو نظر آتا رہا۔"

۲۵

نو دس سالہ اقبال کا موسیقی کی طرف کیسے رجحان ہوا یہ معلوم نہیں۔

اُس زمانے میں عام طور پر شادی بیاہ اور دوسری تقریبات میں طوائفوں کا مجرا کروایا جاتا تھا مگر بچوں کو اُسے دیکھنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ قوالی تھی جو مزاروں یا مخصوص تہواروں پر ہوا کرتی تھی اور اِس بات کا خاصا امکان ہے کہ میاں جی اپنے لڑکے کو ایسی جگہوں پر لے گئے ہوں۔ اِن کے علاوہ میلے ٹھیلے تھے جہاں ناچ گانا ہوتا تھا۔ پھر ہندوؤں کے بھجن تھے، عیسائیوں کی مذہبی موسیقی تھی اور گلیوں محلوں میں صدا لگانے والے فقیر تھے جو اکثر گاتے ہوئے سُنائی دیتے تھے۔ اقبال نے اِن سب کا

مشاہدہ کیا ہوگا۔

ایک رات جب بے جی، بھابھی جی اور دوسری عورتیں ازار بند بُننے بیٹھیں تو اقبال کسی منظوم قصے کی کتاب لے کر پہنچ گئے اور گا کر سنانے لگے۔ پھر یہ اُن کا مشغلہ بن گیا اور جیب خرچ کے پیسوں سے بھی وہ یہی بازاری قصے خرید لاتے جن میں عام طور پر پنجابی کے صوفی شاعروں سے ماخوذ عشقیہ داستانیں ہوتی تھیں۔ اسی طرح گاتے گاتے کبھی اُن کے ذہن میں آئی تو اپنی طرف سے ایک آدھ مصرعہ بڑھا دیا۔[۱۲] عورتوں سے اِس کی داد ملی ہوگی اور یوں اُس عمل کی ابتدا ہوئی جس نے آگے چل کر 'شکوہ' اور 'جوابِ شکوہ' جیسے شاہکار تخلیق کروائے۔

نو دس سال کے اقبال جو مصرعے جڑتے تھے وہ کیسے ہوتے ہوں گے؟ اُن کی بذلہ سنج طبیعت پر غور کیا جائے اور بعد کے واقعات کو سامنے رکھا جائے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ کہیں کسی کردار کی جگہ گھر کے کسی فرد کا نام ٹھونس دیا ہوگا، کہیں محلے کے کسی واقعے کی طرف اشارہ کیا ہوگا، کہیں موقع پر موجود کسی خاتون یا کسی رشتہ دار کا مذاق اُڑا دیا ہوگا۔ غرض جب بھی دیکھا کہ شمع یا لالٹین کی ملگجی روشنی میں کوئی پلک بوجھل ہونے لگی ہے تو کوئی ایسی بات کہہ دی کہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور دوبارہ کام کرنے کے قابل ہو جائیں۔

کچھ عجب نہیں کہ یہی سوئی ہوئی قوم کو جگانے کا پہلا تصور رہا ہو۔

۲۶

''جب میری عمر کوئی گیارہ برس تھی، ایک رات میں اپنے گھر میں کسی کی آہٹ کے باعث سوتے سے بیدار ہو گیا،'' اقبال کا بیان ہے۔ ''... بے جی کمرے کی سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہی تھیں۔ میں... بے جی کے پیچھے چلتے چلتے سامنے دروازے کے پاس پہنچا جو اَدھ کھلا ہوا تھا اور اُس میں سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ بے جی اس دروازے میں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ میاں جی صحن میں بیٹھے ہیں اور

ایک نور کا حلقہ اُن کے گرد ہے۔ میں نے میاں جی کے پاس جانا چاہا تھا لیکن بے جی نے مجھے روکا اور سمجھا بجھا کر پھر سُلا دیا۔

''صبح ہُوئی تو میں سب سے پہلے میاں جی کے پاس پہنچا تا کہ اُن سے رات کا ماجرا دریافت کروں۔ بے جی پہلے ہی سے وہاں موجود تھیں... میاں جی بتا رہے تھے کہ رات اُنہیں ایک قافلے کے بارے میں کشف ہوا ہے جو کابل سے آتے ہوئے سیالکوٹ سے پچیس میل کے فاصلے پر ٹھہر گیا ہے۔ اُنہیں اُس کی مدد کرنی ہے۔''[۱۴]

پھر شیخ نور محمد نے کوئی چیز اُٹھائی اور اقبال کو ساتھ لے کر تانگے میں بیٹھے۔ چند گھنٹوں میں تانگہ وہاں پہنچ گیا جہاں قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ اِنہوں نے قافلہ سالار سے کہا کہ انہیں فوراً مریض کے پاس لے جائے۔ وہ سخت حیران ہوا کہ ایک اجنبی کو مریض کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔

مریض کے جسم کے بعض حصے گل چکے تھے اور ایسی حالت میں وہ قافلے کے ساتھ آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ اِنہوں نے کوئی راکھ جیسی چیز اُس کے بدن کے متاثرہ حصوں پر لگائی اور رشتہ داروں کو اللہ پر بھروسہ کرنے کا مشورہ دیا۔ قافلے والوں اور خود اقبال کو اُس وقت یقین آیا جب ۲۴ گھنٹے بعد مریض بہتر ہونے لگا۔ اُس کے بعد میاں جی نے علاج کے بدلے میں رقم لینے سے انکار کر دیا اور واپس آ گئے۔

اِس واقعے نے اقبال کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے۔ اپنی زندگی میں اُنہوں نے متعدد بار اپنے قریبی دوستوں کو سنایا۔ یہ تمام اصل تھا یا اُن کی یادداشت نے کچھ دھوکہ بھی دیا تھا یہ بات اہم نہیں ہے۔ وہ نفسیاتی اثر اہم ہے جو اُن کے دل و دماغ پر ہمیشہ باقی رہا۔

۲۷

ایک دن میر حسن نے بازار میں گلاب دین کو دیکھا۔ وہ ماچسیں بیچ رہا تھا۔

''کل سکول آنا،'' اِنہوں نے کہا۔ ''ہم سفارش کر کے تمہیں دوبارہ داخل کروا دیں

گے۔"

اِس حکم کو گلاب دین نے خوشخبری سمجھا یا سزا بہر حال اگلے روز اسکول میں موجود تھا۔ میر حسن نے دوبارہ داخل کروا دیا مگر گلاب دین کو اپنی ماچسیں یاد آ رہی تھیں۔ یہ بھی اُس کی طبیعت کو سمجھتے تھے چنانچہ اپنے دوست لالہ بھیم سین سے بات کر کے گلاب دین کو دو روپے ماہوار پر اُن کے لڑکے کی ٹیوشن پر رکھوا دیا۔

"ٹیوشن کا روپیہ میرے پاس جمع کرواتے رہو۔"

۲۸

۱۸۸۸ء کے ابتدائی مہینوں میں اقبال نے اَپر پرائمری کا امتحان دیا۔ اُس میں پاس ہونے پر پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے حلقہ کا اَنسپکٹر آف اسکولز باقاعدہ سند جاری کرتا تھا اور کامیاب اُمیدوار کو سرکاری ملازمت مل جاتی تھی۔

اقبال بھی کامیاب ہوئے اور خیال ہے کہ وظیفہ حاصل کیا۔ اُن کی ذہانت اور اُن کے رُجحان کو دیکھتے ہوئے نور محمد نے اُنہیں چھٹی جماعت میں داخلہ دِلوا دیا جو مڈل کی پہلی کلاس تھی۔

دُوسرا حصہ

۲۹

اقبال کے لیے چھٹی جماعت کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہ جماعت اسکاچ مشن ہائی اسکول میں تھی اور خود میر حسن عربی، فارسی اور حساب پڑھاتے تھے۔

میر حسن صبح گھر پر درس ختم کرنے کے بعد نکلتے تھے۔ پہلے مرحوم بہن کی قبر پر جاتے اور پھر اسکول۔ راستے میں کئی شاگرد ساتھ چلتے اور سبق لیتے جاتے۔ اگر اقبال کا میر حسن کے صبح والے درسوں کا سلسلہ جاری تھا تو اب وہ اُن کے ساتھ ہی اسکول جاتے ہوں گے۔

۳۰

انگریزی، اُردو، ریاضی اور تاریخ وجغرافیہ لازمی مضامین تھے۔عربی اور فارسی میں سے کسی ایک مضمون کا انتخاب کرنا ہوتا تھا۔یقین سے تونہیں کہہ سکتے مگراندازہ یہی ہے کہ فارسی کے ساتھ ذاتی دلچسپی کے باوجود اقبال کو عربی لینی پڑی کیونکہ میر حسن اِس زبان کوترجیح دیتے تھےاور نور محمد کا خواب بھی یہی تھا کہ اُن کا بیٹا اسلام کی خدمت کرے گا۔

۳۱

میر حسن کی برکت بی بی کے ساتھ اچھی نہیں نبھ رہی تھی۔وہ مزاج کی تیز تھیں اور اِنہیں برداشت کرنا پڑتا تھا۔اِس کے ساتھ ساتھ یہ اُن کے پہلے بیٹے یعنی اپنے بھتیجے احسان کی کفالت بھی کررہے تھے۔

اُن کی جوانی اگر معاشرے سے بغاوت اور بے پناہ توانائی کا مظہر رہی تھی تو اب ادھیڑعمر (۱۸۸۸ءمیں اُن کی عمر۴۴برس تھی) مستقل مزاجی سے عبارت ہوگئی تھی۔بہن سے کیا ہوا وعدہ برقرار تھا۔مجال تھی جو کسی صبح قبرستان کا ناغہ ہو جائے۔اِس کے علاوہ بعض مشاغل جو اختیار کیے ان میں بھی مذہب جیسی پابندی کا ثبوت دیا۔عربی، فارسی، اُردو، ہندی، گرمکھی اور پنجابی کتابیں جمع کرتے کرتے ایک اچھا کتب خانہ بن گیا تھا۔ بعض کتابوں پراپنے ہاتھ سے مفید اضافے بھی کرتے تھے۔قرآن مجید کا ایک نسخہ کانپور کا چھپا ہوا تھا۔اُس میں آیت نمبر نہیں تھے چنانچہ خود لگائے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کا فارسی ترجمے والا قرآن شریف کانپور کا چھپا ہوا اُن کے پاس تھا۔مطبوعہ اوراق کے درمیان سفید کاغذ چسپاں کیا، اُس پر سُرخ روشنائی سے حاشیہ کھینچا اور پھر سرسید کی تفسیر سے اُردو ترجمہ اس طرح لکھتے گئے کہ ہر آیت کا پہلا عربی لفظ سرخ روشنائی سے لکھنے کے بعد اُردو ترجمہ سیاہ روشنائی سے لکھتے تھے۔شاہ ولی اللہ کے خواب کی تعبیر سرسید کے ہاتھوں ہو رہی تھی۔

اقبال اگر اپنے اُستاد کی مستقل مزاجی اور محنت کی عادت سے واقف تھے تو ممکن ہے یہ اُن کے لیے ایک آئیڈیل بن گئی ہو۔

۳۲

اقبال کے بچپن کے دوستوں میں سے جن کے حالات معلوم ہوئے ہیں وہ خوشیا، جھنڈے خان اور محمد تقی ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے ہم جماعتوں کے نام معلوم ہیں مگر اقبال سے اُن کے تعلقات کی تفصیل دستیاب نہیں۔

خوشیا اسکول میں نہیں پڑھتا تھا۔ اقبال اُس کے مکان کے تھڑے پر بیٹھ کر شطرنج کھیلتے تھے۔[۱۴]

جھنڈے خان اُن کا ہم جماعت تھا۔

محمد تقی، میر حسن کے منجھلے لڑکے تھے۔ مرحومہ سعید بیگم کی سات نشانیوں میں سے ایک۔ اقبال سے یہ چند سال بڑے تھے مگر شاید سب سے بے تکلف دوست بھی کیونکہ بعد میں اقبال نے اُنہیں اپنے بعض نجی معاملات میں شریکِ راز رکھا۔ عمروں کے فرق کے باوجود اس گہری بے تکلفی کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اقبال ذہانت میں اپنی عمر سے بہت آگے تھے۔

محمد تقی کے چھوٹے بھائی ذکی قریب قریب اقبال کے ہم عمر تھے۔ اقبال کا کچھ وقت اُن کے ساتھ بھی گذرا۔

اِن سب دوستوں میں اقبال اپنے مختصر نام ''بالا'' سے پکارے جاتے تھے۔

۳۳

اگر اقبال کسی روز اسکول نہ آتے تو میر حسن بے چین رہتے۔ ''اقبال نہیں آیا؟'' وہ بار بار پوچھتے۔

اُس زمانے کے دوسرے اساتذہ کے برعکس میر حسن کو اپنے شاگردوں سے نجی کام

کروانے کی عادت نہ تھی۔ صرف ایک دو مخصوص شاگردوں کو وہ کبھی کوئی زحمت دیتے تھے اور اقبال اُنہی میں سے ایک تھے۔

ایک شام اقبال اُن کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ احسان علی بھی تھا۔ وہ غالباً تھک گیا ہو گا کیونکہ میر حسن نے اقبال سے کہا کہ اُسے اُٹھا لیں مگر احسان تگڑا بچہ تھا، اقبال سے صرف تین سال چھوٹا۔ جلد ہی اقبال خود تھک گئے اور اُسے ایک دُکان کے تختے پر بٹھا کر ستانے لگے۔ میر حسن چلتے چلتے پلٹ آئے اور اقبال کا نام لے کر کہا، ''اِس کی برداشت بھی دُشواری ہے؟'' اقبال بازاری قصوں میں مصرعے چست کرنے کے عادی تھے۔ بے اختیار زبان سے نکل گیا، ''تیرا احسان بہت بھاری ہے!''

میر حسن نے ذو معنی مصرعے کی داد دی یا شوخ چشمی کی سزا، یہ معلوم نہیں مگر اقبال خود اتنے شرمندہ ہوئے کہ زندگی بھر ''شاہ جی'' کے سامنے اپنا کوئی مصرعہ نہ کہنے کا ارادہ کر لیا۔[۱۵]

شاہ جی کے سامنے اور بات تھی مگر اسکول میں اقبال گونگے طالبعلم نہ تھے۔ بائبل پڑھانے والوں سے اکثر اُلجھتے اور کبھی کبھار کسی اُستاد کے سامنے بڑی شوخی سے اپنی ذہانت کا ثبوت دے جاتے۔ وقت کی پابندی کرنا ایک ایسی خوبی تھی جس سے اقبال گویا فطری طور پر معذور تھے لہٰذا ایک مرتبہ کسی اُستاد نے دیر سے آنے کا سبب پوچھا تو کہہ بیٹھے، ''اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے۔''[۱۶]

تُکّی کو ایک نیا شوق ہوا اور اقبال نے اُس پر چند مصرعے چُست کر دیے۔[۱۷] اقبال کے اوّلین مصرعے ہیں جو دستیاب ہوئے ہیں:

دل میں آئی جو تُکّی کے تو کبوتر پالے
جمع لا لا کے کیے لال، ہرے، ٹُمیالے

اُن میں ایسے ہیں جو ہیں پہروں کے اُڑنے والے

...

اب یہ حال کہ آنکھیں ہیں کہیں پاؤں کہیں
پاؤں کے نیچے نہ معلوم زمیں ہے کہ نہیں

کچھ عجب نہیں کہ پہلی دفعہ اِن مصرعوں کو لکھ کر اقبال نے سب دوستوں کو جمع کیا ہو اور منظوم بازاری قصوں کی پیروڈی کرتے ہوئے کوئی ''قصہ محمد تقی'' بنا کر گایا ہو۔

۳۵

''خوشیا! کبوتروں کو نیلی فضا میں اُڑتے دیکھ کر میں محسوس کرتا ہوں جیسے میں خود بھی آسمان کی بلندیوں میں پرواز کر رہا ہوں۔ میرے دل میں عجیب سا احساس پیدا ہوتا ہے۔''[۱۸]

اقبال کا شوق دیکھتے ہوئے میاں جی نے بھی گھر میں کبوتر رکھنے کی اجازت دے دی۔

۳۶

اقبال پتنگ بھی اُڑاتے تھے اور رات کے وقت چاند ستاروں کا مشاہدہ بھی دلچسپ لگتا ہوگا۔ آسمان کی طرف دیکھنے کا یہ رویہ اُن کی نفسیات کا مستقل حصہ بن گیا اور بڑے ہونے کے بعد اُن کی نظموں میں بھی جھلکتا رہا۔

۳۷

پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس بوڑھا کسان سڑک کے کنارے پھیلے ہوئے گندم کے کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا۔ اقبال، سید ذکی اور دوسرے دوستوں کے ساتھ وہاں سے گزرے تو کسان کے پاس ٹھہر گئے اور اُس سے پوچھا، ''بابا! گندم کے یہ کھیت کس کے

ہیں؟‘‘

کسان نے جواب دیا، ’’یہ کھیت تو میرے ہیں لیکن... گندم نہ جانے کس کی ہے!‘‘[19]

۳۸

’’بالے سے میری لڑائی زندگی میں صرف ایک بار ہوئی،‘‘ خوشیا کا بیان ہے۔ یہ دونوں امام صاحب کا میلہ دیکھنے گئے تھے۔ اقبال نے پیسوں کو احتیاط سے رکھنے کی جبلت اپنی ماں سے ورثے میں حاصل کی تھی اور اس معاملے میں اپنے بڑے بھائی کی ضد تھے۔ چنانچہ خوشیا نے اپنی اٹھنی بھی اقبال کی دوانّی کے ساتھ رکھوا دی۔ کھانے کا وقت آنے پر معلوم ہوا کہ اقبال وہ سارے پیسے ایک اندھے فقیر کی نذر کر چکے ہیں جو رو رو کر بھیک مانگ رہا تھا۔ ’’تم نے بددیانتی کی ہے!‘‘ خوشیا نے سخت لہجے میں کہا۔ اقبال کوئی جواب دیے بغیر ہجوم میں گم ہو گئے اور پھر بہت دنوں تک خوشیا کو دکھائی نہ دیے۔

پورے دو مہینے بعد ایک دن اُس کی ماں نے اُسے بتایا کہ اُس کی غیر موجودگی میں بالا آیا تھا اور ایک اٹھنی دے کر چلا گیا ہے۔ خوشیا اُسی وقت میر حسن کے یہاں پہنچا۔ اقبال اُسے دیکھ کر فوراً کمرے سے باہر نکل آئے۔

’’تمہاری اٹھنی تمہیں واپس مل گئی ہے۔ اب ہم پھر دوست ہیں۔‘‘[20]

۳۹

مولوی میر حسن کے دوستوں میں سے ایک حکیم نورالدین تھے۔ یہ حضرت عمر فاروقؓ کی اولاد میں سے تھے اور قرآن وحدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ طب میں ان کی مہارت کے پیشِ نظر مہاراجہ کشمیر نے انہیں اپنا طبیب مقرر کیا تھا چنانچہ قیام جموں میں تھا۔ کبھی کبھی اپنے آبائی گاؤں بھیرہ آتے ہوئے سیالکوٹ میں قیام کرتے اور دوستوں سے ملتے۔

ایک دفعہ میر حسن اپنے شاگرد محمد دین بھٹی کے ساتھ حکیم نورالدین کو اسٹیشن چھوڑنے

جارہے تھے۔ راستے میں حکیم صاحب کو نہ جانے کیوں وہ واقعہ یاد آ گیا جب بستر علالت پر رسول کریمؐ نے فرمایا تھا کہ لاؤ میں وہ چیز لکھ دوں جس سے اُمت کبھی گمراہ نہ ہو گی اور حضرت عمر فاروقؓ نے جواب دیا تھا کہ نہیں، قرآن ہمارے لیے کافی ہے۔ حکیم صاحب میر حسن سے بولے، ''دیکھا! ہمارے جدامجد نے کہا، حسبنا کتاب اللّٰہ''

میر حسن سنّی تھے مگر حضرت علیؓ کی اولاد میں سے تھے۔ انہوں نے فوراً جواب دیا، ''...آپ کے جدامجد نے یہ بھی فرمایا تھا، لولا علی لهلك عمر... (اگر علی نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہو جاتا)''[۲۱]

بظاہر تو یہ حاضر جوابی کا شگوفہ ہے مگر دیکھا جائے تو اس میں تفضیل علی کا ایک پہلو نکلتا ہے یعنی جس ہستی نے کتاب اللہ کو مسلمانوں کے لیے کافی سمجھا اُسے بھی قرآن کے بعد حضرت علیؓ کی ضرورت محسوس ہو کر رہی۔ میر حسن کی وہابیت اپنی جگہ مگر اس دلچسپ مکالمے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے ناقدین کو اقبال کی طبیعت میں جو ذرا سا تشیع بھی نظر آتا تھا اُس میں کسی حد تک میر حسن کا اثر کارفرما ہو سکتا تھا۔

۴۰

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا تیسرا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۹ء کو لاہور میں منعقد ہوا اور چار دن جاری رہا۔ خان بہادر سردار محمد حیات خاں صدارت کر رہے تھے اور شرکت کے لیے لاہور آنے والوں میں خود سرسید شامل تھے۔

لاہور اسٹیشن کی سرخ عمارت اُس روز کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ بوڑھے رہنما کی خوش قسمتی سے ڈبہ وہیں رکا جہاں میر حسن اپنے لڑکے ذکی اور ایک پہلوان علی بخش منہار کے ساتھ کھڑے تھے۔ پہلوان نے دیکھا کہ سفید داڑھی والے بزرگوار کو اُترنا دشوار ہو رہا ہے تو اپنے دونوں بازو پھیلا کر اُن کی مشکل آسانی کر دی۔

اِس اجلاس میں مرأۃ العروس والے ڈپٹی نذیر احمد پہلی دفعہ تشریف لائے تھے۔ باغ و بہار طبیعت کی وجہ سے اُن کا لیکچر خاصا مقبول ہوا۔

ایجوکیشنل کانگریس کے آخری روز طلبہ نے سرسید کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا جس میں قوم کی تعلیمی حالت اور اُردو زبان کے سلسلے میں ان کی خدمات کو سراہا گیا۔

غالباً یہ واقعہ بھی اسی موقع کا ہے کہ سرسیّد نے اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ کے طلبہ سے کہا، ''یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم مسلمان ہو کر عیسائیوں کے کالج میں پڑھتے ہو۔ تمہیں اپنے مذہب کے حقائق کا علم نہیں۔ تم پادریوں کے زیر اثر آ جاؤ گے۔''

اِس پر میر حسن نے کہا، ''یہ قصور میرا ہے۔ مجھ سے پڑھنے کے لیے یہ وہاں داخل ہوئے ہیں۔''

سرسید نے طلبہ کو دوبارہ مخاطب کیا اور کہا، ''اگر ایسا ہے تو کوئی حرج نہیں۔ پھر تو سب مسلمان بچوں کو اسکاچ مشن کالج میں داخل ہونا چاہیے۔''[۴۰]

اُس وقت اقبال کی عمر بارہ سال سے کم تھی۔ اگر وہ اپنے شاہ جی کے ساتھ جلسہ میں شرکت کے لیے آئے تھے تو پھر یہ واحد موقع ہو گا جب اُنہوں نے سرسید کو دیکھا ہو مگر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ میر حسن کے ساتھ نہیں آئے تھے کیونکہ محمد ذکی نے اِس موقعے کا ذکر کرتے ہوئے اُن کا کہیں نام نہیں لیا۔

۴۱

گلاب دین نے میٹرک پاس کر لیا تھا۔ میر حسن نے اُس کے جمع کیے ہوئے روپے اُس کے حوالے کیے اور کہا، ''لاہور جا کر تعلیم حاصل کرو۔ بی اے کرو، مختاری کا امتحان بھی دینا۔ بھوکے بھی مرنے لگو تو لاہور مت چھوڑنا۔''

وہ لاہور روانہ ہو گیا۔

۴۲

اُردو ہندی کا جھگڑا معاشرے کی فضا پر اثر ڈال رہا تھا۔ میر حسن کے دوست لالہ بھیم سین خود فارسی کے عالم تھے مگر آریہ سماج تحریک سے متاثر ہو کر اپنے لڑکے کنور سین کو

مڈل میں عربی پڑھنے سے روک دیا۔ وہ میر حسن کے سامنے بیٹھ چکا تھا۔ اُس کا رجحان دیکھتے ہوئے میر حسن نے دوست کو مشورہ دیا کہ کنور کے لیے عربی پڑھنا بہتر رہے گا اور پھر یہ ہوا کہ دونوں دوستوں نے شطرنج بھول کر کنور سین پر شرط لگا دی۔

کنور گھر پر پنڈت جی سے سنسکرت پڑھنے لگا اور میر حسن کے پاس جا کر اُن سے عربی۔ دیکھنا یہ تھا کہ اُس کے نمبر کس مضمون میں زیادہ آتے ہیں۔

۴۳

۲۳ مارچ ۱۸۸۹ء کو مرزا غلام احمد نے پنجاب کے شہر لدھیانہ میں ایک مرید کے گھر سے اعلان کیا کہ خدا نے مسلمانوں کو اُن کی بیعت کا حکم دیا ہے۔ سب سے پہلے جس نے بیعت کی وہ حکیم نورالدین تھے۔

یہ اُس متنازعہ تحریک کی چھوٹی سی ابتدا تھی جو آگے چل کر اس خطے کی سیاست میں کئی ہنگاموں کا بہانہ بنی۔

۴۴

۱۸۸۹ء کے اوائل میں اقبال نے چھٹی جماعت پاس کی اور کنور سین نے مڈل۔ اُس کے سنسکرت سے زیادہ عربی میں نمبر آئے تھے۔ لالہ جی شرط ہار گئے اور بیٹے کو انٹرنس میں عربی پڑھنے کی اجازت دے دی۔

۴۵

ساتویں جماعت میں بھی وہی مضامین تھے جو چھٹی میں ہوتے تھے مگر ریاضی میں جبر و مقابلہ کا اضافہ ہو گیا تھا جس کی نصابی کتاب ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب نے شائع کی تھی۔ ۱۶۳ صفحات ۴ آنے ۶ پائی۔

۴۶

۱۳ مارچ ۱۸۹۰ء کو سیالکوٹ سے جموں تک ریل گاڑی کا افتتاح ہوا۔ ۲۴ میل کے سفر کا پانچ آنے کرایہ مقرر ہوا تھا مگر پہلے دو دن ہر شخص کو مفت سفر کرنے کی اجازت تھی۔ یہ معلوم نہیں کہ اقبال اور اُن کے دوستوں نے اِس تفریح میں حصہ لیا یا نہیں مگر اُسی مہینے ساتویں جماعت کے امتحان ہوئے جن میں اقبال پاس ہو گئے۔

۴۷

اپریل میں اقبال آٹھویں جماعت یعنی تھرڈ مڈل میں آ گئے۔

اختیاری مضامین میں وہ عربی اور فارسی ایک ساتھ لے سکتے تھے۔ اِن کے علاوہ سنسکرت، ایلیمنٹری سائنس، اصول اقلیدس اور الجبرا تھے جنہیں چھوڑتے ہوئے اقبال کو بہت خوشی ہوئی ہو گی۔ ہیڈ ماسٹر نرنجن داس جنرل نالج پڑھاتے تھے جس کی نصابی کتاب مختصر تاریخ ہند بارہ آنے کی ملتی تھی۔ یہ کتاب مطبع مفید عام (لاہور) میں چھپی تھی اور لیتھ برج کی انگریزی تاریخ کا ترجمہ تھی۔

ماسٹر ہرنام سنگھ انگریزی، ریاضی، علم مساحت، حفظانِ صحت اور جغرافیہ پڑھاتے تھے۔ انگریزی کی ریڈر پیارے لال سرکار کی مرتب کی ہوئی تھی جبکہ حفظانِ صحت کی نصابی کتاب کا نام تھا:

Cunningham's Sanitary Primer

شاہ جی عربی، فارسی اور اُردو پڑھاتے رہے۔

عالی جناب حضرت ملکہ معظمہ وکٹوریا قیصرہ ہند کی سوانح عمری میں سے بعض حالات۔ مرتبہ میرزا بیگ خان....

۲۴ مئی ۱۸۱۹ء کی صبح کو کہ سہانا وقت اور موسم بہار تھا۔ ہر طرف سبزہ اور ہر سمت گلزار تھا۔ جارج سوم شاہ انگلستان کے چوتھے فرزند ارجمند شہزادہ ایڈورڈ ڈیوک آف کنٹ کے مشکوئے دولت میں بمقام قصر کنسنگٹن ایک دختر بلند اختر تولد ہوئی...

سلسلہ تعلیم پنجاب اُردو کورس

مرتبہ لالہ رام کشن صاحب۔ منشی امیر چند صاحب اور مولوی مرزا بیگ خاں

صاحب

مطبع عام لاہور

عربی کی کتاب تحفۃ الادب تھی ''یعنی الف لیلہ، اخوان الصفا، کلیلہ دمنہ اور تحفہ ناصریہ کا انتخاب جو اَپر اسکولوں کی ادنیٰ جماعت کے واسطے تیار ہوا''۔ یہ بھی مفید عام لاہور سے چھپی تھی اور قیمت گیارہ آنے تھی۔

۴۸

۱۸۹۰ء کے اواخر میں مرزا غلام احمد کا ایک اور دعویٰ منظر عام پر آیا۔ اُنہوں نے بتایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ سلامت آسمان پر نہیں اُٹھائے گئے تھے بلکہ صلیب سے اُتر کر صحت یاب ہوئے تھے۔ پھر وادیٔ کشمیر پہنچ کر طبعی موت پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ اِس کے ساتھ ہی مرزا غلام احمد نے بتایا کہ وہ مسیح موعود جس کے آنے کا تذکرہ احادیث میں آیا وہ یہ خود ہیں۔

اِس دعوے کے بعد احمدی تحریک نے بہت سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ پنجاب میں انگریز مشنریوں کی تقاریر سے زخم کھائے ہوئے مسلمان بہت تھے۔ اُن میں سے بعضوں نے ایک زندہ نبی کے سہارے کو خوش آمدید کہا اور تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ دُوسروں نے اِس قسم کی باتوں کو اپنے عقائد پر حملہ قرار دیا اور مرزا غلام احمد کی مخالفت پر کمر بستہ ہوئے۔

۴۹

جمشید علی راٹھور مسجد حسام الدین میں بیٹھے تھے۔ وہ امام بی کی ایک غریب عم زاد کے لڑکے تھے۔ سیالکوٹ ہی میں رہتے تھے اور مولوی میر حسن سے پڑھتے تھے۔

اُس وقت اقبال تلاوت کر رہے تھے اور سننے والے محو تھے کیونکہ اُن کی آواز میں بڑا سوز تھا۔ میر حسن مسجد میں داخل ہوئے اور اُنہیں دیکھ کر اقبال نے رکنا چاہا۔ میر حسن نے جاری رکھنے کے اشارہ کیا اور اقبال نے تلاوت پوری کر لی۔ شاید میر حسن کو بھی اُن کی آواز پسند آئی کیونکہ اُنہوں نے اقبال ہی سے اذان دینے کے لیے کہا۔[۴۲]

۵۰

آنحضرتؐ اِس نوعِ انسانی میں موجود یعنی فردِ کامل ہیں...(ابن عربی نے فصوص الحکم میں لکھا تھا)...اور اِسی لیے وجود کے حکم کا آپ سے آغاز ہوا اور آپ ہی پر انجام ہوا۔

آپؐ اُس وقت بھی نبی تھے جب آدمؑ پانی اور مٹی کے درمیان تھے۔ پھر آپؐ ہی اپنی دنیاوی صورت میں خاتم النبیین ہوئے اور اپنے پروردگار پر پہلی دلیل ہوئے...

محبت جو کائنات میں وجود کا اصل ہے اُس کے بارے میں آپؐ نے فرمایا، "احبّ الیّ من دنیا لم ثلث ...یعنی مجھکو تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں محبوب بنائی گئی ہیں۔ عورتیں اور خوشبو اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔"

۵۱

"بچپن میں فصوص الحکم کا درس میرے گھر پر ہوتا تھا..." اقبال کا بیان ہے،[۴۳] "گو بچپن کے دنوں میں مجھے اِن مسائل کی سمجھ نہ تھی تاہم محفلِ درس میں روز شریک ہوتا۔ بعد میں جب عربی سیکھی تو کچھ کچھ خود پڑھنے لگا اور جوں جوں علم اور تجربہ بڑھتا گیا میرا شوق اور واقفیت زیادہ ہوتی گئی۔"

۵۲

ابن عربی نے لکھا تھا...

اِس حدیث میں آنحضرتؐ نے عورت کا ذکر نماز سے پہلے کیا۔ کیونکہ مرد عورت کا حصہ ہے چنانچہ مرد کے لیے عورت اپنے آپ کو پہچاننے کا ذریعہ ہے جس طرح نماز خدا کو پہچاننے کا۔ مگر اپنے آپ کو پہچاننا خدا کو پہچاننے سے پہلے ضروری ہوتا ہے۔ جیسا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا، ''جس نے اپنے آپ کو پہچانا اُس نے خدا کو پہچانا۔''

اور جب آپؐ کو عورتیں محبوب ہوئیں تو آپ نے اُن کی طرف ویسی ہی شفقت فرمائی جیسی کل کو اپنے جزو سے ہوتی ہے۔ خدا نے اپنی روح آدم میں پھونکی تھی۔ آدمی خدا کا جزو ہے لہٰذا خدا اُس سے محبت کرتا ہے۔ اِسی طرح آدم کے پہلو سے عورت کو نکالا۔ عورت آدمی کا جزو ہے لہٰذا آدمی عورت سے محبت کرتا ہے۔

خدا کی آدمی سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگاؤ کہ خدا اُس سے ملنے کا آرزومند ہے اور موت کے ذریعے اپنے بندے کو اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ دوسری طرف آدم نے عورت سے اس طرح محبت کی جس طرح کوئی اپنے نفس سے محبت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضورؐ کو عورتیں محبوب ہوئیں۔

پس خدا کا محبوب آدم کی صورت میں پیدا ہوا۔ اور آدم کا جوڑا عورت کی صورت میں۔ یوں تین انفرادیتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ حق تعالیٰ۔ آدم۔ عورت۔

پھر انسان نے حق تعالیٰ سے ویسی محبت کی جیسی جزو کو اپنے کل سے ہوتی ہے، اور عورت نے مرد سے ویسی جیسی جزو کو اپنے کل سے ہوتی ہے۔

دیکھنا یہ چاہیے کہ مرد کی محبت عورت سے اس لیے ہے کہ وہ خود اُس کی اپنی صورت میں پیدا ہوئی ہے اور وہ خود خدا کی صورت میں پیدا ہوا ہے۔ غور کرو کہ رسول اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ مجھے عورتوں سے محبت ہے بلکہ یہ کہا کہ وہ (خدا کی طرف سے) میرے لیے محبوب بنائی گئی ہیں۔

پھر جب مرد کو عورت سے محبت ہوئی تو وہ اُس سے وصال کا خواہشمند ہوا۔ جنسی خواہش تمام بدن میں پھیلتی ہے یہی وجہ ہے کہ اختلاط کے بعد نہانے کا حکم آیا۔ عورت

سے وصال میں بھی مرد کے لیے ایک طرح کی فنا ہے۔ جس طرح خدا سے وصال میں فنا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد غسل کرنا اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ بندہ جو خدا کا محبوب ہے وہ اُس کے غیر سے لذت اُٹھانے کے بعد جب اپنے اصل عاشق (یعنی خدا) کی طرف دوبارہ متوجہ ہو تو غیر کے ساتھ وصال سے پہلے والی کیفیت میں واپس پہنچ چکا ہو۔

عورت کے بعد خدا کی طرف پلٹنا اور نظر کے ساتھ پلٹنا ضروری ہے۔ جب بندے نے خدا کو عورت میں دیکھا تو اُس نے خدا کا مشاہدہ اُس میں کیا جو مفعول ہے۔ جو خود مرد کی اپنی ذات سے ظاہر ہوئی ہے۔ مگر جب بندے نے خود اپنے آپ میں خدا کو دیکھا ... جب خدا کو دیکھتے ہوئے مرد کے ذہن میں عورت حاضر نہ ہو تو یہ گویا براہ راست خدا کا دیدار ہے۔

لیکن خدا کا مکمل اور بہترین دیدار عورت ہی میں کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ مرد جب خدا کو عورت میں دیکھتا ہے تو اُس وقت وہ بیک وقت فاعل کے اعتبار سے بھی مشاہدہ کرتا ہے اور مفعول کے اعتبار سے بھی۔ کل کے اعتبار سے بھی مشاہدہ کرتا ہے اور جزو کے اعتبار سے بھی۔ فاعل اور کل تو وہ عورت کے مقابلے میں خود ہے۔ اور مفعول یا جزو عورت اس کے مقابلے میں ہے۔ یہ دیدار بہت بہتر ہے اس سے کہ مرد عورت کے تصور کے بغیر اپنے آپ میں خدا کو دیکھے...

۵۳

پس جس نے عورتوں کو اِس علم سے اور اِس حد تک محبوب رکھا تو اُس نے خدا سے محبت کی... (ابن عربی نے لکھا تھا)... اور جس نے اُن کو اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کے لیے محبوب رکھا اُسے گویا اُس کی ہوس نے اصل علم سے دور رکھا ہوا ہے۔ اُس کے سامنے محض عورت کا جسم ہے، روح نہیں ہے۔ وہ لوگ بھی جو اپنی بیویوں اور شرعی باندیوں تک محدود نہیں رہتے ہیں مگر اُن کے پاس صرف لذت لینے جاتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ یہ لذت لینے والا کون ہے اور کس سے لذت لے رہا ہے۔ نہ یہ جانتے ہیں کہ

ان کے نفس نے انہیں بھی اُسی چیز سے بے خبر رکھا ہوا ہے جس سے غیر بے خبر ہے۔
اُنہوں نے اُس چیز کو تو محبوب رکھا ہے جو لذت کا ذریعہ ہے مگر اُس کی روح سے بے خبر ہیں۔

۵۴

جس حدیث کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے اُس میں تینوں ناموں کی ترتیب قابل غور ہے۔
عورت مؤنث حقیقی ہے۔اس کا ذکر پہلے آیا۔
خوشبو عربی میں مذکر ہے۔اس کا ذکر درمیان میں ہوا۔
نماز عربی میں لفظی طور پر مؤنث ہے۔اس کا ذکر آخر میں ہوا۔
اس طرح ایک مذکر لفظ دو مؤنثوں کے درمیان ہے۔کائنات میں مرد کی یہی کیفیت ہے۔وہ خدا اور عورت کے درمیان ہے۔خدا مؤنثِ لفظی ہے کیونکہ اُس نے مرد کو تخلیق کیا اور تخلیق ایک نسوانی خصوصیت ہے۔
مرد کے سامنے عورت ہے جو مؤنثِ حقیقی ہے۔
عورت،خوشبو،نماز - خدا،مرد،عورت۔

ابن عربی

فصوصُ الحکم

۵۵

اقبال بارہ تیرہ برس کے تھے۔
یہ دور عام طور پر لڑکپن کا اہم دور ہوتا ہے۔ایک طرف بلوغت کا آغاز اور نفسانی خواہشات کا اولین احساس۔دوسری طرف کچھ پڑھنے اور سیکھنے کے دیرپا تجربے بھی عام طور پر اسی عمر میں حاصل ہوتے ہیں۔
اقبال اپنے دن کا زیادہ تر حصہ میر حسن کے گھر گزارتے تھے۔اندازہ کیا جاسکتا ہے

کہ مطالعے میں اُن کی سب سے زیادہ رہنمائی شاہ جی نے کی ہوگی مگر افسوس ہے کہ اُس کے بارے میں زیادہ معلومات ہمیں دستیاب نہیں ہیں۔ نصاب کے علاوہ کون سی کتب اُنہوں نے پڑھیں اِس کا صرف اندازہ ہی اندازہ ہے البتہ یہ معلوم ہے کہ دیوانِ غالب سبقاً سبقاً اُن سے پڑھا اور ناصر علی ہندی کے فارسی اشعار بھی اُسی زمانے میں نظر سے گزرے۔[۲۴]

بیدلؔ بھی میر حسن کے پسندیدہ شعراء میں سے تھے اور اُن کے علاوہ فارسی، عربی اور اُردو کے دیگر کلاسیکی شعرأ سے اقبال کا تعارف بھی میر حسن نے کروایا ہوگا۔ یہ بات معلوم ہے اقبال نے علم عروض باقاعدہ سبق لے کر پڑھا تھا۔[۲۵] ممکن ہے میر حسن سے پڑھا ہو۔ اِس کے علاوہ ابجد اور تاریخ گوئی تو قریب قریب یقینی طور پر میر حسن سے سیکھی تھی۔

عمر کے اِس حصے میں قدم رکھنے پر وہ جذبہ ضرور تو انا ہوا ہوگا جس نے کچھ برس پہلے اُن سے بازاری قصوں میں مصرعے لگوائے تھے مگر دشواری یہ تھی کہ میر حسن کے سبق شاعری پر ختم نہیں ہوتے تھے۔ شاہ جی نے تہذیب الاخلاق کے پرانے پرچے اپنے ہونہار شاگردوں کے ہاتھوں میں بھی تھمائے ہوں گے۔

''پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو!'' سرسیّد احمد ان پرچوں کے مردہ کاغذوں سے نکل کر خطاب کرتے تھے، ''اور اے میری قوم کے بچو، اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو تا کہ اخیر وقت میں اُس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے۔ اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی جوان اُٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے۔''

مگر یہ قوم کی بھلائی کیا تھی؟ سرسید کی زندگی سے معلوم ہوتا تھا کہ گلیوں گلیوں گھوم کر چندہ اکٹھا کرنا اور پھر اُس سے ایک بڑا کالج کھولنا قومی بھلائی ہے۔ میاں جی کہتے ہوں گے کہ دُنیاداری ترک کر کے اسلام کا مطالعہ کرنا اور خدا کی ذات میں فنا ہو جانا سب سے بڑی بھلائی ہے۔ میر حسن نے نہ جانے کیا بتایا ہوگا، شاید کہا ہو کہ انگریزی علوم حاصل

کرنا قومی بھلائی ہے مگر ایک بات پر سب متفق نظر آتے تھے۔

شاعری کرنا قومی بھلائی نہیں تھی۔

۵۶

اقبال کی نظر سے حالی کی مسدس کا یہ بند ضرور گزرا ہوگا جس میں شعرا سے متعلق کہا گیا،

طوائف کو ازبر ہیں دیوان اُن کے
گویوں پہ بیحد ہیں احسان اُن کے
نکلتے ہیں تکیوں میں ارمان اُن کے
ثنا خواں ہیں ابلیس و شیطان اُن کے
کہ عقلوں پہ پردے دیے ڈال اُنہوں نے
ہمیں کر دیا فارغ البال اُنہوں نے

اِس کشمکش میں اقبال کی شخصیت کے اُس بہت بڑے رجحان کی پرورش ہوتی نظر آتی ہے جس کی وجہ سے اُن کا دل ہمیشہ سکون کا طلب گار رہا مگر وہ اُسے ہنگاموں کی طرف لے جانا اپنا فرض سمجھتے رہے تھے۔ اُن کی روح شعر اور نغمے میں زندگی ڈھونڈتی رہی اور وہ اسے کتابوں کے مُردہ اَوراق سے بہلاتے رہے۔ زندگی کے کسی ابتدائی مرحلے ہی میں اُن کے لیے اپنی اندرونی کشمکش اتنی دلچسپ ہوگئی کہ دُوسروں کو عمل کرنے میں جو لطف ملتا تھا وہ اُنہیں صرف سوچنے میں حاصل ہو جاتا تھا۔ یہی ایک مفکر کی نفسیات ہوتی ہے۔

شخصیت کی اندرونی کشمکش کے نتیجے میں سوال اُبھرتا ہے، میں کون ہوں؟ آباؤاجداد برہمن تھے جنہوں نے یہ سوچنے میں عمریں صرف کر دیں کہ خدا کیا ہے۔ اقبال کو سوچنا تھا کہ انسان کیا ہے۔ یہ سوال لاشعور سے شعور میں آتا گیا اور سوچ نکھرتی گئی۔

قرآن نے اپنے آپ کو وہ کتاب کہا تھا جس میں شبہ نہیں۔ ساتھ ہی بتایا تھا کہ یہ کتاب جو ہدایت فراہم کرتی ہے اُس کی طرف قاری کے تین رویے ممکن ہیں: ایمان، کفر اور نفاق۔

کیا ادب کے مختلف اسالیب کو اس بنیاد پر تقسیم کیا جا سکتا تھا؟ کیا ادیب قاری کے ساتھ اپنے تعلق کے لیے ایمان، کفر یا نفاق کو علامت بنا سکتا تھا؟

مومنانہ اسلوب کی علامت یہ ہوسکتی تھی کہ ادیب اپنے قاری سے کہے کہ ایمان کی طرف آؤ۔ اس ایمان سے اُس کی مراد خواہ جو بھی ہو۔ نظامی گنجوی، سنائی، عطار، رومی اور جامی اس اسلوب کے بڑے نام قرار پاتے۔

کافرانہ یا ملحدانہ اسلوب کی علامت یہ ہوسکتی تھی کہ ادیب اپنے قاری سے کہے، الحاد کی طرف آؤ۔ بعض بڑے شاعروں نے یہ اسلوب اپنایا تو اسے منافقت کے خلاف جنگ کا استعارہ بنا کر معرفت کے کئی دروازے کھولے۔ ان میں حافظؔ کا نام سرِفہرست تھا۔ ''میرا خرقہ شراب کے بدلے رہن پڑا رہے تو بہتر اور بے کار نصیحتوں کا پلندہ خالص شراب میں ڈوبا رہے تو اچھا...'':

ایں خرقہ کہ من دارم در رہنِ شراب اولیٰ
ویں دفترِ بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ

الحاد کو ادبی اسلوب کے طور پر اختیار کرنے والا ادیب قاری سے یہ تسلیم کرواتا تھا کہ ایمان والے اب اس دنیا میں نہیں رہے، صرف منافق رہ گئے ہیں لہٰذا ساری اچھی باتیں کافروں کے پاس ہیں:

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا

قادر الکلام شاعر کے ہاتھوں میں کفر بھی سرکشی کی بجائے نیازمندی و عاجزی کی پہلی

منزل بن سکتا تھا:

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے
تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا!

غالب کا شمار ان دونوں میں سے کس زمرے میں کیا جاتا؟ ان کا اسلوب ذرا مختلف محسوس ہوتا تھا:

کیوں نہ دوزخ کو بھی فردوس میں شامل کر لیں
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

شاعر جنت میں ضرور پہنچ چکا ہے لیکن اپنی افتادِ طبع کو قربان کرنا نہیں چاہتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے انفرادیت اور ایمان اکٹھے سلامت رہ سکتے ہوں۔ خلوص کی شدت اور وہ آزادی جسے حاصل کرنے کے لیے بڑے شاعروں کو الحاد کا استعارہ استعمال کرنا پڑا تھا غالب اُسے ایمان کے اسلوب میں رہتے ہوئے نبھا لیتے تھے:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

۵۸

کیا منافقت بھی ادبی اسلوب بن سکتی تھی؟ اس اسلوب کا تقاضا یہ ہوتا کہ شاعر اگر قاری سے کہے، ''مجھے شراب پینا پسند ہے'' تو خواہ قاری اس سے جو بھی مراد لے یعنی سچ مچ کی شراب، معرفت یا کوئی اور چیز وہ شاعر کو پسند نہ ہو بلکہ اُسے پسند کرنے والوں کو شاعر برا سمجھتا ہو۔ شاعر کہے کہ وہ قشقہ کھینچ کے دَیر میں بیٹھ گیا ہے تو اصل مطلب ہو کہ خواہ دَیر سے جو جگہ بھی مراد لی جائے وہ وہاں جانے کو اچھا نہیں سمجھتا۔

جس برس انگریزوں نے ہندوستان میں بغاوت ختم کی یعنی ۱۸۵۷ء اُس برس فرانس میں ایک شاعر نے منافقت کو قاری کے ساتھ اپنے تعلق کی بنیاد قرار دیا۔ اس کا

نام بودلیر تھا۔ اپنی نظموں کے مجموعے باطل کے پھول کی تمہید میں اس نے قاری سے خطاب کو اس طرح ختم کیا:

''اے منافق قاری! میری شبیہ، میرے بھائی!''

۵۹

زمانہ طالب علمی میں اقبال پانچ زبانوں میں مہارت حاصل کر چکے تھے۔ پہلی زبان پنجابی تھی جسے وہ اپنی ماں سے سیکھے ہوئے سیالکوٹی لہجے میں بولتے تھے۔ دوسری اُردو تھی اور میر حسن کے کمرۂ جماعت میں واحد ذریعہ تعلیم کیونکہ وہاں پنجابی بولنا منع تھا۔ غالباً یہ سرسیّد کا اثر تھا جن کی تحریک میں اُردو زبان مسلمانوں کے اجتماعی وقار کی علامت بن گئی تھی۔

تیسری زبان عربی تھی۔ میر حسن نے اس کا ایسا ذوق پیدا کر دیا کہ یہ زندگی کے ہر قدم پر مہارت کا ثبوت بن کر سامنے آتی رہی۔ چوتھی فارسی تھی جو اقبال کا عشق تھی۔ ''لوگوں کو... معلوم نہیں کہ میں نے فارسی زبان کی تحصیل کے لیے سکول ہی کے زمانے میں کس قدر محنت اُٹھائی اور کتنے اساتذہ سے استفادہ کیا،'' اقبال نے بعد میں کہا۔

پانچویں زبان انگریزی تھی جو ترقی کا زینہ تھی اور انہیں اِس زبان کے شعرا سے محبت بھی ہو چلی تھی۔

۶۰

اسکول میں دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے میر حسن نے اقبال سے پانی منگوایا۔ پانی اتنا گرم تھا کہ پیا نہ جا سکا۔ ''اقبال! سچ بتانا کہاں سے لائے ہو، باہر کے مٹ سے؟''

اقبال نے معصومیت سے اقرار کر لیا۔

''تم دنیا کے کام کے نہیں ہو،'' میر حسن نے کہا۔[۱۴]

۶۱

مڈل کے امتحان کے لیے داخلہ فیس بھیجنے کی آخری تاریخ ۵ نومبر ۱۸۹۰ء تھی۔ فیس پانچ روپے اور کیریکٹر سرٹیفکیٹ لازمی۔ امتحانی زبان انگریزی، اُردو، ہندی یا گرمکھی (پنجابی) ہوسکتی تھی۔ اقبال نے فارم پر کرتے ہوئے اپنی عمر ۱۵ برس تحریر کی جبکہ حقیقت میں وہ تیرہ برس کے تھے۔ اس کی وجہ معلوم نہیں ہوسکی۔

امتحانی فارم کے جس کالم میں اُمید وار کو جاٹ یا راجپوت ہونے کی صورت میں نشاندہی کرنی تھی وہ اُس زمانے کی فضا سے ہم آہنگ تھا جب زندگی کا ہر اہم فیصلہ برادری کے تعلق سے بندھا ہوا تھا۔ فارم بھرتے ہوئے اقبال کے ذہن میں یہ تصور دوبارہ تازہ ہوا ہوگا کہ وہ سیالکوٹ کی کشمیری برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔

اُنہی دنوں پنجاب میں عام بخار کی بیماری پھیل گئی۔ بچے خاص طور پر اس کا شکار ہوئے۔ اخبارات میں اپیلیں چھپنے لگیں کہ امتحانات جنوری ۱۸۹۱ء کی بجائے ایک مہینہ موخر کر دیے جائیں۔

حکومت نے یہ درخواست مسترد کر دی۔ امتحان شروع ہونے کی تاریخ ۵ جنوری ۱۸۹۱ء تھی۔ اسکاچ مشن کے لڑکوں کے لیے اُن کا اسکول ہی امتحانی مرکز تھا۔

اقبال کا رول نمبر ۷۹۹ تھا۔

۶۲

۲۸ دسمبر ۱۸۹۰ء کو الہ باد میں پانچواں اجلاس شروع ہوا جس میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے نام میں کانگریس کا لفظ کانفرنس سے تبدیل کیا گیا۔

علی گڑھ کالج کے طلبہ کی ایک کھیپ تیار ہو کر منظر عام پر آ چکی تھی۔ ان میں سے بعض نے ''ڈیوٹی سوسائٹی'' بنائی تھی جس کا مقصد تحریک کے لیے چندہ اکٹھا کرنا تھا۔

''اِس سوسائٹی کے ممبر ہماری قوم کے معزز اور قابلِ ادب خاندانوں کے لڑکے ... چائے کی دکان لے کر یہاں آئے ہیں۔ ممکن ہے کہ سخت دل جن کا دل پتھر سے بھی سخت ہے وہ ان کا تمسخر کریں...'' سرسیّد نے اپنی تقریر کہا مگر خدا نے کہا تھا کہ بعض پتھروں

میں سے چشمے بھی نکلتے ہیں اور بعض خدا کے خوف سے پھسل بھی پڑتے ہیں لہٰذا بوڑھے رہنما نے اپنی بات میں اضافہ کیا، ''پس جو دل اس قسم کے پتھر کے بھی ہوں گے تو وہ دل بھی ضرور ان لڑکوں کو باعث افتخارِ قوم سمجھیں گے اور عمدہ علامت قومی ترقی کی خیال کریں گے۔''

میر حسن عام طور پر اِن اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے لہٰذا خیال یہی ہے کہ وہ الہ آباد ضرور گئے ہوں گے اور ایجوکیشنل کانفرس میں اُس نئے کارکن کا خیر مقدم بھی دیکھا ہوگا جسے آگے چل کر تحریک کے لیے بہت بڑے کام سرانجام دینے تھے۔ حیدرآباد (دکن) کے ہوم سیکرٹری مہدی علی خاں جن کا خطاب نواب محسن الملک تھا پہلی دفعہ کانفرس میں شریک ہوئے تھے۔

اِجلاس ۳۰ دسمبر کو ختم ہوا اور وہ طالب علم جسے چالیس سال بعد ٹھیک اِسی تاریخ کو اِسی شہر میں اِسی پلیٹ فارم سے قوم کی سیاسی تاریخ کا سب سے مشہور خطاب کرنا تھا اُس وقت مڈل کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا جس میں اب چھ دن رہ گئے تھے۔

۶۳

جنوری ۱۸۹۱ء

تین پرچے انگریزی کے، دو گھنٹے، دو گھنٹے، اور پندرہ منٹ کے

دو پرچے اُردو کے،

ایک پرچہ ریاضی، ایک مساحت کا

تین پرچے جنرل نالج کے۔ دو گھنٹے میں تاریخ، دو گھنٹے میں جغرافیہ، دو گھنٹے میں ابتدائی حفظانِ صحت۔

دو پرچے عربی کے، آدھا آدھا گھنٹہ،

تین فارسی کے۔ آدھا گھنٹہ۔ آدھا گھنٹہ۔ ایک گھنٹہ

اور اُس کے بعد آزادی۔ کبوتر اُڑانے کی، پتنگ اُڑانے کی، خواب بنانے کی۔

۶۴

۲۶ فروری

رول نمبر ۱۷۹۹ کے نمبر ۵۷۹ کل ۸۵۰ میں سے۔

سیالکوٹ میں سب سے زیادہ نمبر رول نمبر ۱۸۱۷ کے، ۶۵۹۔ اُس کا نام گنپت رائے۔

سیالکوٹ کے چار تمغوں میں سے کوئی تمغہ بھی رول نمبر ۱۷۹۹ کو نہیں ملا۔ مگر نمبر بُرے نہیں تھے۔

۶۵

اپریل میں اقبال نویں جماعت میں داخل ہوئے جسے فورتھ ہائی کہتے تھے۔ لازمی مضامین میں سے حفظانِ صحت اور علم مساحت خارج ہو گئے۔ نرنجن داس کی جگہ لالہ نرسنگھ داس ہیڈ ماسٹر بن گئے اور بدستور انگریزی پڑھاتے رہے۔

Reading in Poetry (The Royal Reader)

سیکنڈ ہیڈ ماسٹر ہرنام سنگھ اب ریاضی اور جغرافیہ کے ساتھ ساتھ تاریخ بھی پڑھانے لگے جو پہلے نرنجن داس پڑھایا کرتے تھے۔ یہ تمام مضامین انگریزی میں تھے۔ تاریخ وجغرافیہ کا نصاب انگلستان اور ہندوستان کی تواریخ عام جغرافیہ اور ہندوستان کے جغرافیائی حالات پر مبنی تھا۔

عربی، فارسی اور اُردو شاہ جی پڑھاتے تھے۔

فارسی کا نصاب۔ اخلاق جلالی کے حصہ سیاست مدن، احسن القواعد اور انتخاب پر مبنی تھا۔

عربی کے نصاب میں مسلم الادب مرتبہ کرنل ہالرائڈ، مقدمۃ الصرف اور مفتاح الادب شامل تھیں۔

اقبال کی اُس زمانے کی انگریزی کتابیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی

کتابوں پر دستخط کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔

This book now belongs to Mohammad Iqbal...

Mohammad Iqbal Student of 9th class of Scotch Mission School,

Sialkot City...

٦٦

مئی میں اسکاچ مشن والوں کو اپنا کالج کھولنے کی اجازت مل گئی۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ اقبال انٹرنس کے بعد بھی میر حسن سے پڑھ سکتے ہیں۔

٦٧

لالو پہلوان کے بڑے بھائی کی دودھ کی دوکان تھی۔

لالو اقبال کا دوست تھا۔ کبھی کبھی اقبال بھی لنگر لنگوٹ کس کے اکھاڑے میں آجاتے تھے۔[۱۴] اگر اُن کا خیال تھا کہ اُن کی ذات میں چھپا ہُوا وہ دیو جو اُنہیں بار بار عملی دُنیا سے کھینچ کر تخیل کی طرف لے جاتا ہے اُسے وہ کشتی لڑ کر زیر کرلیں گے تو یہ اُن کی بھول تھی۔

٦٨

محرم کا مہینہ تھا۔ طلبہ اور اساتذہ جمع تھے۔ اسکاچ مشن کالج میں پرنسپل ینگسن عیسائیت کی تبلیغ کر رہے تھے۔ ''یسوع مسیح نے مردے کو زندہ کر دیا مگر مسلمانوں کے رسول نے نہ معجزات دکھائے نہ ہی نواسوں کی شفاعت کی۔''

میر حسن کی رگِ ظرافت پھڑکی۔ اُنہوں نے پادری صاحب کی بات کاٹتے ہوئے شوشہ چھوڑا، ''ہمارے رسولؐ شفاعت لے کر گئے تھے مگر خُدا نے کہا کہ اِنہوں نے تو میرے بیٹے کو صلیب پر لٹکا دیا۔ میں آپ کے نواسے کو کیا کروں!''

اقبال نے سن رکھا ہوگا کہ پہلے جہاں صرف مشن اسکولوں میں پڑھنے والے لڑکے عیسائی ہو رہے تھے۔ وہاں اب مسلمانوں عورتوں کی بڑی تعداد بھی عیسائیت قبول کرنے لگی ہے اور ابھی تین سال پہلے ایک سیّد زادی نے اپنے بچوں سمیت مذہب تبدیل کیا ہے۔

عیسائی مبلغوں کے خلاف میر حسن تو اپنے موقف کو چھلکے میں سمیٹ سکتے تھے مگر اقبال لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ پرنسپل پادری ینگسن سے انجیل کی کلاس میں اُلجھنا اُن کا اور اُن کے دوست قائم الدین کا معمول تھا مگر پادری ینگسن ہمیشہ حضرت عیسیٰؑ کی فضیلت ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ عقل کے میدان میں کسی سے مار کھانا اقبال کو شاید کسی عمر میں بھی گوارا نہ ہو سکتا تھا۔ وہ ایسے زچ ہوئے کہ ایک دن جب ینگسن نے بحث کے دوران قرآن کی کوئی آیت پڑھی تو اقبال نے اُٹھ کر کہہ دیا، ''یہ آیت قرآنی نہیں ہے۔''

آیت قرآن میں موجود تھی اور شاید اقبال جانتے بھی ہوں مگر یہ انکار اُس ہیجانی کیفیت کا اظہار تھا جس سے مسلمانوں کو کبھی کبھی گزرنا پڑتا تھا۔ اُس روز کے واقعے کے بارے میں اُن کے ہم جماعت بشارت نے اپنے محسوسات یوں بیان کیے ہیں، ''میں دل میں کڑھتا رہا اور کبھی کبھی نعوذباللہ خدا تک سے ناراض ہوتا رہا کہ اُس نے ناحق مسیح کو آسمان پر چڑھا کر مسلمانوں کو عیسائیوں کے سامنے ذلیل کروا دیا۔'' بشارت بعد میں احمدی ہو گئے۔[۲۹]

۷۰

اِس ذہنی پس منظر میں احمدیت کے ابتدائی پھیلاؤ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ مختلف لوگ مختلف وجوہات کی بنا پر کسی نئے نظریے کو قبول کرتے ہیں مگر اُس زمانے میں ایک تازہ وحی پر ایمان لانا اِتنا دشوار نہیں تھا خاص طور پر جب یہ وحی بتاتی ہو کہ مسیح آسمانوں پر

نہیں گئے تھے۔ سیالکوٹ میں جن لوگوں نے سب سے پہلے احمدیت اختیار کی اُن میں مولوی عبدالکریم کا نام بھی شامل ہے۔ یہ صاحب ایسے جذباتی تھے کہ مناظرے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ''عیسائیوں کا مسیح'' کہہ کر گالیاں دیتے تھے۔ اگر کہیں شیعوں سے بحث ہوتی تو ''شیعوں کا علی'' کہہ کر خلیفۂ چہارم کی شان میں جو دل چاہتا کہہ جاتے۔ عذر یہ ہوتا میں اپنے عیسیٰؑ یا اپنے علیؓ کے بارے میں تو نہیں کہہ رہا۔[140] اقبال کا اُن کے ساتھ حضرت علیؓ کے مسئلے پر اُلجھنا مشہور ہے۔

دوسرے صاحب جنہوں نے سیالکوٹ میں احمدیت کو استحکام بخشا وہ میر حسن کے چچا فیض اللہ کے تندمزاج بیٹے حکیم حسام الدین تھے۔ یہ بزرگ میر حسن کے برابر والے گھر میں رہتے تھے اور ڈیوڑھی بھی ایک ہی تھی۔ احمدیت قبول کی تو کچھ کتابیں شاید مرزا غلام احمد کی لے کر میر حسن کے پاس آئے اور عبارتیں دکھا کر غصّے میں کہا، ''کہو مسیح فوت ہو گیا کہ نہیں؟''

میر حسن کے پیرومرشد سرسید پہلے ہی حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کے نظریے کی حمائت میں تھے اگرچہ اُن کے دوبارہ آنے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ میر حسن نے بھی آرام سے کہہ دیا، ''فوت ہو گیا ہو گا۔'' اب حکیم صاحب بولے، ''پھر آئے گا؟'' میر حسن کی رگِ ظرافت پھڑکی۔ اُنہوں نے برجستہ کہا، ''میر فیض اللہ مر کر آئے ہیں؟'' حکیم حسام الدین کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ ''بے ایمان، کافر، منکرِ خدا اور رسول'' کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

کچھ دن بعد میر حسن اپنے گھر کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے جو مشترکہ ڈیوڑھی میں شروع ہوتی تھیں۔ حکیم حسام الدین کی نظر کمزور تھی لہٰذا آہٹ سن کر پوچھ بیٹھے، ''کون ہے؟'' میر حسن نے جواب دیا، ''بے ایمان۔ خدا اور رسول کا منکر۔'' حکیم حسام الدین لپک کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ''بھیا! تمہاری انہی باتوں نے تو ہمیں مارا ہے!''

بہرحال مسجد حسام الدین جہاں چند برس پہلے مولوی عمر شاہ سے اقبال نے قرآن

سیکھا تھا اب سیالکوٹ میں احمدیت کے فروغ کا مرکز بن گئی۔ میر حسن نے احمدیت کے بارے میں اپنے رہنما سے دریافت کیا۔ جواب آیا۔

مخدومی مکرمی!

...مرزا غلام محمد صاحب قادیانی کے کیوں لوگ پیچھے پڑے ہیں۔ اگر اُن کے نزدیک اُن کو الہام ہوتا ہے، بہتر۔ ہم کو اس سے کیا فائدہ۔ نہ ہمارے دین کے کام کا ہے نہ دنیا کے۔ اُن کا الہام اُن کو مبارک رہے۔ اگر نہیں ہوتا تو صرف ان کے توہمات اور خلل دماغ کا نتیجہ ہے۔ تو ہم کو اس سے کیا نقصان ہے۔ وہ جو ہوں سو ہوں، اپنے لیے ہیں۔ میں سنتا ہوں کہ آدمی نیک بخت اور نمازی پرہیز گار ہیں۔ تو یہی امر ان کی بزرگداشت کو کافی ہے۔

جھگڑا اور تکرار کس بات کا ہے۔ ان کی تصانیف میں نے دیکھیں۔ وہ اسی قسم کی ہیں جیسا کہ اُن کا الہام۔ یعنی نہ دین کے کام کی نہ دنیا کے کام کی۔

مولوی حکیم نورالدین صاحب کی کوئی تحریر میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ دینیات میں کسی کا الہام جب تک اس کو شارع نہ تسلیم کرلیا جائے، کسی کام کا نہیں۔ تقدیر علم الٰہی کا دوسرا نام ہے۔ ما کان و مایکون۔ علم الٰہی میں یا یوں کہو تقدیر میں کچھ تغیر و تبدیل نہیں کر سکتے۔ پس کسی کے الہام سے کسی کو دنیا میں کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔ پس ایسی بے سود بات کہ بالفرض اگر سچ بھی ہو تو بھی کچھ فائدے کی نہیں اور اگر جھوٹ بھی ہو تو بھی ہمارے نقصان کی نہیں، اُس پر متوجہ ہونا اور اوقات ضائع کرنا ایک لغو کام ہے۔

والسلام۔ خاکسار

سید احمد

علی گڑھ، ۹ دسمبر ۱۸۹۱ء

سر سیّد نے شاید مولوی نورالدین کی کوئی تحریر نہ دیکھی ہو مگر میر حسن کے پاس ایک پوسٹ کارڈ موجود تھا جو مولوی نورالدین صاحب نے غالباً جموں سے بھیجا تھا۔ آیندہ

کبھی وہ سیالکوٹ آئے اور مرزا صاحب کی بات چھیڑی تو میر حسن نے کہہ دیا، ''وہ قرآن کی غلط تاویلیں پیش کرتے ہیں حالانکہ یہ کوئی اصولی چیز نہیں۔ دُوسرے معاملات میں کیسے اُن کا اعتبار ہوسکتا ہے! دیگر مرزا صاحب کو لکھنا نہیں آتا۔ جس کتاب کو اُٹھاؤ حاشیہ در حاشیہ چلی جاتی ہے۔ اِس سے ظاہر ہوا کہ اُن کے دماغ میں کوئی مطلب صاف نہیں۔''

مولوی نورالدین نے اپنی تحریروں کے بارے میں دریافت کیا تو میر حسن نے جیب سے پوسٹ کارڈ نکال لیا۔ ''آپ تو سوال کا پورا جواب بھی نہیں دے سکتے۔ تشنہ چھوڑ جاتے ہیں... میں نے آپ سے دوا پوچھی (تھی)۔ آپ نے دوا لکھ تو بھیجی لیکن یہ نہ بتایا کہ اِسے کھاؤں، سونگھوں، گھس کر لگاؤں یا گھوٹ کر پیوں۔ نہ وزن لکھا کہ ماشہ کھاؤں، تولہ کھاؤں یا من کھاؤں۔'' یہ سن کر مولوی نورالدین خاموش ہو گئے۔[۴۱]

۷۱

عطا محمد کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ وہ ابتدا ہی میں احمدی ہو گئے تھے اور احمدیت کے ۳۱۳ ''سابقون الاولون'' میں سے تھے۔ یہ روایت اُن کے سب سے بڑے لڑکے شیخ اعجاز احمد کی ہے مگر خاندان کے باقی افراد اس کی تردید کرتے ہیں۔[۴۲]

۷۲

مجمعِ تعلیم کا یہ گو چھٹا اِجلاس ہے
ہم مسلماں اور وہی نکبت وہی اِفلاس ہے

ایجوکیشنل کانفرنس کے جس اجلاس میں مولانا حالؔی نے یہ نظم سنائی وہ ۲۸ دسمبر تا ۳۰ دسمبر ۱۸۹۱ء علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ اس میں پہلی دفعہ عورتوں کی تعلیم کے حق میں قرارداد منظور ہوئی ''اور یہ تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ عورتوں کی مذہبی، علمی اور اخلاقی زندگی میں ترقی ہو۔''

سرسید عورتوں کی تعلیم کے مخالف تھے مگر اکثریت کے فیصلے کا احترام کیا۔

۷۳

اقبال کی دوسری بڑی بہن طالع بی کی شادی غلام محمد سے ہوگئی۔ یہ کافی ہوشیار آدمی تھے۔ میاں جی نے دیکھا تو کاروبار میں ان سے مدد لینا شروع کی۔ اُنہوں نے بڑی صلاحیت کا مظاہرہ کیا اور میاں جی نے خدا کا شکر ادا کیا۔ تھوڑی ہی مدت میں سارا کاروبار داماد کے سپرد کر کے خود ہمہ اُوست کی گہرائیوں میں کھو گئے۔

۷۴

اقبال بہت رقیق القلب ثابت ہوئے تھے۔ وہ اپنے سامنے کسی جانور کو ذبح ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکتے تھے۔ ممکن ہے یہ اُن کے برہمن خون کا اثر بھی رہا ہو کیونکہ اب تک اُن کے گھرانے میں گائے کا گوشت نہ پکتا تھا۔[۴۳]

میاں جی ایک عرصے تک قربانی کے بکرے اپنے ہاتھ سے ذبح کرتے آئے تھے مگر پھر ایک چھوٹے سے واقعے نے اُن کی ہمت بھی ختم کر دی۔ عطا محمد نے بقرعید سے بہت پہلے ایک دنبے کا بچہ بھیجا تھا تاکہ قربانی کے دنوں تک پل کر بڑا ہو جائے۔ وہ میاں جی سے کچھ زیادہ ہی مانوس ہو گیا۔ آخر جب ذبح کا وقت آیا تو اُس نے اس قدر حیرت اور افسوس کے ساتھ میاں جی کی طرف دیکھا کہ وہ بے اختیار وہاں سے ہٹ گئے اور قصاب سے کہہ دیا کہ وہ خود ذبح کرے۔ اس کے بعد وہ کبھی قربانی کے موقع پر کھڑے نہ ہو سکے اور جانور بھی عید سے دو ایک دن قبل ہی خریدا جاتا تھا۔

''مجھے اُس دنبے کی نگاہیں یاد آ جاتی ہیں،'' وہ اکثر کہتے تھے۔[۴۴]

۷۵

میر حسن اپنے شاگردوں کو سائیں کیسر شاہ کے واقعات سنا رہے تھے۔ محمد دین بھٹی

اور اقبال بھی موجود تھے۔

''ہم سائیں کیسر شاہ کے پاس موجود تھے۔گھر میں شور ہوا۔سائیں کیسر شاہ اُٹھ کر اندر گئے۔پوچھا۔'بھائی،شور کیوں ہے؟'جواب ملا کہ جو لوٹا کل آپ لائے تھے،نہیں ملتا۔سائیں کیسر شاہ بولے،'جب میں یہ لوٹا لایا تھا تو کوئی شور نہیں ہوا تھا،آج کیوں شور ہوا؟'''

محمد دین بھٹی نے دیکھا کہ اقبال جھوم رہے تھے۔[۳۵]

تصوف کا ایک مرکزی نکتہ ہے کہ جو نگاہ رکھتا ہے وہ آغاز دیکھ کر ہی انجام سوچ لیتا ہے۔بچہ اپنی پیدائش پر روتا ہے تو سمجھنا چاہیے کہ اپنی موت پر رو رہا ہے کیونکہ پیدا ہوا ہے تو موت بھی آئے گی۔دوست سے بچھڑنے کا غم اُس وقت کر لینا چاہیے جب ملاقات ہو کیونکہ ملاقات کبھی نہ کبھی ختم ضرور ہو گی۔مولانا رُوم نے لکھا تھا کہ پرندہ فضا میں اُڑتے ہوئے دانہ دیکھتا ہے اور نیچے اُترتا ہے۔پھر جال میں پھنس جاتا ہے۔تب فریاد کرتا ہے۔اُسے دانہ دیکھتے ہی فریاد کرنی چاہیے تھی تا کہ جال سے محفوظ رہتا۔جال نظر آنے کے بعد فریاد کرنا آسان ہے مگر نگاہ وہی ہے کہ وہ چیز دکھا دے جو نظر نہ آ رہی ہو۔

۷۶

غالب نے کہا تھا کہ ان کے اردو دیوان کو نظر انداز کر کے ان کی فارسی کلیات پر توجہ دی جائے۔یہ کلیات قطعات،قصائد،غزلیات اور مثنویوں پر مشتمل تھا۔

مثنویاں گیارہ تھیں جن میں سے پہلی 'سرمۂ بینش' مولانا روم کی مثنوی کے پہلے شعر سے شروع ہوتی تھی جس کے بعد غالب کہتے تھے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہے بلکہ مولانا روم کے فیض سے بیان رہے ہیں:

''بانسری سے سنو کہ وہ کیا کہتی ہے اور جدائی کی شکایت کر رہی ہے۔''

میں خود نہیں بیان کرتا ہوں بلکہ ایک شخص کے قول کی نقل کر رہا ہوں۔
اُس فیض کے اثر سے جو مجھے ملا ہے میں بانسری کی طرح قلم سے فریاد سناتا ہوں۔
بانسری کی فریاد راہ پر چلنے والے کے دم سے ہے کہ وہ ساز سے اور راز سے آگاہ ہے۔
اگر خدا کے راز کی آواز سے دل لگاؤ تو لازم ہے کہ بانسری کی طرح تمہارا سینہ اپنے آپ سے خالی ہو،
اگر تمہارا دل زخمی نہیں تو مستی کا دعویٰ نہ کرو کیونکہ یہ ایسی تیز شراب ہے جو پہلو چیر دیتی ہے۔
تم جو پوشیدہ راز سے آگاہ نہیں ہو رازِ حقیقت کا دم نہ بھرو، تم اس راہ کے مرد نہیں ہو۔
جو اس راہ کا مرد ہو اس کا دامن تھامو لیکن رہبر اور رہزن میں فرق کرنا چاہیے۔
ہزاروں انسانوں میں راہِ حقیقت کا مرد کوئی کوئی ہوتا ہے جیسے آدمی بہت لیکن بادشاہ ان میں ایک...[۳۱]

اس سے آگے یہ مثنوی بہادر شاہ ظفر کے قصیدے میں تبدیل ہو گئی تھی لیکن کیا ظفر کو ایک علامت بھی سمجھا جا سکتا تھا؟ تمہید میں غالب نے راہِ حقیقت کے مسافر کو بادشاہ سے تشبیہ دی تھی تو پھر کیوں نہ سمجھا جاتا کہ اپنے وقت کے بادشاہ کو ایک علامت کے طور پر استعمال کر کے اسی راہِ حقیقت کے راز فاش کیے ہوں گے!

دوسری مثنوی 'درد و داغ' میں ایک حکایت کی مدد سے تقدیر کا راز بیان کرنے کی کوشش کی تھی اور تیسری 'چراغِ دیر' میں بنارس کا احوال بیان ہوا تھا جو غالبؔ کے تخیل میں آباد کسی دنیائے کامل کا نقشہ بھی ہو سکتا تھا: "اِن رُوحوں کو دیکھو جن پر تن کا خول نہیں ہے۔ یہ وہ رُوپ ہے جسے آب و خاک سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی فطرت پھول کی خوشبو

کی طرح ہلکی پھلکی ہے، یہ لوگ جان ہی جان ہیں، جسم حائل نہیں!''

چوتھی مثنوی 'رنگ و بو' میں ایک بادشاہ کی حکایت کے ذریعے ہمت کو سب سے بڑی قدر بتایا گیا تھا۔ ہمت اپنے بازو کھولے تو مومولے کو ہما کا مقام مل جائے:

ہمت اگر بال کشائے کند
صعوہ تواند کہ ہمائے کند

پانچویں مثنوی 'بادِ مخالف' کلکتہ میں اپنے مخالفین سے خطاب کر کے لکھی گئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا غالب نے کیوں ضروری سمجھا ہوگا۔ یہاں غالب کی عقلیت پسندی اُن قدامت پسندوں سے متصادم تھی جو روایت کے پھریرے لہراتے ہوئے کلکتہ میں آن بسے تھے۔

چھٹی مثنوی 'بیانِ نموداری شانِ نبوت و ولایت' میں نورِ محمدی کا بیان تھا کہ احمد میں سے م نکال دیا جائے تو احد بن جاتا ہے۔ رسول اکرمؐ کا بے مثال ہونا اسی سے ثابت ہے کہ آپؐ خاتم الانبیاء ہیں اور ظاہر ہے کہ آخری نبی دو نہیں ہو سکتے۔ یہ مثنوی اُس زمانے میں لکھی گئی جب دہلی میں یہ بحث چھڑی تھی کہ کیا خدا آنحضرتؐ جیسا دوسرا بنانے پر قدرت رکھتا ہے؟ غالب کی مثنوی یہ پیغام دیتی تھی کہ اول تو اس نکتے سے بہتر نکتہ یہ ہے کہ خدا جتنی دنیائیں چاہے بنا سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ ہر دنیا کا ایک ایک رحمۃ اللعالمین بھی ہو سکتا ہے۔ یہ کہنے کے بعد غالب نے کہا تھا کہ اس کے باوجود آخری نبی ایک ہی رہے گا جو آنحضرتؐ کے سوا کوئی نہیں ہے۔

ساتویں مثنوی 'تہنیت عیدِ شوال' بھی پہلی مثنوی کی طرح بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں تھی لیکن وہاں جو بات شروع ہوئی تھی وہ یہاں مکمل ہوتی تھی خواہ تاریخی بہادر شاہ مراد لیا جاتا، خواہ ایک مثالی بادشاہ جو غالب کے ذہن میں تھا یا پھر راہِ طریقت کا وہ مسافر جو اس مثالی بادشاہ سے اصل میں مراد تھا۔

آٹھویں مثنوی 'در تہنیت عید بہ ولی عہد' ولی عہد کی شان میں تھی، ''وہ خورشید شہنشاہ

وقت کا ولی عہد ہے، ان ساتوں زمینوں کی رونق بڑھانے والا...'' ساتوں زمینوں سے کیا پچھلی سات مثنویاں بھی مراد لی جا سکتی تھیں؟

نویں مثنوی 'دیباچہ' شاہِ اودھ کی ایک نثری کتاب پر دیباچہ تھی اور دسویں مثنوی 'تقریظ' وہ تھی جو سید احمد خاں کے تصحیح کیے ہوئے آئینِ اکبری پر لکھی تھی اور جسے اُنہوں نے واپس کر دیا تھا کیونکہ اُس میں کہا گیا تھا کہ انگریزوں کو دیکھو اور اُن کے آئینِ جہاں بانی سیکھو۔ اتفاق سے اب وہ خود اسی پیغام کے علم بردار بنے ہوئے تھے۔

گیارہویں مثنوی کا عنوان 'ابرِ گہر بار' تھا۔ یہ اپنی جگہ ایک پوری کتاب سے کم نہ تھی بلکہ اسے غالب کی فکر کا خلاصہ سمجھا جا سکتا تھا۔ اس کا ایک حصہ بیانِ معراج پر مشتمل تھا جس میں راستے کے سیاروں کو بھی دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا تھا اور اس کے بعد عرش:

یہ وہ مقام تھا کہ ازروئے عقل اس کو جگہ نہیں کہہ سکتے۔
یہ وہ مقام تھا جہاں سمتوں کا تعین ہی نہ رہا، وقت اور جگہ کا وجود بے معنی ہو گیا۔
درمیان سے نظر کا غبار فنا ہوا اور دیکھنے والا ہمہ تن دید ہو گیا۔
بغیر سمت اور رخ کے آنحضرت آسمانوں اور زمین کے نور کی طرف متوجہ ہوئے،
جمالِ بسیط نے دیکھنے کو فنا کر دیا، خود اس ذات کی موج نظر کی روشنی ہو گئی!
یہاں سننے کی قوت عجیب کلام نے فنا کر دی، اس کلام میں نہ حرف تھے نہ آواز!
ذاتِ علم کی بے رنگی اس کلام میں تھی جیسے عقل سے کسی حقیقت کا ادراک کہ اس میں سننے کو دخل نہیں![۴۷]

۷۷

میر حسن نے کوئی سوال پوچھا۔ اقبال کی نگاہیں آسمان پر تھیں جہاں کبوتر محوِ پرواز تھے۔ شاید اُنہیں شاہ جی کی آواز سنائی ہی نہ دی۔ میر حسن نے دوبارہ پکارا اور جب اقبال شرمندہ سے ہو کر اُن کی طرف متوجہ ہوئے تو کہا، ''علم کتابوں میں تلاش کرو۔''[۴۸]

باب ۴

گجرات کا قید خانہ

۱۸۹۳ء تا ۱۸۹۵ء

۱

سا۔رے۔گا۔ما۔پا۔دھا۔نی۔سا

یہ مشق نویں جماعت کی درسی کتاب *Readings In Poetry* کے ایک صفحے پر لکھی جا رہی تھی۔ اُسی کے ایک اور صفحے پر اقبال نے راگ کے سُر تحریر کیے:

دھا خرج (خاص) ری گا دھا (خاص)

پا (خاص) گا ری ساری گا

وہ ستار بجانا سیکھ رہے تھے یا گائیکی؟ موسیقی اور شاعری کو الگ کرنا اُن کے بس میں کبھی نہ ہُوا۔ گزرے ہُوئے دِنوں کا وہ بچہ جس نے دو پیسے والے قصّے گاتے ہوئے اپنی طرف سے مصرع لگایا تھا، آج کا یہ طالب علم جو شاعری سیکھ رہا تھا اور آنے والے برسوں کا حکیم الامت جو ''طاؤس و رباب آخر'' کہنے والا تھا اصل میں سب ایک ہی تو تھے۔

۲

معلوم ہوتا ہے بحرِ رمل اقبال کو زیادہ پسند آئی۔[۲] اِس میں روانی تھی۔ نغمگی تھی۔ غالب کی یہ مشہور غزل بھی اِسی بحر میں تھی:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

۳

شاعری کا ایک اور علم تاریخ گوئی تھا اور اقبال نے یہ بھی سیکھا۔ حروفِ ابجد کا حساب لگانا اُنہیں دلچسپ معلوم ہوتا تھا۔[۳] عام طور پر تاریخ گوئی میں جسے مہارت ہو جائے پھر وہ اکثر مصرعوں کو پڑھتے ہوئے اُن کے اعداد پر لاشعوری طور پر توجہ دیتا رہتا ہے اور ممکن ہے کہ اقبال کی بھی یہی کیفیت رہتی ہو۔

ابجد

ا=۱ ب=۲ ج=۳ د=۴

ہوز

ہ=۵ و=۶ ز=۷

حطی

ح=۸ ط=۹ ی=۱۰

کلمن

ک=۲۰ ل=۳۰ م=۴۰ ن=۵۰

سعفص

س=۶۰ ع=۷۰ ف=۸۰ ص=۹۰

قرشت

ق=۱۰۰ ر=۲۰۰ ش=۳۰۰ ت=۴۰۰

ثخذ

ث=۵۰۰ خ=۶۰۰ ذ=۷۰۰

ضظغ

ض=۸۰۰ ظ=۹۰۰ غ=۱۰۰۰

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

۴

اندازہ ہے کہ انہی دنوں اقبال نے مشاعروں میں حصہ لینا شروع کیا ہوگا۔

سیالکوٹ میں مشاعرے ہوتے تھے۔ عشق پیچہ کے متعلق بعد میں اقبال نے کہا کہ وہ شاعر نہیں تھے تک بندی کرتے تھے۔ جلوہ صاحب کا یہ معاملہ تھا کہ ذات کے قصائی تھے اور اُن کے اشعار سن کر ایک دفعہ میر حسن نے کہا تھا، ''سچ پوچھو تو تم نے اشعار کا جھٹکا کر دیا ہے۔''

مشاعروں میں عشق پیچہ صاحب کی مخمس 'کریلے نامہ' مقبول تھی ع

سچ پوچھو تو ہوتے ہیں مزیدار کریلے

کہتے ہیں کہ جلوہ صاحب کی رنگت خاصی سیاہ تھی جس پر اقبال نے یہ شعر کہا تھا:

گر اے شبِ سیہ تجھے حسرت ہے نام کی
کچھ قرض مانگ لے مرے بختِ سیاہ سے ؎

ممکن ہے اقبال نے شروع میں اپنا شوق میر حسن سے چھپایا بھی ہو کیونکہ شاعری میں اقبال کا اولین ہیرو غالب یا بیدل نہیں بلکہ مرزا خاں داغ دہلوی تھے اور مسدسِ حالی میں ''ناپاک شاعری'' کی جتنی خصوصیات گنوائی گئی تھیں داغ کے یہاں وہ سب موجود تھیں۔ طوائفوں کو ان کے اشعار یاد تھے اور گویوں پہ سب سے زیادہ احسان شائد انہی کے رہے ہوں۔

ہوسکتا ہے کہ داغ کی زبان کا جادو ہی اقبال کو داغ کی طرف لے گیا ہو۔

۵

مارچ ۱۸۹۲ء میں اقبال اسکول کا امتحان دے کر دسویں جماعت میں آ گئے جو انٹرنس اور ففتھ ہائی بھی کہلاتی تھی۔

نصاب میں *Learned Men's English* کا اضافہ ہوا جس پر اقبال نے درج کیا:

S. Mohd. Iqbal 637, student of

10th class, Scotch Mission School,

Sialkot.

اس سال لالہ جگن ناتھ اسکول کے ہیڈ ماسٹر بنے جو کبھی یہیں کے طالب علم رہ چکے تھے۔ نرسنگھ داس کی جگہ انگریزی کی کلاسیں بھی وہی لینے لگے۔

۶

''اقبال حساب میں کمزور تھے،'' اُن کے ہم جماعت فضل الٰہی کا بیان ہے۔ ''اِس لیے مجھے حساب میں اُن کی مدد کرنے کا شرف حاصل ہے۔ اور فارسی اُن کا محبوب مضمون تھا اِس لیے میں اُن سے استفادہ کرتا تھا۔''

۷

غالباً اب اقبال نے اپنے مستقبل کے لیے سوچنا شروع کر دیا ہوگا۔

وکالت کا پیشہ ہندوستانی نوجوانوں میں بہت مقبول ہو رہا تھا۔ سر سیّد کے لڑکے سیّد محمود نے تقریباً بیس سال پہلے لندن سے بیرسٹری کی سند حاصل کی تھی۔ خواہ میر حسن نے اقبال کے ذہن میں یہ بات ڈالی ہو یا اقبال نے خود ہی سوچا ہو مگر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُسی عمر میں وہ وکیل بننے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اگر سر سیّد کا بیٹا وکیل تھا تو وکالت میں ضرور قومی خدمت کا کوئی پہلو رہا ہوگا اور ملک کے بدلتے ہوئے حالات میں مسلمان قانون دانوں کی ضرورت بھی صاف نظر آ رہی تھی۔

مگر پھر شادی کی بات چل نکلی۔

۸

گجرات میں ایک کشمیری نژاد سرجن اقبال کے بڑے بھائی کے ہم نام تھے۔ حکومت کی طرف سے خطاب پایا تھا اور خان بہادر شیخ عطا محمد کہلاتے تھے۔ حال ہی میں ترکی

سے لوٹے تھے اور اب پنجاب میں جنرل ڈیوٹی پر تھے۔ ان کے یہاں ایک لڑکا اور پانچ لڑکیاں تھیں۔ بڑی لڑکی اقبال کی بہن کی ہم نام تھیں یعنی برکت بی بی جو ۲۲ مارچ ۱۸۷۴ء کو پیدا ہوئی تھیں اور اٹھارہ برس کی ہو چکی تھیں۔[۷] خان بہادر صاحب صوفی طبیعت کے آدمی تھے۔ شیخ نور محمد کے بارے میں سنا تو اُن کے لڑکے کو اپنی بیٹی کا رشتہ دینے پر آمادہ ہو گئے۔

اقبال کو خبر ہوئی تو جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے مگر میاں جی اور بھائی صاحب اُس نئی تہذیب سے ناواقف تھے جو ہندوستان کے وکٹورین عہد میں فروغ پا رہی تھی۔ اگلے وقتوں میں شادیاں اس لیے جلدی ہوا کرتی تھیں کہ لڑکا دوڑنے پھرنے کے قابل ہوتے ہی باپ کا پیشہ سنبھال کے بیٹھ جاتا تھا۔ اگر اقبال کو میر حسن نہ ملے ہوتے تو شاید بہت پہلے ہی بے جی اُنہیں ٹوپیوں کی دکان پر بٹھا چکی ہوتیں یا میاں جی نے کسی مسجد میں پیش امام رکھوا دیا ہوتا مگر یہ زمانہ اور تھا۔ اقبال کے سامنے تو ابھی رسمی تعلیم کے سات سال پڑے تھے۔ اُس کے بعد وکالت کا امتحان دینے کے لیے مزید ایک دو برس۔ پھر چند برس پیشے میں قدم جمانے کے لیے۔ اُس کے بعد کہیں جا کر وہ شادی کا تصور کرنے کے قابل ہوتے۔

اِس کے علاوہ اقبال کی سوانح کے ایک مبہم اشارے سے جس کا مطلب سمجھانے والا اب کوئی شخص زندہ نہیں رہا یہ شبہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ شاید اقبال کو اُس زمانے میں کسی اور سے محبت رہی ہو۔[۸]

بہر حال بھائی صاحب اس شادی پر بضد نظر آ رہے تھے۔ آخر اُنہوں نے بھی زندگی میں کوئی اور کام کرنے سے پہلے شادی کی تھی اور بااثر سسرال والوں کی سفارش نے اُن پر مستقبل کے دروازے کھول دیے تھے۔ اگرچہ اُسی بااثر سسرال کی بیٹی کو اُنہوں نے طلاق دے کر گھر سے نکالا تھا مگر اُن کے نزدیک اقبال کے مستقبل کی ضمانت بھی یہی رہی ہو گی کہ کسی اُونچے گھرانے میں شادی ہو جائے۔ لڑکی کی عمر دُلہا سے زیادہ تھی جسے

نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔

سماج کے نقطۂ نگاہ سے اقبال اور کریم بی بی کی شادی اقبال اور کریم بی بی کے سوا اور سب کا مسئلہ تھی۔ چنانچہ اقبال نہ نہ کرتے رہ گئے اور دونوں طرف کے بڑوں نے ایک دوسرے کا منہ میٹھا کر دیا۔ شادی کی تیاریوں کے لیے مزید ایک سال کا عرصہ درکار تھا۔

۹

سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ گھر میں آنے والی دلہن کی جگہ بنائی جائے۔ فاطمہ بی اور طالع بی کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ مرحوم چچا کی یتیم بچیوں کی شادیاں یا تو ہو چکی تھیں یا بھر اگلے چند برسوں میں ہو گئیں۔ گجری زندہ تھیں یا نہیں، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ نہ ہی یہ معلوم ہے کہ مرحوم چچا کی بیوہ اُس وقت تک حیات تھیں یا نہیں۔ مگر پھر بھی دو کوٹھڑیوں والا مکان اب چھوٹا پڑنے والا تھا۔

سال کے آخر تک عطا محمد نے برابر والا چھوٹا مکان خریدنے کا بندوبست کر لیا جسے دسمبر ۱۸۹۲ء میں شیخ نور محمد کے نام لکھوا دیا گیا۔[۹]

۱۰

انٹرنس کے امتحانی فارم جمع کروانے کی آخری تاریخ ۲۰ فروری ۱۸۹۳ء تھی اور فیس دس روپے۔ فارم پر اقبال نے اپنی عمر ۱۷ سال لکھی جو اصل عمر سے دو برس زیادہ تھی۔

۱۱

دسویں جماعت میں ۴۰ لڑکے تھے۔ ایک اُستاد نے امتحان لینا چاہا تو کسی وجہ سے سب نے بائیکاٹ کر دیا۔ اُن میں اقبال بھی شامل تھے۔ صرف ایک لڑکے نے امتحان دیا۔ ہیڈ ماسٹر جگن ناتھ نے جو میر حسن کا پڑھایا ہوا تھا لڑکوں پر جرمانہ کر دیا اور اس دفعہ میر حسن کی آزاد خیالی بھی کسی کے کام نہ آئی۔ اُنہوں نے لڑکوں سے کہا، ''میں ہوتا تو (دوگنی رقم) جرمانہ کرتا۔ اب جا کر جرمانہ دو اور امتحان میں بیٹھو۔''

۱۲

پنجاب میں انٹرنس کے دو امتحانی مراکز تھے۔ دہلی اور گجرات۔ اقبال کو رول نمبر ۸۸۰ ملا تھا اور مرکز گجرات تھا۔

۱۳

۳ مارچ کو پہلا پرچہ ہوا۔

انگریزی میں ترجمہ کرو:

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ شروع میں آریا آفتاب پرست تھے...

انگریزی کا پرچہ اے (ٹرانسلیشن) لالہ جیا رام نے ترتیب دیا تھا، جو اُس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتے تھے۔ اُن کا نام پرچے کی پیشانی پر درج تھا۔

دوسرے پرچے پر محمد شاہ دین کا نام لکھا تھا جو لاہور کے سرکردہ میاں خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اُن کی عمر صرف پچیس برس تھی مگر بیرسٹر تھے اور جدید طرز کی نظمیں لکھتے تھے۔ ہمایوں تخلص کرتے تھے۔ شالی ہندوستان میں ان کی علمی قابلیت کے چرچے تھے اور ممکن ہے اقبال نے بھی ان کا نام سن رکھا ہو۔

PUNJAB UNIVERSITY

ENTRANCE EXAMINATION 1893

ENGLISH - PAPER B

EXAMINEE: Muhammad Shah din, B.A. Bar at -Law

1. Define:- Etymology, pronoun, Indefinite Article, Definiteve Mood, Irregular Verb, Acce, Hyperbole, Me..... nymy.

II- Give the plural of:- Calf, roof, nero.... me

III-Illustrate by constructing short sentences the uses of *that, but, as* and *since*.

IV- Show by giving examples, the difference between (a) a simple, a complex and....

V- Correct the following sentences...

VI- Pare the italicized words in the following...

VII- (a) Write a short essay on any one of the following subjects:-

1. Town and country life.
2. How to spend a holiday.
3. Object Lessons
4. Improvement of vernacular literature.
5. Education of women.

(b) Write a short letter to your father describing the relatives of yours at Lahore or elsewhere.

انگریزی، فارسی، تاریخ، جغرافیہ، عربی اور فارسی کے امتحان دینے کے علاوہ اقبال نے گجرات میں اور کیا کیا یہ معلوم نہیں۔ تقریباً یقینی ہے کہ وہ خان بہادر صاحب کے گھر نہیں گئے ہوں گے کیونکہ یہ بات اُس زمانے کے لحاظ سے معیوب تھا۔ کئی سال بعد جب اُن کی آواز اہمیت کے ساتھ سنی جانے لگی تو اُنہوں نے اِس رواج پر بھی احتجاج کیا۔ شادی اُن کی مرضی کے خلاف ہو رہی تھی مگر اُسے دیکھنے کی خواہش تو محسوس کی ہو گی جو چند ہفتوں میں اُن کی منکوحہ بننے والی تھی۔ ممکن ہے اپنے محبوب شاعر کے اشعار گنگناتے ہوئے لوٹے ہوں، رہے کیا مصطفیٰ آباد میں داغ:

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

تغافل مرنے والے سے کہاں تک
ہمیں جینا پڑا ہے امتحاں تک
مزے کی ہے ہماری بھی کہانی
کوئی پہنچا دے اُن کے قصہ خواں تک

۱۴

پسرور کی طوائف پیراں دتی کنجنی سیالکوٹ پہنچ گئی تھی۔ اُس کے آنے سے بارات مکمل ہوگئی۔"

اُن دنوں طوائفوں کا مجرا شادیوں کا اہم جزو ہوتا تھا۔

۱۵

غالباً ۴ مئی کو اقبال دُلہا بنے گھوڑے پر سوار تھے جب شاہ جی کے منجھلے بیٹے اور اقبال کے دوست محمد ذکی دوڑتے ہوئے اُن کے پاس آئے۔ اُن کے ہاتھ میں تار تھا جس میں امتحان پاس کرنے کی مبارکباد تھی۔[۱۲] یہ تار اُن کے ہونے والے خسر نے بھیجا تھا۔

امتحان پاس کرنے والوں کی فہرست میں اقبال کا نام قابلیت کے لحاظ سے آٹھویں نمبر پر تھا۔

۱۶

''منکہ محمد اقبال ولد نور محمد المعروف شیخ نتھو... اِس وقت عقدِ نکاح من مُقر رہمراہ مسمات کریم بی بی دختر شیخ عطا محمد صاحب ڈاکٹر رئیس گجرات بمقابلہ مہر مبلغ دو ہزار... نصفِ آں معجّل و نصفِ آں موجل...''

حافظ غلام احمد نے نکاح پڑھایا، جو شاہ دولہ کے دربار (گجرات) کی مسجد کے امام تھے۔

بارات میں بیس پچیس افراد شامل تھے۔ بہنیں، بہنوئی، شیخ نور محمد، حاجی نور محمد، میر حسن (جو نکاح کے گواہ) تھے، اُن کے لڑکے تقی اور ذکی، حکیم حسام الدین، اُن کے لڑکے حامد شاہ، اقبال کے پہلے اُستاد عمر شاہ، میراں بخش جلوہ وغیرہ۔[۱۳]

پیر اں دِتی کا مجرا ایک بند کمرے میں ہوا جہاں سے بچوں کو باہر رکھا گیا تھا۔

بے جی شاید دُلہن کے استقبال سیالکوٹ ہی میں رُکی ہوں۔

نکاح ۴ مئی کو ہوا اور بارت اُسی رات واپس پہنچ گئی۔ اقبال کی نئی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا:

دی جان کس خوشی سے تہِ تیغ داغ نے
لب پر تبسم اور نظر یار کی طرف

۱۷

''انہیں ایام میں ایک پیارے دوست کے انتقال نے غم کی آگ پر اور تیل ڈال دیا،'' اقبال کے ایک دوست کا بیان ہے۔ ''طبیعت کا رنج اشعار سے ٹپکنے لگا اور اس درد نے شاعری کا وہ حصہ عطا کر کے جسے گداز کہتے ہیں اقبال کو پورا شاعر بنا دیا۔''

یہ کسی ایسے واقعے کی طرف اشارہ ہے جس کا تذکرہ اقبال کے کسی اور سوانح نگار نے نہیں کیا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دوستی نہیں بلکہ محبت کی بات ہے جس کی ایک تعبیر یوں سمجھ میں ہوسکتی ہے کہ اقبال کی مرضی کے خلاف اُن کی شادی ہوئی تو اس صدمے نے کسی محبوب کی جان لے لی مگر کسی تفصیل کے بغیر صرف قیاس آرائی ہی ممکن ہے۔

''ہندوستان میں شاعری کی ستۂ ضروریہ میں لاگ یا لگاؤ کو بھی شامل کیا گیا ہے،'' اقبال کے دوست کا بیان ہے۔ ''ہمارے اقبال بھی اس سے خالی نہ رہے۔ کسی کی شوخی کے قائل ہوئے اور کلام میں رندانہ رنگ کی جھلکیاں نظر آنے لگیں اور بہت سے معاملے کے اشعار نکلنے لگے۔''[۱۴]

۱۸

اسکاچ مشن ہائی اسکول میں اقبال نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے تھے۔ دوسرے نمبر پر کھتری ذات کا جگن ناتھ دوسرے نمبر پر تھا۔ میرٹ لسٹ کے پہلے بیس طالبعلموں کو گورنمنٹ اسکالرشپ ملتا تھا۔ اقبال اور جگن ناتھ دونوں کو یہ اسکالرشپ ملا۔ شادی کے اگلے روز ۵ مئی کو اسکاچ مشن کالج میں اقبال کا داخلہ ہوا۔ انگریزی، ریاضی اور عربی لازمی مضامین تھے۔ ان کے ساتھ ایک اختیاری مضمون لینا تھا۔ اقبال نے ایک ایسے مضمون کا انتخاب کیا جو انہوں نے اسکول میں نہیں پڑھا تھا۔

فلسفہ!

۱۹

انگریزی اور فلسفہ ریونڈ جارج واخ پڑھاتے تھے۔ نصاب میں والٹر اسکاٹ کا ناول Marmon اور ضرب الامثال کی کتاب *Proverbs and Their Lessons* شامل تھی۔

Contents

Lecture I The Form and DefinitioN Of Proverb

Lecture II: The Generation Of Proverb

Lecture III: ProverbS Of Diferent Nations Compared

Lecture IV: The Poetry, Wit and Wisdom Of proverbs

Lecture V: The Morality Of Proverbs

Lecture VI: The Theology Of Proverbs

Appendix: On The Metrical Latin Proverbs Of The Middle Ages

اس کے علاوہ Longman's School Composition تھی مگر وہ اگلے برس پڑھائی گئی ہوگی کیونکہ اُس پر اقبال نے اپنے نام کے ساتھ ایف اے کلاس لکھا ہے جبکہ گیارہویں جماعت کو عام طور پر فرسٹ ایرَ کہا جاتا تھا۔

چارلس ڈکنز کا ناول A Tale Of Two Cities اور سر رچرڈ ٹمپل کی لکھی ہوئی لارڈ لارنس کی سوانح بھی نصاب میں شامل تھی۔ فلسفہ منطق ،نفسیات اور سیاسی معاشیات پر مشتمل تھا۔ مندرجہ ذیل کتابیں نصاب میں شامل تھیں مگر یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ان میں سے کون سی گیارہویں جماعت میں اور کون سی بارہویں میں پڑھائی گئی ہوں گی۔

Ray's Deductive Logic

Jardiner's Elements of Cognition

Fawcett's Political Economy for Beginners

Marshall's Ecnonomics of Industry

رے کی کتاب کے باب ۹، حصہ سوم اور ضمیمہ نصاب سے خارج تھے۔ فاسیٹ اور مارشل کی کتابوں میں سے کوئی ایک کافی سمجھی گئی تھی۔ مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان مضامین کی تدریس صرف مجوزہ کتابوں تک محدود نہیں رکھی گئی۔

عربی بدستور مولوی میر حسن پڑھا رہے تھے۔ عربی کے دو سالہ نصاب میں یونیورسٹی کے مجوزہ انتخاب کے علاوہ احمد بن علی کی مرحُ الا رواح اور ھدایت النحو شامل تھیں۔

فارسی ایک مضمون کی حیثیت میں اقبال کو چھوڑنی پڑی مگر اُنھوں نے اپنے طور پر اس زبان اور اس کے ادب کی جستجو ترک نہیں کی۔

لالہ نرنجن داس، جنھوں نے پہلے ایک جماعت میں بھی اقبال کو پڑھایا تھا، ایک مرتبہ پھر اُن کے استاد تھے۔

ریاضی کا نصاب کچھ اس طرح تھا:

1. The Arithmetic
2. Algebra: Quadratic Equations; Theory of Quadratic Equations, Imaginary Expresssios, Arithmetical, Geometrical and Harmonial Progressions; Permuations and Comtenatios; Binomial and Exponential Theorems.
3. Plane geometry: Euclid (Books I -IV and VI-IX), the more important properties of the parabolas and eclipse
4. Trignometry: Methods of measuring Angles; Trignometrical ratios and the simple relations creating them; relations between trignometrical ratios of angles differeing by multiples of right angles; Trignometrical transformation; Solution of triangles; Properties of triangles; Area of a circle

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2006

۴۰

شبلی نعمانی تبدیلیٔ آب و ہوا چاہتے تھے۔ کشمیر اور المورہ میں کچھ روز گزارنے کی سوچ رہے تھے کہ اچانک معلوم ہوا پروفیسر آرنلڈ چھٹیوں پر انگلستان جانے والے ہیں۔ دل میں ترکی کے سفر کی ہُوک اُٹھی اور جب آرنلڈ نے ساتھ لے چلنے کی حامی بھری تو انہوں نے سفر کا اعلان کر دیا۔ دوست احباب حیران ہوئے کیونکہ جہاز کی روانگی میں تین چار روز رہ گئے تھے مگر شبلی کی سیمابی طبیعت سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔

پہلے تو شبلی آرنلڈ کے شاگرد ہوا کرتے تھے کیونکہ اُن سے فرانسیسی پڑھی تھی مگر سفر کے دوران وہ آرنلڈ کے استاد بن گئے جب آرنلڈ ان سے عربی پڑھنے لگے۔ایک روز جہاز کے انجن خراب ہوئے اور مسافروں کو اپنی جانوں کے لالے پڑے تو شبلی نے دیکھا کہ آرنلڈ نہایت اطمینان سے مطالعے میں مصروف ہیں۔شبلی نے دریافت کیا تو کہنے لگے، ''اگر جہاز کو برباد ہی ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قابلِ قدر ہے۔''

قسطنطنیہ میں شبلی نے قدیم اسلامی مخطوطوں اور ایسی کتابوں کا مطالعہ کیا جو ہندوستان میں دستیاب نہیں تھیں۔ان کی مدد سے وہ آئندہ برسوں میں مسلمان شخصیات عمر فاروقؓ، ابوحنیفہ اور مامون الرشید وغیرہ کے بارے میں بہت تفصیل سے کتابیں لکھ سکتے تھے۔

ایک روز وہ عربی لباس پہنے کہیں جا رہے تھے کہ ایک ہندوستانی نے انہیں روک کر پوچھا، ''آپ ہندوستانی تو نہیں؟''جواب میں ان کے منہ سے ہاں کی بجائے نعم نکل گیا مگر وہ جھپٹ کر گلے لگے اور بولے، ''آپ تو ہماری چیز ہیں۔ہم سے بچ کر کہاں جا رہے تھے!''معلوم ہوا یہ بمبئی کے حسن آفندی ہیں، مشہور قانون دان بدرالدین طیب جی کے چچا زاد بھائی۔خود قسطنطنیہ کے متمول لوگوں میں سے تھے اور سلطان کے خطاب یافتہ تھے۔بیگم اور دو بچیوں کے ساتھ رہتے تھے جن میں سے چھوٹی لڑکی کی عمر بارہ برس اور نام عطیہ فیضی تھا۔[15]

۲۱

شادی کا مطلب تھا لڑکے کا بڑوں کی برادری میں داخلہ اور ممکن ہے اب اقبال کو حقہ پینے کی اجازت مل گئی ہو۔

پھر بھی مشرقی رہن سہن میں شادی شدہ زندگی کا تصور اُس سے بہت مختلف تھا جو انگریز صاحبوں میں رائج تھا اور اُن کے زیرِ اثر دیسی معاشرے کے بالائی طبقے میں آہستہ آہستہ مقبول ہو رہا تھا۔یہاں شوہر اور بیوی کی ایک خواب گاہ کا کوئی سوال نہ تھا اور بیوی دُوسری عورتوں کے ساتھ سوتی تھی۔میاں بیوی کے درمیان حد سے بڑھی ہوئی

شناسائی کا اظہار بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔

۲۲

''کالج میں میری تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا،'' بعد میں اقبال نے یاد کیا۔ ''میرا معمول تھا ہر روز نماز فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا۔ اِس دوران والد ماجد بھی مسجد سے تشریف لے آتے اور مجھے تلاوت کرتا دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے... وہ جیسے کسی خیال سے میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں تلاوت کرتے کرتے رک گیا... کہنے لگے، تم کیا پڑھا کرتے ہو؟ مجھے اُن کے سوال پر بہت تعجب ہوا۔ بہر حال، میں نے مؤدبانہ عرض کیا، قرآن پاک۔ کہنے لگے، تم جو کچھ پڑھتے ہو سمجھتے بھی ہو؟ میں نے کہا کیوں نہیں، تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں، کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ اُنہوں نے میرا جواب نہایت خاموشی سے سنا اور اُٹھ کر اپنے کمرے چلے گئے۔ میں حیران تھا...

''کچھ دن گزر گئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن اِس واقعے کو چھٹا روز تھا کہ صبح سویرے... والد ماجد مسجد سے واپس آئے اور میں نے تلاوت ختم کی تو اُنہوں نے مجھے بلایا اور پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے، ''بیٹا! قرآن مجید وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس پر نزول ہو... کیوں نہ تم اس کی تلاوت اس طرح کرو جیسے یہ تم پر نازل ہو رہا ہے۔ ایسا کرو گے تو یہ تمہاری رگ و پے میں سرایت کر جائے گی۔''[۱۶]

میاں جی نے جو سوال پوچھنے کے بعد چھ دن کے وقفے سے جواب دیا تھا، یہ صوفیوں کا مخصوص انداز تھا اور انہوں نے جو نصیحت کی تھی اُس کا براہ راست ماٴخذ بھی اُن کا تصوف نظر آتا ہے۔

۲۳

''نظام دکن کا اُستاد ہونے کی وجہ سے (نواب مرزا خان صاحب داغؔ دہلوی) کی شہرت اور بھی بڑھ گئی تھی،'' اقبال کے ایک دوست کا بیان ہے۔ ''لوگ جو اُن کے پاس

نہیں جا سکتے تھے، خط و کتابت کے ذریعہ دور ہی سے اُن کے پاس جاتی تھیں اور وہ اصلاح کے بعد واپس بھیجتے تھے.... (ڈاک) کی سہولت کی وجہ سے سیکڑوں آدمی اُن سے غائبانہ تلمذ رکھتے تھے اور انہیں اس کام کے لیے ایک عملہ اور محکمہ رکھنا پڑتا تھا۔ شیخ محمد اقبال نے بھی اُنہیں خط لکھا اور چند غزلیں اصلاح کے لیے بھیجیں...''[۱۷]

۲۴

اُن دنوں شاعری کے رسالے، جنہیں گلدستے کہا جاتا تھا، غالباً وہی مقام رکھتے ہوں گے جو آج ایک صدی بعد فلم اور فیشن کے رسالوں کو حاصل ہے۔

گلدستہ زبان (دہلی) کے ستمبر کے شمارے میں شرکت کے لیے طرح مصرع تھا:

میرے آگے شکوۂ بیجا کا دفتر رکھ دیا[۱۸]

اِس دفعہ اقبال نے بھی غزل بھیجنے کا ارادہ کرلیا۔

۲۵

یہ تو معلوم نہیں کہ اُس ابتدائی دور میں غزل کہتے ہوئے اقبال کس کیفیت سے گزرتے تھے مگر اولین غزل جو دستیاب ہے اُسے دیکھتے ہوئے کچھ اندازے لگائے جا سکتے ہیں۔

غزل کہنے سے پہلے قوافی اکٹھے کیے گئے ہوں گے: لیکر۔ کوثر۔ بستر۔ مرمر۔ محشر۔ سکندر۔ پھر جو تصورات ذہن میں آئے وہ اکثر داغؔ کے پسندیدہ موضوعات تھے: محبوب کی تلوار۔ غیر۔ رخسار۔ نقاب۔ آئینہ۔ البتہ اقبال جہاں زبان کی تیزی میں داغ سے متاثر تھے وہیں خیال کی بلندی کے لیے غالب کے سحر میں گرفتار بھی تھے چنانچہ موت، قبر اور قیامت کے تصورات جنہیں غالب نے بڑے دلچسپ انداز میں استعمال کیا تھا وہ بھی پسندیدہ موضوعات ٹھہرے۔ غالب کے نزدیک عشق میں لطف جب تھا کہ محبوب کے ہاتھوں قتل ہوتے ہوئے کوئی ایسی بات کہہ دی جائے کہ محبوب کو عاشق

سے چھٹکارہ پانے کے بعد بھی سکون نصیب نہ ہو۔ اُن کی آوارگی موت پر ختم نہیں ہو جاتی تھی بلکہ قبر، قیامت اور جنت میں بھی جاری رہتی تھی۔ موت محض ایک ادا اور محبوب کا دل جیتنے کی ایک کوشش کا نام تھا۔ قیامت گناہ و ثواب کے فیصلے سے زیادہ محبوب سے سرِ عام ملاقات کا بہانہ تھی جس میں نہ صرف خدا بلکہ تمام مخلوق یہ تماشا دیکھنے کے لیے موجود ہوتی۔

داغ سنجیدہ شاعر نہ تھے اور حسن کے سارے جلوے آج ہی سمیٹ لینے کے قائل تھے۔ اُن کے نزدیک تو محبوب کے احترام کی بھی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ اقبال نے جہاں اوائل جوانی میں داغ سے متاثر ہو کر یہ رنگ اختیار کیا وہاں غالب کے اس قسم کے اشعار بھی اُن کے ذہن پر اثر انداز ہوئے:

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اُٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

۲۶

شاید اگست کے کسی ہفتے میں اقبال نے اپنی غزل مکمل کی۔ قیاس یہ ہے کہ اُس زمانے میں اُن کی خط و کتابت داغ کے ساتھ شروع ہو چکی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ غزل بھی پہلے اصلاح کے لیے انہی کو بھیجی ہو۔ بہر حال زبان کے ستمبر کے شمارے میں اقبال کی غزل موجود تھی۔

اس میں بارہ اشعار تھے۔

غزل

آبِ تیغِ یار تھوڑا سا نہ لے کر رکھ دیا
باغِ جنت میں خدا نے آبِ کوثر رکھ دیا
آنکھ میں ہے جوشِ اشک اور سینے میں سوزاں ہے دل

یاں سمندر رکھ دیا اور واں سمندر رکھ دیا

ہے یقیں پھر جائے گا جب دیکھ لے گا وہ صنم
غیر کے گھر آج مَیں نے اپنا بستر رکھ دیا

بعد مُردن بھی نہ ڈالا بار کچھ احباب پر
قبر پر میرا صبا نے جسمِ لاغر رکھ دیا

نقشِ پائے غیر دیکھے ہیں جو کوئے یار میں
رہ گزر میں مَیں نے خارِ جسمِ لاغر رکھ دیا

آمدِ خط سے ہوا پوشیدہ کب چاہِ ذقن
خضر نے اِک چشمۂ حیواں چھپا کر رکھ دیا

ہنس کے پوچھا اُس صنم نے کون ہے تیرا رقیب؟
میں نے اُس کے سامنے آئینہ لا کر رکھ دیا

کشتۂ رخسار کا ظاہر نشاں ہو اس لیے
قبر پر اُس نے ہمارے سنگِ مرمر رکھ دیا

خانۂ دل دے دیا ہے داغِ اُلفت کے عوض
رہن مَیں نے اِک دِرم پر آج یہ گھر رکھ دیا

ہو نہ جائے پردۂ انوارِ حق تیرا نقاب
تُو نے گر اُس کو اُٹھا کر روزِ محشر رکھ دیا

ہاتھ دھو بیٹھ آبِ حیواں سے، خُدا جانے کہاں
خضر نے اُس کو چھپا کر اے سکندر رکھ دیا

قصہ خوانِ یار کو بھیجا ہے لکھ کر حالِ دل
ہاتھ میں قاصد کے میں نے ایک دفتر رکھ دیا

گلدستۂ زبان (دہلی)

ستمبر۱۸۹۳ء

۲۷

اگلی دفعہ کا مصرع تھا:

خوب طوطی بولتا ہے اِن دِنوں صیّاد کا

۲۸

خان بہادر صاحب سے اقبال مانوس ہو چلے تھے۔ اُن کے پاس کتابوں کا ذخیرہ تھا اور روایت ہے کہ اقبال نے بہت سی کتابیں اُن سے لے کر پڑھیں اگرچہ اُن کتابوں کے نام معلوم نہیں۔[۱۹]

کریم بی بی اور اقبال کی طبیعتوں میں اور جو بھی فرق رہے ہوں مگر گجرات آنے میں دونوں کو خوشی ہوتی تھی۔

غزل

کیا مزہ بلبل کو آیا شیوہ بے داد کا
ڈھونڈتی پھرتی ہے اُڑ اُڑ کر جو گھر صیاد کا

جب دعا بہر اثر مانگی تو یہ پایا جواب
غیر رو کر لے گئے حصہ تری فریاد کا

ہوں وہ ناداں، ڈر سے زیرِ دام پنہاں ہو گیا
دُور سے چہرہ نظر آیا اگر صیّاد کا

بھول جاتے ہیں مجھے سب یار کے جور و ستم
مَیں تو اے اقبالؔ دیوانہ ہوں تیری یاد کا

گلدستہ زبان (دہلی)

نومبر ۱۸۹۳ء

پوری غزل میں ۸ اشعار تھے۔ مقطع میں بھول اور یاد کی صنعتِ تضاد پر شاید داغ سے داد ملی ہو۔

۲۹

شاید اُنہی دنوں گجرات میں سسرالی رشتہ داروں یا دوستوں نے غزل کہنے کی فرمائش کی ہوگی کیونکہ اقبال کے ابتدائی کلام میں ایک ایسی بے لطف غزل بھی موجود ہے کہ تک بندی کے معیار پر بھی پوری نہیں اُترتی۔ اِس کا کوئی جواز اس کے سوا پیش نہیں کیا جا سکتا کہ شاعر سے زبردستی کہلوائی گئی ہو اور شاعر کو سناتے ہوئے یہ خیال نہ ہو کہ سننے والوں میں سے کوئی فن کی باریکیوں کو دیکھنے والا بھی ہوگا۔ پوری غزل میں گیارہ اشعار ہیں:

کام بُلبل نے کیا ہے مانی و بہزاد کا
برگِ گل پر اس نے فوٹو لے لیا صیّاد کا
ہو گیا اقبالؔ قیدی محفلِ گجرات کا
کام کیا اخلاق کرتے ہیں مگر صیّاد کا

معلوم ہوتا ہے اخلاق وہاں کسی شخص کا نام تھا۔[20]

۳۰

۲۷ دسمبر کو علی گڑھ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا آٹھواں سالانہ اجلاس شروع ہوا جو تین روز جاری رہا۔ نواب محسن الملک اس دفعہ صدارت کر رہے تھے۔ تقریر کرنے والوں میں سیّد محمود اور میاں شاہ دین شامل تھے۔ مولانا شبلی نعمانی نے استقبالیہ نظم پڑھی۔ اِس اجلاس میں علی گڑھ سے بی اے کرنے والے ایک کشمیری طالب علم نے پہلی دفعہ

اپنے اشعار سنائے۔ معلوم ہوتا تھا کہ حالؔی کی اصلاحی شاعری اور ایک نوجوان کی تخلیقی فطرت کے امتزاج نے ایک نئے خوبصورت لہجے کو جنم دیا ہے:

ہر سحر سنتے ہیں اِک آوازِ غیب

لیس للانسان الاّ ما سعیٰ

شاعر کا نام خوشی محمد ناظرؔ تھا۔

سید محمود کا لڑکا چار سال چار ماہ کا ہو گیا تھا۔ راس مسعود نام تھا۔ گول مٹول سا بچہ تھا۔ اسٹیج پر محسن الملک اور اپنے دادا کے دوست راجہ جے کشن کے درمیان بیٹھا تھا۔ آج اُس کی بسم اللہ تھی۔

''یہ بچہ مجھ کو سب سے پیارا ہے،'' سر سیّد نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ''میں چاہتا تو دو چار ہزار روپیہ اس تقریب میں غریب ہونے کے باوجود خرچ کر سکتا تھا... لیکن میں نے اپنے لڑکے سید حامد اور اپنے لختِ جگر سید محمد احمد تک کو نہیں بلایا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے پانچ سو روپے کی تھیلی نواب محسن الملک کے سامنے رکھی اور راس مسعود سے پوچھا، ''میاں، یہ روپیہ کس کو دیا جائے؟'' بچے نے پہلے سے سکھائے ہوئے جواب کو بڑی بے ساختگی سے دہرایا، ''مدرسہ کو دے دیجیے۔'' اس کے بعد محسن الملک اور جے کشن نے بھی پانچ پانچ سو روپیہ مدرستہ العلوم (علی گڑھ کالج) کی نذر کیے۔ اس طرح یہ تقریب سر سید کی اصلاحِ رسوم کی کوششوں کا حصہ بن گئی۔

اجلاس میں میر حسن نے اپنا مرتب کیا ہوا سیالکوٹ کے مسلمانوں کا تعلیمی جائزہ پیش کیا۔ پچھلی مرتبہ جن دو تین سو نمائندوں کو نامزد کیا گیا تھا اُن میں سے سترہ نے جائزے مکمل کیے تھے جن کی روشنی میں یہ قرارداد منظور ہوئی، ''مسلمانوں میں ترقی تعلیم کے لیے جمہوری کوشش کی ضرورت ہے۔'' میر حسن نے اپنے مخصوص عملی رجحان کے تحت کہا، ''جب تک عملی کوشش رزولیوشن کی تعمیل کے واسطے نہ کی جاوے گی اُس وقت تک تمام رزولیوشن مثل ردی کاغذ کے سمجھے جاویں گے اور یہ جلسہ تماشہ کا سمجھا جائے گا۔''

جواں سال بیرسٹر میاں شاہ دین نے مسلمان مزارعین میں بنیادی تعلیم کو فروغ دینے کی تجویز پیش کی۔

۳۱

شاید اُسی وقت جب علی گڑھ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا آٹھواں اجلاس ہو رہا تھا اقبال گجرات یا سیالکوٹ میں بیٹھے نئی غزل کے لیے قافیے تلاش کر رہے تھے۔ طرح مصرع تھا:

یہ اشارے مجھے پیغامِ قضا دیتے ہیں

غزل

جان دے کر تمھیں جینے کی دُعا دیتے ہیں
پھر بھی کہتے ہو کہ عاشق ہمیں کیا دیتے ہیں
ایسی ذلّت ہے مرے واسطے عزّت سے سوا
خود وہ اُٹھ کر مجھے محفل سے اُٹھا دیتے ہیں
موت بولی جو ہوا کُوچۂ قاتل میں گزر
سَر اِسی راہ میں مَردانِ خدا دیتے ہیں
گرم ہم پر کبھی ہوتا ہے جو وہ بت اقبالؔ
حضرتِ داغؔ کے اشعار سُنا دیتے ہیں

گلدستہ زبان (دہلی)

فروری ۱۸۹۴ء

پوری غزل میں ۱۰ اشعار تھے۔

۳۲

لدھیانہ کے ایک نومسلم سعد اللہ سعدی اُن دنوں مرزا غلام احمد کی ہجو لکھا کرتے تھے

اور منظوم گالیاں دیتے تھے۔ ایک روایت ہے کہ اقبال نے ۱۲۱ اشعار کی ہجو لکھ کر جماعت احمدیہ کے اخبارات میں شائع کروائی:

واہ سعدی! دیکھ لی گندہ دہانی آپ کی
مہتروں میں خوب ہو گی قدردانی آپ کی[۴]

۱۸۹۴ء میں مرزا غلام احمد کی طرف داری کرنے کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے کیونکہ ابھی پچھلے ہی برس اُنہوں نے اپنی کتاب آئینہ کمالاتِ اسلام میں ملکہ وکٹوریہ کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی اور پھر امرتسر کے ایک مناظرے میں بڑے دلچسپ انداز میں پادریوں کو نیچا دکھایا تھا جب بعض پادریوں نے کوڑھیوں اور اندھوں کو مرزا صاحب کے پاس بھیجا اور کہلوایا، ''آپ مسیحِ موعود ہیں تو اِنہیں صحیح کر دیں۔'' مرزا صاحب نے مریضوں کو پادریوں کے پاس واپس بھیجتے ہوئے جواب دیا، ''حضرت عیسیٰ کی مسیحائی کا تذکرہ انجیل میں موجود ہے ہمارے قرآن میں نہیں مگر آپ کی انجیل یہ بھی کہتی ہے کہ عیسائیوں کے دل میں اگر سرسوں کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو گا تو وہ پہاڑوں کو ہلا کر رکھ دیں گے۔ اب آپ اِنہیں اپنے ایمان کی قوت سے تندرست کر دیں''۔

اِس کے باوجود وہ ہجو جسے اقبال سے منسوب کیا جاتا ہے اقبال کی معلوم نہیں ہوتی۔ اس کا براہِ راست ماخذ کوئی ہمعصر اخبار نہیں بلکہ بعد میں چھپی ہوئی ایک کتاب ہے۔ اِس میں جو روانی ہے وہ اقبال کی اُس زمانے کی مستند غزلوں میں کہیں دکھائی نہیں دیتی اور جس قسم کا ابتذال ہے اُس کی کوئی اور مثال بھی اقبال کے یہاں نہیں ملتی بلکہ عجیب سا لگتا ہے کہ ایف اے کے زمانے میں وہ بعض ناگوار تشبیہات سے لبریز نظم کسی ایسے رسالے میں شائع کرواتے جسے اُن کے بزرگوں کی نظر سے گزرنا تھا۔

فرسٹ ائر میں کل ۲۰ طلبہ نے داخلہ لیا تھا۔ آخری طالب علم ۸ مئی ۱۸۹۴ء کو داخل ہوا۔

بیس میں سے صرف چار طالب علم مسلمان تھے باقی ہندو، عیسائی اور سکھ تھے۔

۱۸۹۴ء کے کسی مہینے اقبال نے کالج کا امتحان پاس کیا اور سیکنڈ ائر میں پہنچ گئے۔

۳۴

It was the best of times, it was the worst of times; it was the age of wisdom, it was the age of foolishness; it was the epoch of belief, it was the epoch of incredulity; it was the season of Light, it was the season of Darknes...

A Tale of Two Cities, p.1

اقبال نے نصاب کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں پڑھیں مگر صرف دو کے نام معلوم ہیں۔

ایک *English Men of Action* تھی جس پر انہوں نے حسبِ عادت اپنا اور کالج کا نام لکھا۔ دُوسری پر سال بھی درج کیا، ۱۸۹۴ء۔ یہ شیکسپئر کا مشہور ڈرامہ *Richard III* تھا:

Now is the winter of our discontent
Made glorious summer by this sun of York...

۳۵

داخلہ فارم جمع کروانے کی آخری تاریخ ۴ فروری ۱۸۹۵ء تھی۔ امتحانی فیس دس روپے۔

۳۶

معلوم ہوتا ہے بے جی کی کفایت شعاری یا میاں جی کے داماد کی ہوشیاری سے ایک دفعہ پھر کچھ روپیہ جمع ہوا تھا۔ شیخ عطا محمد نے گھر کے برابر والی دو دکانیں خرید کر میاں جی کے نام کر دیں۔ وہ شاید اُن دنوں چھٹیوں پر آئے ہوئے تھے۔ چنانچہ اپنی نگرانی میں پرانے دونوں مکانوں اور ان دکانوں کو ملا کر ایک نیا دو منزلہ تعمیر کروانا شروع کر دیا۔[۴۴]

۳۷

شہر کا یہ حصہ نیا نیا آباد ہوا تھا اور اس کی صفائی اور خوبصورتی ایک نئی دنیا کا احساس دلاتی تھی۔ یوں نظر آتا تھا جیسے سارا شہر ایک دلفریب باغ ہے جس میں سنگترے اور آم کے درختوں کے درمیان کہیں کہیں دفاتر، کالج اور مکانات کھڑے ہیں۔ ان سب کو آپس میں ملانے کے لیے ایک لمبی چوڑی مال روڈ تھی جو اپنی صاف ستھری چکنی سطح کے لحاظ سے کسی عجوبے سے کم نہیں تھی۔ یہ خوابوں کی دُنیا انگریز کی قوتِ تعمیر کا معجزہ تھی۔ کہیں کہیں خودرو جھاڑیاں گویا انسان کے ہاتھوں شکست کھانے والی فطرت کا نوحہ کر رہی تھیں۔

۱۸ تاریخ کو جب گورنمنٹ کالج لاہور کے ہال کمرے میں بیٹھے اقبال پرچہ حل کر رہے ہوں گے تو باہر پھیلے ہوئے درختوں میں آباد چڑیوں کی خوشگوار آوازوں نے کمرۂ امتحان کی خاموشی کے حسن میں اضافہ کیا ہوگا۔ اُس وقت تک یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اقبال کو ابھی مزید پڑھنا ہے۔ چند ماہ بعد لاہور واپس آ کر اسی کالج سے بی اے کرنے کا تصور بڑا رومان انگیز رہا ہوگا۔

ایف اے کے پرچوں کی ترتیب کے بارے میں اِتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ ۲۱ مارچ کو ریاضی کا امتحان تھا اور خاصا مشکل تھا۔ اگلے روز فلسفہ کا امتحان ہوا جسے اکثر طالب علموں نے ''حسبِ لیاقت'' قرار دیا۔

۳۸

سیالکوٹ میں نیا دومنزلہ مکمل ہو چکا تھا۔

۲۸ اپریل کو انٹرمیڈیٹ کا نتیجہ نکلا۔ اسکاچ مشن کالج کے صرف چار لڑکے کامیاب ہوئے تھے۔ اُن میں اقبال بھی شامل تھے جنہوں نے ۵۷۰ میں سے ۲۷۶ نمبر حاصل کر کے دوسری ڈویژن پائی تھی اور ۴۶۶ اُمیدواروں میں سے چوہترویں پوزیشن پر رہے تھے۔ بہر حال یہ کامیابی تھی۔

بی اے میں عربی، انگریزی اور فلسفہ کے مضامین رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔

۳۹

لاہور جانے کی تیاریاں ہونے لگیں جو سیالکوٹ سے ترقی کے راستے پر نکلتے ہوئے سنہری مواقع کا شہر تھا۔

اقبال کی شریکِ حیات کریم بی بی کے سلسلے میں یہ طے پایا کہ لاہور میں اقبال کا قیام چونکہ کالج ہوسٹل میں رہے گا لہٰذا وہ اُن کے ساتھ نہیں جا سکتیں۔[43] ویسے اقبال کے بڑے بھائی بھی بیوی بچوں کو ساتھ نہیں رکھتے تھے بلکہ پیچھے چھوڑ جاتے تھے۔ اُن دنوں لڑکی کا رشتہ براہِ راست سسرال سے اور بالواسطہ شوہر سے ہوا کرتا تھا۔

کریم بی بی کو البتہ یہ رعایت دی گئی کہ اقبال کی غیر حاضری کا عرصہ وہ اپنے میکے گجرات میں گزار لیا کریں۔ یہ معاملہ کس طرح طے ہوا اور اقبال اور اُن کے گھر والوں کا اس پر کیا ردِعمل تھا اس ضمن میں روایات خاموش ہیں۔

۴۰

میاں جی ایک روز کہنے لگے، ''بیٹا! میں نے تمہاری تعلیم پر جو محنت کی ہے، مجھے اُس کا معاوضہ ادا کر دینا۔''

اقبال نے سعادتمندی سے حامی بھری تو اُنہوں نے کہا کہ معاوضہ وقت آنے

پر بتائیں گے اور پھر صوفیانہ بے نیازی کے ساتھ دوسری چیزوں میں محو ہو گئے۔[۴۴]

۴۱

محلے والوں کو بوڑھے درزی کی خوشحالی کچھ اچھی نہیں لگتی تھی۔ نیا دو منزلہ دور ہی سے نمایاں نظر آتا ہو گا۔

ایک پڑوسی نے زیادہ قیامت ڈھائی۔ شیخ نور محمد کے مکان کی کھڑکیوں کے عین نیچے کھلے میدان میں بھٹیارن کا تنور لگوا دیا جس کا دھواں سیدھا مکان میں آتا تھا۔ یہ صورتِ حال خاصی تکلیف دہ تھی۔[۴۵]

غالباً انہی دنوں کی بات ہے۔ ایک فقیر نے مکان کے دروازے پر آ کر صدا لگائی۔ اقبال نے پہلے تو اُسے منع کیا مگر وہ کسی طرح ٹلتا نظر نہ آیا تو اپنی چھڑی گھما دی۔ کشکول زمین پر گر گیا اور دن بھر کی کمائی ریزہ ریزہ بکھر گئی جسے دوبارہ جمع کرنے کے لیے وہ بوڑھا فقیر بے چارگی سے زمین پر بیٹھ گیا اور یہ منظر کہیں شیخ نور محمد نے دیکھ لیا۔

''بیٹا!'' اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ''قیامت کے روز جب یہ فقیر خدا کے رسولؐ کی بارگاہ میں حاضر ہو گا تو وہ مجھ سے جواب طلب کریں گے کہ خدا نے ہماری اُمت کا ایک فرد تیرے حوالے کیا تھا اور تُو اُس کی بھی تربیت نہ کر سکا؟ میری سفید داڑھی کی طرف دیکھو اور میری مٹتی ہوئی اُمیدوں کی طرف نظر کرو!''

اقبال یہ بات کبھی بھلا نہ سکے۔[۴۶]

۴۲

اقبال کی زندگی کے ابتدائی اٹھارہ برسوں کی اہمیت یہی نہیں ہے کہ اُن میں اقبال بڑے ہوئے بلکہ یہ ایک عہد تھا جس میں سیالکوٹ شہر اور معاشرہ بھی ساتھ ساتھ جوان ہو رہا تھا۔ اقبال کے بچپن میں جہاں چند مکانات ہوتے تھے وہ جگہیں اب گلیوں اور

کوچوں میں تبدیل ہو چکی تھیں جیسے ہنٹر پورہ۔ شہروں کے درمیان وہ سفر جو اقبال کی پیدائش کے وقت عموماً چھکڑوں میں طے ہوا کرتا اب اُس کے لیے ریل گاڑیاں عام ہو چکی تھیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کی آنکھوں کے سامنے سیالکوٹ چھوٹی صنعتوں کے ایک اہم شہر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جب اُن کی بہن کی شادی ہوئی تھی تو فضل الٰہی کی دکان پر یورپ سے درآمد کیا ہوا کھیلوں کا سامان بکتا تھا مگر اب یہ سامان سیالکوٹ میں بننے لگا تھا اور صرف اقبال کے بہنوئی کی دکان پر نہیں بکتا تھا بلکہ خود یورپ کو بھیجا جاتا تھا۔

اقبال نے محنتی لوگوں کی مستقل مزاجی اور ہوشیاری کے ہاتھوں ایک معاشرے کو کروٹ بدلتے دیکھا تھا اور خود بھی اسی معاشرے کا فعال شخص بننا چاہتے تھے۔ مستقبل کی جو تصویر اُن کے ذہن میں اُبھرتی تھی وہ مشہور شاعر کی نہیں بلکہ خوشحال وکیل کی تھی۔ ماچسیں بیچنے والا گلاب دین اپنی محنت سے کامیاب وکیل بن سکتا تھا تو وہ جن کی ذہانت پر اساتذہ کو ہمیشہ فخر رہا تھا بھلا کہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔

۴۳

اُس زمانے کے مزاج میں معاشرتی ترقی کا جوش اور جذبہ رچا بسا ہوا تھا۔ ہندوستان نے ایک طویل نیند سے آنکھیں کھولی تھیں اور ابھی نیند اور بیداری کے ملے جلے خمار میں تھا۔ معاشرے میں اپنا مقام حاصل کرنے کے علاوہ برادری کے لیے کچھ کرنے کا رواج بھی چل نکلا تھا۔

۴۴

پھر ایک دن بوڑھے نور محمد نے اپنی محنت کا معاوضہ بھی بتا دیا۔ ’’میں نے تمہاری تعلیم پر جو محنت اور روپیہ صرف کیا ہے اُس کا معاوضہ یہ ہے کہ تم اسلام کی خدمت کرو۔‘‘[۲۸]

اقبال کے ذہن میں باپ کا وہ خواب بھی تازہ ہوا ہو گا جس کے مطابق اُن کی

پیدائش ہی اس لیے ہوئی تھی کہ اسلام کی خدمت کر کے دُنیا میں ناموری حاصل کریں۔

۴۵

ستمبر ۱۸۹۵ء کی کسی تاریخ کو اقبال ریل گاڑی میں سوار ہو کر سیالکوٹ سے روانہ ہوئے۔

شاید اُس وقت کسی کو اندازہ نہ رہا ہو کہ اب وہ سیالکوٹ میں کبھی مستقل سکونت اختیار نہیں کریں گے اور نہ ہی کبھی اپنی بیوی کے ساتھ دوبارہ ایک گھر میں رہ سکیں گے۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

باب ۵

حکیموں کا بازار

۱۸۹۵ء تا ۱۸۹۹ء

۱

اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے۔ اقبال گورنمنٹ کالج میں اُس وقت داخل ہوئے جب نیا سیشن پرانا ہو چکا تھا اور ہاسٹل میں کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔

اس مشکل کا حل گلاب دین نے پیش کیا جن کی وکالت چل نکلی تھی اور وہ اپنے بھاٹی دروازے والے مکان میں ایک مہمان کا بوجھ بآسانی برداشت کر سکتے تھے۔[1]

اُس وقت اقبال کی عمر اٹھارہ برس تھی جسے وہ ریکارڈ کی غلطی کی وجہ سے بیس سمجھتے تھے۔ اُن کا حلیہ معلوم نہیں مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ لاہور میں قیام کے ابتدائی زمانہ میں فیشن کے مطابق ایرانی بادشاہوں کی طرح نیچے کی طرف بڑھی ہوئی لمبی لمبی مونچھیں رکھتے تھے اور گول فریم کا چشمہ لگاتے تھے جس کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی آنکھوں میں بچوں جیسی حیرانی تھی۔ درحقیقت اُن میں سے صرف بائیں آنکھ کام کرتی تھی۔

شام کو سورج غروب ہونے کے بعد پرانا شہر چراغوں اور لالٹینوں کی روشنیوں کے دامن میں پناہ لیتا تھا اور اُس کے سرے پر شاہی قلعہ اور بادشاہی مسجد کے مینار انتہائی پراسرار معلوم ہوتے تھے۔ قلعہ انگریز فوج کا مستقر تھا جس میں شہریوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ مسجد نمازیوں کے لیے کھلی تھی مگر اُس کے ٹوٹے مینار اور اُکھڑا پلستر پچاس ساٹھ برس پہلے کی یاد دلاتے تھے جب سکھ مہاراجہ نے اسے اصطبل بنا دیا تھا۔

پرانے شہر کی ہیرا منڈی انیسویں صدی میں نئے شہر کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔

گورنمنٹ کالج میں ایف اے سے ایم اے تک تقریباً سبھی شعبوں کی جماعتیں موجود تھیں۔ طلبہ کی کل تعداد ۲۶۴ تھی مگر حاضری اور امتحانات کے نرم قواعد کی وجہ سے بعض طلبہ جماعتوں سے غائب رہتے تھے۔[۲]

بی اے جس میں اقبال نے داخلہ لیا تھا اُس کی فیس آٹھ روپے ماہوار تھی مگر ادائیگی اپنی مرضی سے کسی وقت بھی کی جاسکتی تھی۔ ان تمام رعایتوں کی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانے میں برطانوی حکومت ہندوستانی طلبہ کو زیادہ تعداد میں مغربی تعلیم کی طرف راغب کرنا چاہتی تھی۔

بی اے فلسفہ میں پہلے منطق پڑھائی جاتی تھی۔ اقبال کی وہ درسی کتاب آج بھی محفوظ ہے جس میں اُنہوں نے جگہ جگہ **important** کے نشان لگائے تھے۔

لالہ جیا رام کی شرافت ضرب المثل تھی۔ اُس زمانے کے دوسرے پروفیسروں کی طرح ان کے پاس بھی ذاتی کتب کا ذخیرہ تھا اور جب اُنہیں اقبال کے ذوق کا اندازہ ہوا تو اُنہوں نے اقبال کو اپنے ذخیرے سے فیض یاب ہونے کی اجازت دے دی۔

انگریزی پرنسپل ڈالنجر صاحب خود پڑھاتے تھے۔

عربی کا شعبہ اورینٹل کالج میں منتقل ہو چکا تھا۔ جو ان دنوں گورنمنٹ کالج کے احاطے میں واقع تھا۔

اقبال کے عربی کے اُستاد غالباً مولوی محمد الدین فوقی تھے اور کشمیری نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ عمر پینتالیس برس کے قریب تھی مگر عربی اور فارسی میں کئی کتابیں تحریر کر چکے تھے۔ ان دونوں زبانوں میں شعر بھی کہتے تھے۔

کالج میں اُن کے ہم جماعتوں میں ہر قسم کے لڑکے شامل تھے۔ میاں فضل حسین جن کا تعلق لاہور کے ایک متمول گھرانے سے تھا۔ چودھری شہاب الدین ان پڑھ کسان کے لڑکے جنہیں تعلیم حاصل کرنے کے لیے گھر سے بھاگنا پڑا تھا۔ ان کی رنگت کالی سیاہ

اور ہاتھ پاؤں لمبے چوڑے تھے۔ کالج میں داخلہ لینے سے پہلے کچھ عرصہ ریلوے اسٹیشن پر قلی رہے تھے۔

۳

اُسی برس کے آخری دنوں میں شیخ نور محمد یا اُن کے گھر والوں نے اُس پڑوسی کے خلاف مقدمہ کر دیا جس کی وجہ سے اُن کا گھر دھوئیں سے بھرا رہتا تھا۔ دیوانی عدالت میں تاریخیں پڑنے لگیں:۳

شکایت کو میں دوڑوں اور تم جانے نہ دو مجھ کو
مزہ آئے جو ہو یہ ہاتھاپائی روزِ محشر بھی۴

۴

اقبال کے ذاتی مجموعے میں سے مندرجہ ذیل کتابوں پر اُس زمانے کی تحریریں موجود ہے۔۵

(1) Bernal Bosanquet: *Essentials of Logic*. London, McMillan (1895)

یہ کتاب بی اے کے نصاب میں شامل تھی۔ ہر صفحے پر سیاہ یا سرخ نشانات موجود ہیں اور جگہ جگہ ''امپورٹنٹ'' (important) لکھا گیا ہے۔

(2) W. Stanley Jersons: *Elemeary Methods in Logic Deductive and Inductive*. London, Macmilan (1890)

اس کے علاوہ بہت سی کتابیں ۱۸۹۵ء سے پہلے کی مطبوعہ ان کے مجموعے میں شامل ہیں مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال نے اُنہیں کب پڑھا ہوگا۔ کالج کی لائبریری سے جو کتابیں اُنہوں نے پڑھیں اُن کی فہرست بنانا بھی ممکن نہیں۔ اقبال کی سوانح نگاری

میں یہ ایک خلا ہے کیونکہ اُس زمانے میں اُن کی اصل زندگی مطالعہ اور فکر تھی جس کے صرف مٹے مٹے سے نقوش اُبھرتے ہیں۔ اِتنا اندازہ ہوتا ہے کہ بعض موضوعات میں اُنہیں خاص دلچسپی تھی جن کا وہ گہرا مطالعہ کر رہے تھے۔

(۱) آریاؤں کی تاریخ

اقبال کو اپنے آباؤاجداد سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ پھر یہ اُس زمانے کا خاص موضوع تھا جس پر مستشرقین نے بے شمار کتابیں تحریر کی تھیں۔

(۲) زردشت

ایرانی بھی آریا تھے۔ اقبال کے مجموعے میں ایک ایسی کتاب بھی ہے جس میں زردشتی مذہب کا عبرانی مذاہب سے، جن میں اسلام شامل ہے، موازنہ کیا گیا ہے۔

(۳) مذہبی تجربہ

یہ خیال کہ روحانی تجربات کو عقل کی مدد سے پرکھا جا سکتا ہے یا نہیں، فلسفہ کا خاص موضوع تھا اور گزشتہ ایک سو برس سے اس پر سرگرم بحث ہو رہی تھی۔ کانٹ کے خیال میں انسانی عقل محدود تھی اور خدا تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ہیگل کے نزدیک اگر معجزات کو عقلی طور پر ثابت کیا جا سکتا تھا نہ رد کیا جا سکتا تھا لہٰذا معجزات پر یقین نہ رکھنا بھی اتنا ہی خلافِ عقل تھا جتنا کہ اُن پر یقین رکھنا۔ ان سب سے علیحدہ مسلمانوں کا صوفی ادب تھا، جس کی طرف اب اہلِ مغرب کی توجہ ہوئی تھی مگر تصوف کی کوئی جدید تاریخ ابھی تک نہیں لکھی گئی تھی۔

(۴) جمالیات

یہ اقبال کی اپنی اُفتادِ طبع بھی تھی اور فلسفہ کی شاخ بھی۔ وہ ایک نوجوان کے طور پر حسن سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتے تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ عقلی تجزیہ دل کو زنجیر پہنانے میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں!

(۵) گناہ

یہ خاص طور پر اُن کی دلچسپی کا موضوع تھا۔ فلسفہ میں اخلاقیات عقلی طور پر گناہ کا تجزیہ کرتی تھی مگر اقبال کے ذہن میں یہ صوفیانہ خیال بھی سمایا ہوا تھا کہ گناہ کے بغیر خدا تک نہیں پہنچ سکتے۔ گناہ گار جب اپنے گناہ پر شرمندہ ہوتا ہے تو اُس کے ضمیر کی کشمکش خدا کی رحمت کو جوش میں لاتی ہے۔ گناہ پر شرمندہ ہو کر انسان اُس تڑپ سے واقف ہوتا ہے جو زاہد اور عبادت گذار اپنی ہزار سال کی عبادت میں بھی حاصل نہیں کر سکتا۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اگر گناہ کی کوئی افادیت نہ ہوتی تو خدا کی کائنات میں گناہ کا وجود بھی نہ ہوتا۔

۵

مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت میں لاہور ویسی ہی اہمیت حاصل کر رہا تھا جیسی دہلی کو چالیس پچاس برس پہلے تک حاصل رہی تھی۔ ہندوستان کے نامور شاعر اور ادیب لاہور میں آباد ہو رہے تھے یا یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد تو اقبال کے قریب ہی بھاٹی دروازے میں رہتے تھے اگرچہ نجی زندگی کے صدموں سے دیوانے ہو چکے تھے اور شام کے وقت پرانے شہر کی گلیوں میں دکھائی دیتے تھے۔

مولانا حالی بھی ایک زمانے میں یہاں آئے تھے اور آزاد کے ساتھ مل کر نئی شاعری کی بنیاد رکھی تھی۔ نواب داغ دہلوی کے لاہور آنے کا واقعہ تو اُن دنوں قریب قریب سبھی کی زبان پر رہا ہوگا۔ دہلی دروازے کا تاراچند حلوائی بڑے فخر سے لوگوں کو بتاتا تھا کہ فصیح الملک اُس کی دکان پر تشریف لائے تھے اور پھر اپنا یہ مصرع پڑھتا تھا:

تارا نہ ہو تو حلوائے سوہن کھلائے کون

شاعری، طب اور خوش خطی کو تعلیم یافتہ مسلمان کے لیے ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ دہلی کے بعد لاہور نے مسلم تہذیب کی حفاظت کی ذمہ داری اُٹھائی تھی تو اُردو شاعری کا ذوق بھی یہاں بچے بچے میں پھیل گیا تھا۔

ایک روز اقبال شلوار قمیض اور ٹوپی پہن کر بھاٹی دروازے سے گزر رہے تھے کہ کالج کے دو جونیئر طلبہ نے اُن کا راستہ روک لیا۔ ان میں سے ایک سیالکوٹ کا رہنے والا جلال دین تھا اور اُن سے واقف تھا۔

''یہ وہی شیخ محمد اقبال ہیں، جن کا میں ذکر کرتا ہوں،'' اُس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ پھر اُس کا تعارف اقبال سے کروایا۔ انبالے کا نوجوان میر غلام بھیک تھا۔ شاعر تھا اور نیرنگ تخلص کرتا تھا۔[۱]

چند روز بعد جلال دین دوبارہ اقبال کے پاس آئے تو معلوم ہوا نیرنگ کو دکھانے کے لیے غزل درکار ہے۔ اقبال نے ایک غزل کاغذ پر لکھ کر اُن کے حوالے کر دی۔ عام مضامین تھے مگر بعض بعض جگہوں پر الفاظ یا خیال میں انوکھا پن تھا مثلاً شمع جو محبوب کی بزم میں جلوہ افروز ہے اُس کی زلف جس شانے پر بکھرتی ہے وہ پروانے کا پر ہے، شاعر کا دل ٹوٹا ہوا پیمانہ ہے مگر اُس میخانے سے تعلق رکھتا ہے جہاں روزِ الست خدا نے پوچھا تھا، تمہارا رب میں ہی ہوں تو جواب میں ہر روح کسی مے خوار کی طرح مست ہو کر پکاری تھی کہ ہاں بے شک!

اِس کے علاوہ واعظ پر تنقید تھی اور رسول کریمؐ سے عقیدت کا اعلان:

حضرتِ واعظ ہیں میخانے میں شاید آ گئے
کلمۂ لاحول، وردِ ہر لبِ پیمانہ ہے
اُڑ کے اے اقبالؔ سوئے بزمِ یثرب جائے گا
روح کا طائر عرب کی شمع کا پروانہ ہے

دستیاب غزل میں اٹھارہ اشعار ہیں اور ان کے علاوہ ایک شعر نیرنگ نے یادداشت سے بیان کیا ہے۔ ''میں نے اُس وقت تک اہل پنجاب کی اُردو شاعری کے جو نمونے دیکھے تھے اُن کو دیکھ کر میں اہل پنجاب کی اُردو گوئی کا معتقد نہ تھا،'' نیرنگ کا بیان ہے۔

''مگر اقبال کی اس غزل کو دیکھ کر میں نے اپنی رائے بدلی۔''[۶]

اقبال نے فرمائش کی تھی کہ نیرنگ بھی اپنا کلام اُنہیں دکھائیں:

حرم کو چلنا اے زاہد یہ ساری ظاہر پرستیاں ہیں
میں اُس کی رندی کو مانتا ہوں جو کام لے دَیر سے حرم
کا

دونوں کے درمیان ہم خیالی اور دوستی کے ایسے رشتے نے جنم لیا جو عمر بھر قائم رہا۔

۷

پرانے لاہور کے بعض خاندان اپنی خاندانی عظمت و شوکت کے ساتھ مقیم تھے۔ انہی میں حکیم خاندان بھی تھا جس کے سربراہ حکیم شجاع الدین تھے۔ طب، فلسفہ اور ادب سے خاص دلچسپی تھی۔ خود بھی مرثیہ اور غزل میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں انہیں خیال آیا کہ حالیؔ اور آزادؔ کی انجمن پنجاب جب سے ختم ہوئی ہے لاہور میں اعلیٰ پیمانے کے مشاعروں میں کمی آ گئی ہے۔ انجمن حمایت اسلام کا جلسہ یہ کمی پوری کرتا تھا مگر سال میں ایک دفعہ ہوتا تھا چنانچہ اُن کے کہنے پر اُن کے خاندان کے افراد نے ایک انجمن اتحاد کی بنیاد ڈالی۔ حکیم امین الدین جو خاندانی پیشہ ترک کر کے بیرسٹر ہو گئے تھے زیادہ امیر سمجھے جاتے تھے اور اُن کی حویلی بھی عالی شان تھی۔ وہ بزم اتحاد کے سیکرٹری بنے اور اُنہی کے مکان پر ۳۰ نومبر کو شام چھ بجے پہلا مشاعرہ ہوا۔

حکیم شجاع میر محفل تھے۔ اُردو زبان کے متعدد ہندو اور مسلمان شعرا کے علاوہ کوئی تین سو شائقین غزلیں سننے کے شوق میں کھنچے چلے آئے تھے۔ ممکن ہے ان میں اقبال بھی رہے ہوں مگر شعر سنانے والوں کی فہرست میں اُن کا نام شامل نہیں تھا۔[۸]

۸

دہلی اور لکھنو کا جھگڑا جو ہر جگہ اُردو زبان کے ساتھ پہنچ جاتا تھا لاہور میں بھی آ گیا تھا۔

مرزا ارشد گورگانی بہادر شاہ ظفر کی لڑکی کے نواسے ہونے کی وجہ سے دہلی کی عزت وسطوت کے علمبردار تھے۔ کسی پر طنز کرتے تو اُسے محفل کے لیے عبرت کا نمونہ بنا دیتے۔ جس کی تعریف کرتے سب کی نگاہوں میں چڑھ جاتا۔

دوسری طرف میر ناظم لکھنوی بارہہ کے شیعہ اور میر انیسؔ کے لڑکے کے شاگرد تھے۔ زبردست شاعر تھے مگر اتفاق کی بات کہ مرزا ارشد کے سامنے ان کا چراغ نہ جل سکا۔ عمر میں اُن سے تیرہ برس چھوٹے تھے مگر شاگردوں کو ساتھ لے کر مرزا ارشد کے خلاف محاذ بنالیا۔ اُدھر تیموری لہو جوش میں آیا اور پھر لاہور کے زندہ دلوں کو بیٹھے بٹھائے انیس و دبیر کے معرکوں کی پیروڈی دیکھنے کو مل گئی۔

۹

ممکن ہے کسی مشاعرے سے واپس آتے ہوئے اقبال سے بھی دوستوں نے پوچھا ہو کہ اُن کی ہمدردی اہلِ لکھنو کے ساتھ ہے یا اہلِ دہلی کے ساتھ؟ مگر اقبال نے اپنی شخصیت میں کوئی ایسا خانہ بنایا ہی نہیں تھا جو آسانی سے کھل سکے۔ اُن کے کلام میں جہاں غالبؔ کا اثر تھا وہاں آتشؔ لکھنوی کا رنگ تھا۔ داغؔ دہلوی نے اصلاح دی تھی تو لکھنؤ کے امیر مینائی غیبی مرشد تھے۔

۱۰

امیر مینائی نے اسلامی تصوف کے گناہ اور مغفرت کے تصورات کو جس طرح نظم کیا تھا اُس پر وہ اقبال کے محبوب شاعر نہ بنتے تو تعجب کی بات ہوتی۔ ممکن ہے اقبال نے اُن کا موازنہ ملٹن سے بھی کیا ہو۔

۱۱

لیا مغفرت نے تڑپ کر بغل میں
کرامت تھی شرمِ گنہگار کیا تھی

امیر مینائی

۱۲

شرمِ عصیاں سے جو گرا آنسو
اُس کی رحمت کو اِک بہانہ ہوا

امیر مینائی

۱۳

بزمِ اتحاد کے اگلے مشاعرے کے مصرع طرح کا اعلان ہوا۔ اقبال نے طبع آزمائی کی۔ امیر مینائی کا اثر بھی تھا لیکن مقطع کچھ اس طرح لکھا کہ مرزا ارشد اور میر ناظم انہیں دہلی اور لکھنو کی توپوں کے درمیان رکھنے کی کوشش کریں تو یہ صاف بچ کر نکل جائیں۔

۱۴

یہ مشاعرہ جو اقبال کی زندگی کا پہلا مشہور مشاعرہ ثابت ہوا دسمبر ۱۸۹۵ء میں منعقد ہوا۔[10]

امیر مینائی واپس جا چکے تھے مگر انجمن اتحاد میر اور میرزا سمیت موجود تھی۔ اس دفعہ کسی بات پر مرزا ارشد اور میر ناظم کی پارٹیوں میں تکرار زیادہ بڑھ گئی اور قریب تھا کہ معاملہ ہاتھا پائی پر پہنچتا جب اقبال اچانک اٹھ کر اُس کرسی پر بیٹھ گئے جس پر بیٹھ کر شعر سنائے جاتے تھے اور کہا:

تم آزماؤ ''ہاں'' کو زباں سے نکال کے
یہ صدقے ہو گی میرے سوالِ وصال کے

شعر برمحل تھا۔ لوگ بیساختہ اُن کی طرف متوجہ ہوئے اور کسی طرف سے آواز آئی کہ پہلے حضرت کی تعریف تو فرمائیے۔ دبیرِ مجلس اِن سے ناواقف تھا لہٰذا یہ خود ہی بولے، ''لیجیے میں خود عرض کیے دیتا ہوں کہ میں کون ہوں۔ خاکسار کو محمد اقبال کہتے ہیں اور یہی

میرا تخلص ہے۔ سیالکوٹ کا رہنے والا ہوں اور یہاں کے سرکاری کالج میں بی اے کی جماعت میں پڑھتا ہوں۔ حضرت داغ سے تلمذ کا فخر حاصل ہے۔ یہاں کے کسی بزرگ سے نہ خصوصیت ہے نہ خصومت۔ چند شعر لکھ کر لایا ہوں اگر اجازت ہو تو پڑھ کر سناؤں۔''

جب وہ اُس شعر پر پہونچے جو خاص امیر مینائی سے ماخوذ تھا تو مرزا ارشد بے اختیار واہ واہ کہہ اٹھے۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے مِرے عرقِ انفعال کے

''اقبال! اس عمر میں اور یہ شعر!'' مرزا ارشد کی زبان سے نکلا جس پر ممکن ہے کہ میر ناظم نے منہ بنا کر اپنے شاگردوں سے کہا ہو کہ شاعر کو ''قطرے'' کا تلفظ بھی ٹھیک سے نہیں آتا مگر آخر میں اقبال کا مقطع کام آیا:

اقبالؔ! لکھنؤ سے نہ دِلّی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خَمِ زلفِ کمال کے

معلوم نہیں اُس روز مرزا ارشد اور میر ناظم کا جھگڑا نمٹا کہ نہیں مگر یہ بزرگ شعر کی تاثیر کے سامنے پتھر نہ ہو سکتے تھے۔ بھڑکتے شعلوں پر اس غزل کی شبنم افشانی سے کچھ فرق ضرور پڑا ہوگا۔"

تم آزماؤ ''ہاں'' کو زباں سے نکال کے
یہ صدقے ہو گی میرے سوالِ وصال کے
جادو عجب نگاہِ خریدارِ دل میں تھا
بِکتا ہے ساتھ بیچنے والا بھی مال کے
حسرت نہیں، کسی کی تمنا نہیں ہوں میں

مجھ کو نکالے گا ذرا دیکھ بھال کے
کہتا ہے خضر دشتِ جنوں میں مجھے کہ چل
آتا ہوں میں بھی پاؤں کے کانٹے نکال کے

دستیاب غزل میں سولہ اشعار ہیں۔

۱۵

اِس ایک مشاعرے نے اقبال کو بہت سے قدردان فراہم کر دیے۔

حکیم شجاع اور حکیم امین الدین پرانے شہر کے رئیس۔ منشی محبوب علی جو کئی سال پہلے گوجرانوالہ سے بستر کندھے پر اُٹھا کر پیدل لاہور آئے تھے اور اب حکیم شجاع کی عنایت اور اپنی محنت سے پنجاب کے سب سے مشہور اخبار پیسہ کے مالک تھے۔ ان کے علاوہ پیسہ اخبار کے مینجر منشی عبدالعزیز بھی مگر سب سے دلچسپ شخصیت وہ نوجوان تھا جس کا نام اقبال کے عربی کے اُستاد سے ملتا جلتا تھا اور عادتیں عمرو عیار سے۔

محمد الدین فوقؔ اقبال سے ایک سال پہلے اُنہی کے ضلع میں کہیں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والدین بھی کشمیری تھے۔ خاندانی مشکلات اور اپنی طبیعت کی وجہ سے یہ مڈل سے آگے پڑھ نہ سکے۔ کچھ عرصہ پہلے لاہور آئے اور منشی محبوب عالم کے اخبار میں نو روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ منشی صاحب کا طریقہ تھا کہ ملازموں کو ہر ہفتہ ایک دو روپیہ جیب خرچ کے طور پر دے دیتے تھے اور بعد میں تنخواہ میں سے کاٹ لیتے تھے۔ ایک دفعہ اکاؤنٹنٹ نے فہرست بنائی تو فوقؔ نے پانچ روپے اپنے نام کے سامنے لکھوا لیے۔ جب یہ فہرست مینجر عبدالعزیز صاحب کے سامنے آئی تو وہ اچھل پڑے اور فوق کو بلوا بھیجا۔ انہوں نے کہا، ''حضور! میں تو آٹھ آنے قبول کرنے کو تیار ہوں لیکن خواہش صرف یہ ہے کہ زندگی میں ایک مرتبہ پانچ روپے اکٹھے دیکھ لوں!'' عبدلعزیز ہنس پڑے اور وہ روپے دے دیے۔ اقبال اور فوقؔ کی دوستی لطیفوں اور بے تکلف صحبتوں کے طویل

سلسلے کی ابتدا تھی۔[۱۲]

۱۶

فروری ۱۸۹۶ء میں لاہور کے کشمیری بزرگوں اور نوجوانوں نے مل کر انجمن کشمیری مسلمانانِ ہند کی بنیاد رکھی جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ فضول رسوم و رواج کی حوصلہ شکنی کی جائے اور فوج میں ملازمت حاصل کرنے میں کشمیری مسلمانوں کی مدد کی جائے۔ کشمیری بزرگوں کے ساتھ ساتھ کالج کے طلبہ نے بھی اس سلسلے میں جوش و خروش کا مظاہرہ کیا ہوگا اور انہی میں سے بعضوں نے انجمن کے رہنماؤں سے اُس نوجوان کا تعارف کروایا جو شعر کہتا تھا مگر مجمع میں سناتے ہوئے اُسے شرم آتی تھی۔ بہر حال اقبال سے فرمائش کی گئی اور وہ انجمن کے پہلے اجلاس میں ۱۲ اشعار کی نظم 'فلاحِ قوم' لے کر آئے:

دعا یہ تجھ سے ہے یارب کہ تا قیامت ہو
ہماری قوم کا ہر فرد قوم پر مفتوں
دکھائیں فہم و ذکا و ہُنر یہ اوروں کو
زمانے بھر کے یہ حاصل کریں عُلوم و فُنوں[۱۳]

۱۷

اُسی مہینے انجمن حمایتِ اسلام کا گیارہواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ یہ انجمن ۱۸۸۴ء میں اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ عیسائی مشنریوں کا اثر کم کیا جائے اور مسلمان بچوں کے لیے تعلیمی اور رفاہی ادارے قائم کیے جائیں۔ ہر سال انجمن کے قائم کردہ اسلامیہ کالج کے صحن میں دریاں اور اسٹیج بچھا کر جلسہ منعقد کیا جاتا تھا اور اب اس جلسے کو پنجاب اور پنجاب سے باہر کے لوگوں میں ایک میلے کی سی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ شعرا، علماء اور مقررین اسٹیج پر آ کر اپنے جوہر دکھاتے تھے اور حاضرین جن میں ہر قماش کے آدمی

ہوتے تھے انجمن کے رفاہی کاموں کے لیے چندہ دیتے تھے۔ اس عوامی میلے کی سب سے ہردلعزیز شخصیت اکبری اور اصغری والے ڈپٹی نذیر احمد تھے۔ قدرے بھاری ڈیل ڈول کے آدمی اور آواز میں بادلوں جیسی کڑک مگر طبعیت میں ایسی شگفتگی جو چھپائے نہ چھپتی تھی۔ نوجوانوں سے یہ اور نوجوان ان سے جلد بے تکلف ہو جاتے تھے۔

اقبال نے ضرور ۱۸۹۶ء کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی ہوگی۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ساتھ ان کی ملاقات کا حال تو معلوم نہیں مگر تصور کی آنکھ سے اُنیس سالہ اقبال کو ڈپٹی نذیر احمد کے قریب کھڑے دیکھنا بہت آسان ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد مولویوں کا مذاق اس طرح اُڑاتے تھے جیسے مذہبی فریضہ ہو۔ اتفاق سے چند برس پہلے کے کسی جلسے میں اُنہوں نے مولویوں کے ساتھ ساتھ صوفیوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ان لیکچروں کا چرچا اُس وقت تک خاصا عام تھا چنانچہ ذرا سا امکان اس بات کا بھی ہے کہ اقبال شروع شروع میں اُن سے کچھ کھنچے رہے ہوں مگر بہر حال چند سال بعد اقبال ڈپٹی صاحب کے حلقہ بگوشوں میں دکھائی دینے لگے۔[۱۴]

۱۸

مارچ میں کالج کا تعلیمی سال ختم ہوا۔

اقبال چھٹیوں میں ضرور سیالکوٹ گئے ہوں گے کیونکہ بعد کی روایات سے ان کا یہی معمول سامنے آتا ہے۔ امام بی عام طور پر ''میرا بالی آ گیا!'' کہہ کر اُنہیں گلے لگاتی تھیں اور اُن کا استقبال کیا جاتا تھا۔ سیالکوٹ میں بھٹیارن کے تنور والا مقدمہ ابھی تک چل رہا تھا۔[۱۵]

۱۹

اُن کے بچپن کے دوستوں میں سے کتنے ہی ایسے تھے جو تعلیم چھوڑ کر کام دھندے سے لگ چکے تھے۔

لالو کے بھائی کی دودھ دہی کی دکان تھی مگر وہ خود پہلوانی کرتا تھا اور اقبال کو بھی لنگر لنگوٹ بندھوا کر اکھاڑے میں لے آتا تھا۔[۱۶] کتنے ہی کھیل کا سامان بنا کر یا کسی اور ہنر سے راتوں رات امیر ہو گئے تھے۔ سیالکوٹ ترقی کر رہا تھا اور اقبال نے بھی سوچا ہو گا کہ بہت سا علم حاصل کریں گے تو محنت اُنہیں اُونچے مقام پر بٹھا دے گی۔

۲۰

۱۸۹۶ء کے کسی مہینے میں کریم بی نے ایک لڑکی کو جنم دیا جس کا نام معراج بیگم رکھا گیا۔[۱۷] یہ نام بھی اقبال اور اُن کے گھر والوں کے صوفیانہ رجحانات کی عکاسی کرتا تھا۔ ممکن ہے کہ اس موقعہ پر اقبال گجرات بھی گئے ہوں۔

۲۱

انجمن کشمیری مسلمانان کے ایک اجلاس میں چونڈہ (سیالکوٹ) کے کسی صاحب کی طرف سے ایک تحصیلدار کی شکایت پیش ہوئی جس نے اپنے کسی فیصلے میں کشمیری مسلمانوں کو ''فسادی اور بہادر'' لکھا تھا۔ اقبال نے اس تجویز کی مخالفت کی کہ انجمن کو فیصلے میں سے لفظ فسادی خارج کروانے کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ ''جو قوم فساد کرنا نہیں جانتی وہ بہادر نہیں ہو سکتی۔ میرا مطلب فساد سے بہادری کی اسپرٹ ہے۔ اگر آپ بہادر اور شجاع نہیں کہلانا چاہتے تو بیشک اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کریں۔'' ان کی تجویز مان لی گئی۔[۱۸]

۲۲

علی گڑھ میں شبلی کے دوست ٹامس آرنلڈ نے اُس برس پریچنگ آف اسلام (*Preaching of Islam*) کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی جس میں اپنے ہم نسل متشرقین کے اس خیال کی تردید کی تھی کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا۔ سر سید احمد

خان نے اپنے دوست اور تہذیب الاخلاق کے مشہور مضمون نگار منشی ذکاءاللہ کے لڑکے عنایت اللہ دہلوی سے دعوتِ اسلام کے نام سے اس کتاب کا ترجمہ کروایا۔ ممکن ہے یہ ترجمہ میر حسن اور اُن کے شاگردوں کی نظر سے گزرا ہو۔

۲۳

نیرنگ کے لیے یہ خبر اہم تھی کہ اقبال ہاسٹل میں رہنے آرہے ہیں۔ چھٹیوں سے تازہ دم ہو کر اقبال واپس لوٹے تو ہاسٹل میں سینئر طلبہ کے کمروں کی قطار میں ایک کمرہ اُنہیں بھی مل گیا۔ یہ اکیلے رہنے کا زندگی میں پہلا اتفاق تھا۔ وہ کہیں سے ایک حقہ اور بہت سی کتابیں اُٹھا کر لے آئے اور پھر تو اُنہیں تنہائی کا چسکا لگ گیا۔ ایک روز جب تمام لڑکے میدان میں کھیل رہے تھے تو ڈانجر صاحب نے ہاسٹل کے معائنے کے دوران اقبال کو کمرے میں بنیان اور تہمد باندھے مطالعے میں مصروف پایا۔ ڈانجر صاحب نے کھیل کود اور ورزش کے فوائد کی طرف اشارہ کیا تو اقبال نے کہا، "سر! یہ بھی تو ایک طرح کی ورزش ہے!"[۱۹]

ہاسٹل میں اُن کی حاضر جوابی اور دلچسپ گفتگو اُن کی شاعری سے زیادہ مقبول تھی۔ چنانچہ اکثر اُن کے دوست اُن کے کمرے میں جمع ہو جاتے اور اقبال کتاب چھوڑ کر اُن کی گپ شپ میں شریک ہو جاتے۔ دراصل یہاں اُن کا وہی ذوق جاگ اُٹھتا تھا جو بچپن میں خاندان کی عورتوں میں بیٹھ کر رات گئے تک محلے کی پڑوسنوں پر پھبتیاں کستے ہوئے پروان چڑھا تھا۔ اقبال کو صحیح معنوں میں گپ بازی کی لت تھی۔ لالہ سرداری لال جن کے ذمے بورڈنگ ہاؤس کے نظم وضبط کا خیال رکھنا تھا عموماً ان مشاغل میں دخل نہیں دیتے تھے۔

اقبال کی طبیعت کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ اگر کوئی پھبتی یا کوئی مذاق ذہن میں آجاتا تو پھر وہ اُس کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے، چاہے اس میں جان ہی کیوں نہ جاتی ہو۔ بعض اوقات اُن کے مذاق دوسروں کے لیے تکلیف دہ بھی ہو جاتے تھے مگر وہ اپنے

اُفتادِ طبع کے ہاتھوں مجبور تھے۔ بالخصوص شہاب الدین عرف شہابا اُن کے جملوں کا نشانہ بنتے تھے۔ وہ کہتے، ''بھئی تم مجھے نہ روکو۔ تمہیں دیکھ کر مجھ پر لطیفوں کی آمد ہوتی ہے۔'' ایک روز شہاب الدین غسلخانے میں نہا رہے تھے کہ اقبال کہیں سے سیاہی کی دوات لے آئے اور اُس نالی میں اُلٹ دی جس میں سے پانی باہر آ رہا تھا۔ پھر شور مچایا، ''دیکھو! دیکھو! شہابے کا رنگ چھوٹ رہا ہے!''[۲۰]

اقبال کے کمرے میں جو محفلیں جمتی تھیں وہ آہستہ آہستہ ''بزمِ سخن'' میں تبدیل ہو گئیں یعنی مختلف زبانوں میں تک بندی اور مزاحیہ شاعری جس کا مقصد اِس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ قہقہوں کا طوفان رکنے نہ پائے۔ البتہ کبھی کبھی اقبال کی شخصیت کا سنجیدہ پہلو بھی سامنے آتا تھا۔ انہی محفلوں میں وہ اپنی پرسوز غزلیں بھی انتہائی دل کش ترنم میں سنا جاتے تھے۔

نیرنگ نے ایک عرصہ بعد لکھا، ''اُس ابتدائی زمانہ میں کسی کو بھی اقبال میں ایک اچھے شاعر مگر عام معیار کے شاعر کے سوا کچھ نظر نہ آیا... دیکھنے والوں کی کوتاہ نظری نہ تھی بلکہ اس وقت وہ چیز موجود نہ تھی جو بعد میں بن گئی۔''[۲۱]

۲۴

اورینٹل کالج کی ایک ہر دلعزیز شخصیت عربی کے مدرس مولانا ابوسعید محمد شعیب تھے۔ اُنہوں نے علمِ عروض پر ایک رسالہ مختصر العروض لکھا اور اقبال نے اُس کا مادۂ تاریخ نکالا، ''جزاک اللہ لکھا ہے رسالہ مختصر کیسا'' مگر ابجد کے حساب سے مصرعے کے حروف جمع کر کے میزان ۱۸۸۵ بنتا تھا جبکہ سال ۱۸۹۶ء چل رہا تھا۔ باقی گیارہ عدد پورے کرنے کے لیے اقبال نے ایک دلچسپ طریقہ اختیار کیا۔ اُنہوں نے نو اشعار میں کتاب کی تعریف کرنے کے بعد دو اشعار لکھے:

دکھا کر یہ کتابِ بے بہا دل چھین لیتا ہوں
فصاحت کا، بلاغت کا، لیاقت کا، ذہانت کا
''ادب'' کے ساتھ بالطبع پھر یوں عرض کرتا ہوں
''جزاک اللہ لکھا ہے رسالہ مختصر کیسا''

فصاحت، بلاغت، لیاقت اور ذہانت کے دِلوں سے مراد ان چاروں الفاظ کے ''الف'' تھے کیونکہ یہ حرف ان میں سے ہر لفظ کے عین درمیان میں آتا تھا گویا اس کا دل تھا:

ف ص ا ح ت
ب ل ا غ ت
ل ی ا ق ت
ذ ہ ا ن ت

چاروں الف جمع کرنے سے چار عدد بنتے تھے کیونکہ ابجد میں الف کا شمار ایک ہوتا ہے۔ اگلے مصرعے میں ''ادب'' کے ساتھ عرض کرنے سے مراد یہ تھی کہ اُس لفظ کے اعداد بھی شمار کیے جائیں جو سات بنتے تھے یعنی ا=۱، د=۴، ب=۲۔ یوں چار الف اور ''ادب'' کے اعداد گیارہ ہوئے جنہیں مادۂ تاریخ مصرعے کے اعداد میں جمع کرنے سے سالِ اشاعت نکل آتا تھا۔

لطف کی بات یہ تھی کہ پورا قطعہ گیارہ اشعار پر مشتمل تھا یعنی جتنے اعداد کم تھے اور تلاش کرنے تھے اُن کی نشاندہی اشعار کی کل تعداد سے بھی ہو رہی تھی۔ اِس قسم کے معمے اچھے تاریخ گو شعرا کی خصوصیت سمجھے جاتے تھے۔ اقبال کے دستیاب قطعاتِ تاریخ میں سے اِس پہلے والے ہی میں یہ ایسی پختہ مثال موجود ہے کہ یہ اُن کا خاص وصف معلوم ہوتا ہے۔ باذوق قارئین ایسے اِشارے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے چنانچہ نظم کے ساتھ اُس کا حل شائع کرنے کا رِواج نہ تھا جو شاعر کی عزتِ نفس اور قاری کے احترام

دونوں کے منافی ہوتا۔

مولوی شعیب نے قطعۂ تاریخ کو شامل کرتے ہوئے لکھا، ''شاعر باکمال، ناظمِ عالی خیال، جناب منشی محمد اقبال صاحب اقبالؔ، شاگرد جناب اُستاد داغ دہلوی، متعلم بی اے کلاس، گورنمنٹ کالج، لاہور۔''[۲۲]

۲۵

امیر مینائی کی لاہور آمد کی خبر نے سب کو چونکا دیا ہوگا۔ لکھنؤ کے بزرگ شاعر کو بعض سخن شناس داغؔ سے بھی اُونچا مقام دیتے تھے۔ جہاں داغؔ کی شاعری محبوب سے نظر بازی کر کے ختم ہو جاتی تھی وہاں امیرؔ کی شاعری ان تمام مضامین کو سمیٹتے ہوئے روحانیت کی اُن وادیوں کی طرف جا نکلتی تھی جہاں دل نرم ہو جاتے ہیں اور پلکیں بھیگ جاتی ہیں:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

امیرؔ مینائی اُس برس لاہور آئے اور انجمن اتحاد کے مشاعرے میں شریک ہوئے۔[۲۳] اس مشاعرے میں اقبال بھی گئے ہوں گے مگر امیرؔ مینائی سے اُن کی ملاقات کی کوئی سند موجود نہیں۔

۲۶

اگلے مشاعرے کے لیے یہ مصرع طرح تجویز ہوا:

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا

فوق نے ارادہ کیا کہ وہ بھی غزل لکھ کر لائیں گے۔

۲۷

اُنیسویں صدی کے آخر میں ایسے رسالوں کی بھرمار تھی جن میں تازہ غزلیں جمع کی گئی ہوتی تھیں۔ یہ عرفِ عام میں گلدستے کہلاتے تھے اور اُس دور کی ثقافت میں انہیں وہی مقبولیت حاصل تھی جو سو برس بعد آڈیو کیسٹوں کو حاصل ہوئی۔ انجمن اتحاد کے تحت جو مشاعرے ہوتے تھے اُن کی کاروائی بھی ایک گلدستے کی صورت میں شائع کی جاتی تھی جس کا نام شورِ محشر تھا۔

اگلے مشاعرے میں اقبال اور فوق نے جو غزلیں پڑھیں تھیں وہ شورِ محشر دسمبر میں شائع ہوئیں:

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اِس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سخنداں کا

اِس مقطع میں داغ کے دو شاگردوں سید شبیر حسین جعفری نسیم بھرتپوری اور حافظ محمد یوسف خاں تشنہ بلند شہری کی طرف اشارہ تھا۔[۲۴]

شورِ محشر کے مدیر احمد حسین خاں تھے۔ ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔[۲۵] گورنمنٹ کالج سے بی اے کیا تھا اور شاعری میں مرزا ارشد کے شاگرد تھے۔ کسی مشاعرے میں غزل پڑھتے ہوئے ایک شعر کا دوسرا مصرع تو اتنا مشہور ہوا کہ محاورہ بن گیا:

خواب و خیال ہو گئیں ساری حکایتیں
احمد حسین خان! زمانہ بدل گیا

۲۸

داغ کے ایک شاگرد مولوی محمد عبدلرؤف خان رافت تھے جو ۱۸۸۹ء میں بھوپال کی فرمانروا نواب سلطان جہاں بیگم کے پرائیوٹ سیکٹری بھی رہے تھے۔ وہ لاہور آئے تو اقبال نے انجمن اتحاد کے مشاعرے میں اُنہیں بھی خوش آمدید کہا:

ضد سے عمامے کو واعظ نے کیا غرقِ شراب
پر کہاں رندو! ہمارے دامنِ تر کا جواب

ارشد و رافت سے ہوں اقبال میں خواہانِ داد
آبداری میں ہیں یہ اشعار گوہر کا جواب

پوری غزل میں سترہ اشعار تھے۔[۲۱]

۲۹

اقبال کے دوست اُن سے اکثر کہتے تھے کہ اُن کی آواز اچھی ہے۔ جس طرح وہ ہاسٹل کے کمرے میں اپنی غزلیں گاتے ہیں اُسی طرح مشاعرے میں اُنہیں اپنا کلام ترنم سے سنانا چاہیے مگر اُس وقت تک صرف گانے والے اور گانے والیاں ہی غزلیں گایا کرتے تھے۔ ایک عرصہ تک اقبال کو بھری بزم میں نواسنج ہونے کی ہمت نہ پڑی مگر آہستہ آہستہ یہ حجاب دُور ہوا اور وہ مشاعروں میں اپنا کلام ترنم سے سنانے لگے۔

۳۰

خارِ صحرا نہ سہی، دَشت کے پتھر ہی سہی
میرا چھالا نہیں پھُوٹا تو مقدر ہی سہی

روزِ محشر کوئی مے خوار نشے میں بولا
مے احمر نہیں ملتی ہے تو کوثر ہی سہی

مجھے صیّاد تہِ دام پھڑک جانے دے
مَیں نہ گلشن میں رہوں گا تو مرے پَر ہی سہی

کس کو یاد آؤں گا مَیں حشر کے ہنگامے میں
میرا دفتر ہے گناہوں کا تو دفتر ہی سہی

شعر اقبالؔ کو آتا نہیں کہنا لیکن
تم جو کہتے ہو سخنور تو سخنور ہی سہی

دستیاب غزل میں دس اشعار ہیں۔ یہ انجمن اتحاد کے مشاعرے میں پڑھی گئی۔ اِس کے مقطع کی بدولت ان کے مداحوں میں ایک انتہائی اہم اضافہ ہوا۔ شیخ عبدالقادر اُس زمانے کے مشہور انگریزی اخبار آبزرور کے نائب مدیر تھے۔ خود شعر نہیں کہتے تھے مگر انگریزی اور اُردو ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔

البتہ یہ بات برائے بیت نہ تھی، ''تم جو کہتے ہو سخنور تو سخنور ہی سہی'' بلکہ کبھی کبھی اقبال سچ مچ محسوس کرتے تھے کہ شاعری اُن کا اصل میدان نہیں۔ ذریعۂ عزت تو غالبؔ نے بھی نہ سمجھا تھا۔[۴۷]

۳۱

۱۸۹۶ء کے آخر میں حکیم شجاع انتقال کر گئے۔

انجمن مشاعرہ کو سنبھالنے کی ذمہ داری حکیم امین الدین نے قبول کر لی اور مشاعروں کا سلسلہ جاری رہا۔

زندگی موت سے ہم دوش ہوئی جاتی ہے
میری میّت اُٹھی اور اُن کی سواری آئی

چھ اشعار کی یہ غزل معلوم نہیں کب اقبال نے لکھی تھی مگر اُن کی بیاض میں یہ ہمیشہ ادھوری رہی:

تیر کو ڈھونڈتے ہاتھوں میں کٹاری آئی

''لاڈلی رندوں کی، ساقی کی دُلاری آئی'' پر اُن سے گرہ نہ لگائی گئی اور پھر اُنہوں نے اسے مزید توجہ کے قابل نہ سمجھا۔[۴۸]

اقبال نے بازارِ حسن کب جانا شروع کیا اس کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ اُس زمانے میں جبکہ گراموفون کا رواج نہیں ہوا تھا موسیقی سے لطف اندوز ہونے کا یہی مقبول ذریعہ تھا۔ اقبال کی شادی پر خود اُن کے بزرگ پیراں دتی کو بارات کے ساتھ لے گئے تھے۔ لاہور کا بازارِ حسن تو ہندوستان بھر میں کلکتہ کے بعد دوسرے نمبر پر شمار کیا جاتا تھا۔ یہاں کی طوائفیں فارسی اور اُردو اساتذہ کے کلام سے واقف ہوتی تھیں اور غزلوں کے علاوہ پکے راگ، ٹھمری اور دادرے میں مہارت رکھتی تھیں۔ سامعین کا ذوق بھی اُونچا تھا چنانچہ تھیٹر کمپنیوں کو لاہور میں ابھی تک زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی اور عام طور پر ناٹک کے نغموں کو عامیانہ خیال کیا جاتا تھا۔ ان حالات میں سمجھا جا سکتا ہے کہ طالبعلمی کے زمانے میں ہی اقبال اپنے ذوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کوچے کی سیاحت پر نکل آئے ہوں گے۔

اُن کے زمانہ طالب علمی سے منسوب ایک کہانی سنسنی خیز ہونے کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ یہ بات یوں بیان کی جاتی ہے کہ رقابت اور طیش کے جذبات سے بے قابو ہو کر اقبال نے ایک طوائف کو قتل کر دیا اور پھر ہاسٹل میں آ کر چھپ گئے مگر اُس رات ہاسٹل کے انگریز انچارج نے راؤنڈ لیے بغیر سب لڑکوں کی حاضری لگا دی تھی چنانچہ جب معاملہ عدالت میں پیش ہوا تو انگریز کی گواہی معتبر سمجھی گئی اور اقبال بری ہو گئے۔

علاوہ اس بات کے کہ ہاسٹل کا انچارج کوئی انگریز نہیں بلکہ لالہ سرداری لعل تھے، اِس روایت میں اور بھی بہت سے سقم ہیں جن کی وجہ سے اسے قبول نہیں کیا جا سکتا، مثلاً یہ کہ اقبال اتنے مالدار تھے ہی نہیں کہ وہ کسی طوائف سے اس قسم کے روابط قائم کر سکیں جن میں رقابت کی انتہائی منزلوں تک بات پہنچتی ہے:[۲۹]

لوگ کہتے ہیں مجھے راگ کو چھوڑو اقبالؔ
راگ ہے دین مرا، راگ ہے ایماں میرا

۴۳

جب آہ کا مزا ہے کہ پیدا دھواں نہ ہو

غالباً یہ کسی مشاعرے کا مصرعِ طرح تھا جس پر اقبال سے گرہ نہ لگائی گئی مگر بارہ اشعار کی غزل ضرور ہو گئی:

اقبال کہہ رہے ہیں یہ میری غزل کے شعر
بے سُود ہے کلام اگر قدرداں نہ ہو[30]

اقبال کے ابتدائی زمانے سے جو ایسی نظمیں منسوب کی جاتی ہیں جن کا اُن کی تصانیف ہونا مشکوک ہے اُن میں سے تین 'عیشِ جوانی'، 'گلِ خزاں دیدہ' اور 'شمعِ زندگانی' ہیں۔

'عیشِ جوانی'، جنس زدہ نظم ہے، 'گلِ خزاں دیدہ' میں دنیا کے وجود کو خوابِ پریشاں کہا گیا ہے اور 'شمعِ زندگانی' میں شاعر خاصی بیچارگی کے ساتھ موت سے کچھ دن کی مہلت طلب کر رہا ہے لیکن مہلت نہ ملنے کی صورت میں مرنے پر بھی پوری طرح آمادہ ہے۔ ان تینوں نظموں میں ایسی کوئی بات نہیں جس کی وجہ سے انہیں اقبال سے منسوب کیا جا سکے اور جن مجموعوں میں پہلی بار انہیں اقبال کے نام سے شائع کیا گیا اُنہوں نے بھی کوئی حوالہ نہیں دیا کہ اُنہیں کہاں سے دستیاب ہوئیں۔ کسی سند کے بغیر نظموں کو کسی شاعر سے کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے بالخصوص جبکہ وہ اندازِ بیان اور خیالات میں اُس کے فنی ارتقا کے کسی بھی مرحلے سے مطابقت نہ رکھتی ہوں۔[31]

۴۴

جب خدا نے شیطان کو جنت سے نکال کر جہنم کے شعلوں کے سپرد کیا تو اُس کا حوصلہ کم ہونے کی بجائے اور زیادہ ہو گیا۔

The mind is its own place, and in itself

Can make a Heav'n of Hell, a Hell of Heav'n.

What matter where, if I be still the same,

And what I should be, all but less than Hee whom

Thunder hath made greater?

Here at least we shalll be free; th'Almighty hath not limit

Here for his envy, will not drive us hence:

Here we may reign secure, and in my choyce

To reign is worth ambition though in Hell:

Better to reign in Hell, than serve in Heav'n

Paradise Lost Book I

۳۵

''(ہاسٹل کی) صحبتوں میں اقبال اپنی ایک اسکیم بار بار پیش کیا کرتے تھے،'' نیرنگ کا بیان ہے۔ ''ملٹن کی مشہور نظم پیراڈائز لوسٹ اور پیراڈائز ری گینڈ کا ذکر کر کے کہا کرتے تھے کہ واقعاتِ کربلا کو ایسے رنگ میں نظم کروں گا کہ ملٹن کی *Paradidse Regained* کا جواب ہو جائے...''[۳۴]

۳۶

میں تو کچھ اور ہو گیا جب سے

تیری محفل میں باریابی ہے

حُسن مرتا ہے پردہ داری پر

عشق کو شوقِ بے حجابی ہے

موت کے بعد دیکھیے کیا ہو
زندگی میں تو سَو خرابی ہے
آدمی کام کا نہیں رہتا
عِشق مِیں یہ بڑی خرابی ہے
پوچھتے کیا ہو مذہبِ اقبالؔ
یہ گُنہ گار بُوتُرابی ہے

دستیاب غزل میں سات اشعار ہیں۔[۴۳]

۳۷

یہ جوانی کے ولولے اے دل
دو گھڑی کے اُبال ہوتے ہیں
زور تم اپنی کم سِنی پہ نہ دو
سب حَسیں خوردسال ہوتے ہیں
ہائے وہ مار ڈھیلے ہاتھوں کی
کِس مزے کے ملال ہوتے ہیں
ذِکر کچھ آپ کا بھی ہے اُن میں
قبر میں جو سوال ہوتے ہیں

دستیاب غزل میں چھ اشعار ہیں اور مطلع نہیں ہے۔[۴۴]

۳۸

دسمبر ۱۸۹۶ء میں لاہور میں ایک کانفرنس کا انعقاد ہوا جس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف مذاہب کے نمائندوں کو اظہارِ خیال کا موقع فراہم کیا جائے۔ اِسلام کی نمائندگی کے

لیے جن صاحب کو بلایا گیا وہ مرزا غلام احمد قادیانی تھے۔

قرین قیاس ہے کہ اقبال اس کانفرنس میں شامل ہوئے ہوں کیونکہ مذاہب عالم سے اُن کی دلچسپی ظاہر تھی۔ پھر عیسائیت کے مقابلے پر اسلام کی برتری ثابت کرنا اُن کے بچپن کا شوق ٹھہرا۔

مرزا صاحب نے اپنا مقالہ شروع کرنے سے پہلے اشتہار چھپوایا کہ اُنہیں خدا کی طرف سے اس کی مقبولیت کی بشارت ہوئی ہے۔ مقالہ اُن کی طرف سے مولوی عبدالکریم سیالکوٹی نے ۲۸ دسمبر کو پڑھنا شروع کیا اور جب وہ مقررہ وقت پر ختم نہ کر سکے تو حاضرین کے اصرار پر کانفرنس کا دورانیہ دو روز بڑھا دیا گیا۔ مرزا صاحب کے عقیدتمندوں کے نزدیک یہ خدا کے وعدے کی تعبیر تھی۔

۳۹

ابلیس!

اقبال کی دلچسپی کے موضوعات میں اس کا اضافہ بھی طالب علمی کے زمانے میں ہوا۔

آئی سکائی لوس قدیم یونانی ڈرامہ نگار تھا۔ اُس کا ڈرامہ پرومیتھیوس باؤنڈ اقبال کی نظر سے گزرا تھا جس میں زیوس دیوتا سے بغاوت کر کے انسان کو آگ فراہم کرنے والے کردار کا المیہ تھا۔

ملٹن کی پیراڈائز لوسٹ جو اقبال کے مطالعے میں رہتی تھی اگرچہ بائبل کی روشنی میں لکھی گئی تھی مگر ملٹن اپنی شاعرانہ فطرت سے مجبور ہو کر شیطان کے کردار میں بڑے جاندار رنگ بھر گیا تھا۔

گوئٹے کا ڈرامہ فاؤسٹ ایک ایسے انسان کا المیہ تھا جو علم کی ہوس میں اپنی روح شیطان کے ہاتھ بیچ دیتا ہے مگر اپنی فطرت میں چھپی ہوئی انسانی خوبیوں کو ختم کرنے میں ناکام رہتا ہے۔

اسلامی تصوف میں سے ابن عربی کی حکایت بھی اقبال کے ذہن میں بیٹھی تھی کہ

ابلیس نے خدا سے کہا کہ میں آپ کے حکم سے سرتابی نہ کرتا لیکن میرا سجدہ کرنا آپ کی مشیت میں داخل ہی نہ تھا تو خدا نے پوچھا کہ یہ حقیقت انکار سے پہلے معلوم ہوئی یا بعد میں۔ اُس نے کہا، بعد میں معلوم ہوئی! ابن عربی کہتے تھے کہ ابلیس کا استدلال غلط تھا کیونکہ جو چیز اُس کی آزادی تھی وہ اُسے اپنی مجبوری کا نام دے رہا تھا۔

سب سے عجیب بات عطار نے کہی تھی، ''ابلیس خدا کے دروازے کا کتا ہے۔ اُس کے دوستوں کو گزرنے دیتا ہے مگر دشمنوں کو روک لیتا ہے۔''

۴۰

کسی سوداگر کے پاس بولنے والا طوطا تھا جسے ہندوستان سے پکڑا گیا تھا۔ سوداگر کسی سفر پر ہندوستان جانے لگا تو طوطے نے فرمائش کی کہ وہ اُس کے وطن میں جب آزاد پرندوں کو دیکھے تو اُس کی طرف سے یہ پیغام پہنچا دے کہ اُن کا ایک ساتھی قید میں پڑا ہے۔ سوداگر نے ایسا ہی کیا مگر یہ پیغام سنتے ہی جنگل کے آزاد طوطوں میں سے ایک صدمے سے مر گیا اور درخت کی شاخ سے زمین پر آ رہا۔ سوداگر کو بہت افسوس ہوا مگر جب اُس نے واپس آ کر اپنے طوطے کو یہ روئیداد سنائی تو اُس کا طوطا بھی یہ سنتے ہی غم سے مر گیا۔ سوداگر کا افسوس بڑھ گیا مگر بہر حال مردہ طوطے کو پنجرے سے نکالا۔ وہ فوراً ایک شاخ پر جا بیٹھا اور سوداگر سے کہا کہ ہم وطن طوطے نے دراصل یہی پیغام بھیجا تھا کہ بولنے کی وجہ سے قید میں آئے ہو، خاموشی اختیار کر کے آزاد ہو جاؤ۔

مولانا روم نے مثنوی کے پہلے دفتر میں یہ کہانی بیان کر کے کہا تھا کہ پرندے سے مراد روح ہے، پنجرہ یہ جسم ہے اور قید کرنے والے سوداگر وہ تمام چیزیں ہیں جو انسان کی مادی خواہشات کو روح پر غالب آنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ رُوح کا اصل وطن تو جنت ہے جس کی دُوری میں یہ بانسری کی طرح فریاد کر رہی ہے، بانسری سے سنو وہ کیسے شکایت کرتی ہے اور کس طرح اپنی جدائی کی حکایت بیان کرتی ہے کہ جب سے مجھے میرے کھیت سے کاٹا گیا ہے میری فریاد سے سب سننے والے رو رہے ہیں:

بشنو از نَے چوں شکایت می کند
وز جدائیہا حکایت می کند
کز نیستاں تا مُرا ببریدہ اَند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اَند

مولانا روم کی حکایت میں ہندوستان جنت کا استعارہ تھا جو رُوح کا اصل وطن تھا مگر اقبال سچ مچ کے ہندوستان میں آباد تھے اور تاریخ کے ایک ایسے موڑ پر پیدا ہوئے تھے جب وطن کے غیر دنیاوی تصور تک محدود رہنا مشکل تھا۔ پھر کیوں نہ ہوتا کہ وطن کے ساتھ ہی اُن کے ذہن میں تین تصورات ضرور آتے تھے یعنی چمن، جنت اور خدا کی تجلی۔

سب سے بنیادی سطح پر وطن ایک باغ کی طرح تھا اور ہم وطن اس کی زینت کے ذمہ دار تھے جس طرح پھول، درخت اور خوش آواز پرندے باغ کی زینت بڑھاتے ہیں۔ اِس لحاظ سے اقبال اپنے وطن کی بُلبل تھے۔ ہندوستان میں خاص طور پر کشمیر اُن کا وطن تھا جسے جنت نظیر کہا بھی جاتا تھا اور جس طرح رُوح اپنے وطن سے دُور ہے اُسی طرح اقبال بھی اپنے وطن سے دُور تھے۔ مگر تصوف کی تعلیم تھی کہ جنت کی اصل خصوصیت آسائشیں نہیں بلکہ خدا کا جلوہ ہے۔ مولانا روم نے کہا تھا کہ انسان صرف ذوقِ دیدار کا نام ہے اور دیدار تب ہے کہ محبوبِ حقیقی کو دیکھا جائے:

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

اگر ہر چیز میں خدا کی تجلی ہے تو پھر دنیا اور آخرت کی ثنویت دُور کر کے کیا وطن سے محبت اور آخرت کے تصور کو بھی اکٹھا نہیں کیا جا سکتا تھا؟ فلسفی کے لیے شائد مشکل ہوتا مگر ایک عاشق ہرجائی شاعر کے لیے مشکل نہ تھا۔

کشمیر

۱

کہکشاں میں آ کے اختر مل گئے
اِک لڑی میں آ کے گوہر مل گئے
واہ واہ کیا محفلِ احباب ہے
ہم وطن غربت میں آ کے مل گئے

۲

ظلم سہتے ہیں وطن اپنا نہ جن سے چھٹ سکا
شکوۂ حکام پر اے دل نہیں تیرا بجا
کیا عجب کشمیر میں رہ کو جو ہے اُن پر جفا
پائے گل اندر چمن دائم پُر است از خارہا

۳

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دُور
یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دُور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دُور

۴

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر
چشمِ اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِّ مطلب ہے اُخوت کی صدف میں پنہاں
مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر

IqbalCyberLibrary All rights reserved ©2002-2006

۵

سامنے ایسے گلستاں کے کبھی گر نکلے
جیبِ خجلت سے سرِ طور نہ باہر نکلے
ہے جو ہر لحظہ تجلی گہِ مولائے جلیل
عرش و کشمیر کے اعداد برابر نکلے

۶

پنجۂ ظلم و جہالت نے برا حال کیا
بن کے مقراض ہمیں بے پر و بے بال کیا
توڑ اس دستِ جفاکیش کو یارب جس نے
رُوحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

۷

بت پرستی کو مرے پیشِ نظر لاتی ہے
یادِ ایامِ گزشتہ مجھے شرماتی ہے
ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکا اقبالؔ
کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

۸

کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے
اس باغ جاں فزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائیداد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

دہر کی شانِ بقا خطۂ کشمیر میں دیکھ
باغِ جنت کی ہوا خطۂ کشمیر میں دیکھ
ذرّے ذرّے سے ہے اِک حسن کا طوفاں برپا
جوش میں لطفِ خدا خطۂ کشمیر میں دیکھ

یہ نو قطعات اقبال نے انجمن کشمیری مسلمانانِ ہند کے کسی اجلاس میں سنائے۔[۴۵]

۴۱

فروری ۱۸۹۷ء میں انجمن حمایت اسلام کا بارہواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ ممکن ہے اس دفعہ اقبال شریک نہ ہو سکے ہوں کیونکہ اگلے مہینے بی اے کے امتحان تھے۔

۴۲

امتحان میں اقبال نے درجہ دوم میں کامیابی حاصل کی۔ عربی اور انگریزی میں اول آئے جس پر اُنہیں دو میڈل دیے گئے۔ اِس کے بعد وہ چھٹیاں گزارنے سیالکوٹ گئے ہوں گے۔

۴۳

اقبال لاہور سے آئے تو خوشی کے عالم میں تھے۔ شاہ جی نے ایک چپت رسید کر کے کہا، ''ایسی حرکتیں ہمارے سامنے!''[۴۶]

اقبال سیالکوٹ کے بازار میں رحیمہ عطار کی دکان پر کھڑے حقہ پی رہے تھے۔ ایک پاؤں جوتے سے نکال کر دکان کے تختے پر رکھا ہوا تھا۔ دوسرا زمین پر تھا۔ اچانک شاہ جی سامنے سے آتے دکھائی دیے۔ اقبال نے حقہ چھوڑا اور دُوسرا پیر بھی زمین پر ٹکا کر ہاتھ باندھ لیے۔ شاہ جی قریب آ چکے تھے۔ سلام کر کے یہ اُن کے ساتھ ہو گئے اور گھر

تک چھوڑنے گئے۔ واپس آ کر دوسرا جوتا پہنا۔[۴۷]

۴۴

یہ اقبال کی فطرت کا تقاضا تھا کہ اُن کا ذہن بیک وقت کئی چیزوں پر متوجہ ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ اُن کی خوش قسمتی تھی ورنہ شاعری، فلسفے اور کاروبارِ دنیا کی کشمکش اُنہیں تباہ کر سکتی تھی۔

۴۵

ایم اے میں اقبال نے عربی اور انگریزی کے بجائے فلسفہ کا انتخاب کیا حالانکہ یہی وہ مضمون تھا جس میں اُن کی پوزیشن نہیں آئی تھی۔ شاید ایک طرف برہمن زادہ ہونے کی وجہ سے وہ فلسفہ کو اپنی میراث سمجھتے ہونگے اور دوسری طرف تصوف اُن کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ چنانچہ مابعدالطبعیات اُن کی فکر کا پسندیدہ میدان تھا۔ اِس کے بعد فلسفہ کے جس شعبہ سے اُنہیں بہت زیادہ دلچسپی تھی وہ انسانی ارادے اور انسانی کردار کی بحث تھی۔

The Nichomachean Ethics of Aristotle

Translated by F. H. Peters

اِس کتاب کے حاشیوں پر اقبال نے انگریزی میں لکھا:[۴۸]

ارسطو کا طریقہ...

اُس کا نظامِ اخلاقیات بعض پہلے سے قائم مفروضوں پر انحصار کرتا ہے۔ مقصد، ہیئت اور عملیت جیسے تصورات جن کی مدد سے انسانی زندگی کی تشریح کی گئی ہے اور جو تجربے کو معانی دیتے ہیں کسی منطقی طریقے سے حاصل نہیں کیے گئے ہیں بلکہ اوپر سے آئے ہیں...

اپریل میں وکٹوریا کو تخت برطانیہ پر رونق افروز ہوئے پچاس پر پورے ہورہے تھے۔

۴ اپریل کو ضلع سیالکوٹ میں گولڈن جوبلی کے سلسلے کا جشن منعقد کیا گیا۔ منشی غلام قادر فصیح میونسپل کمشنر سیالکوٹ کی تحریک بابو محبوب عالم سپرنٹنڈنٹ دفتر ڈپٹی کمشنر اور شیخ میراں بخش میونسپل کمشنر کی کوششوں سے ہزاروں لوگوں کا مجمع اکٹھا ہو گیا۔[۳۹]

دوپہر ڈھائی بجے جلسے کی کاروائی شروع کی گئی۔ سب سے پہلے غلام قادر فصیح نے تقریر کی۔ اس کے بعد میر حسن کو اظہار خیال کے لیے بلایا گیا۔

جلسہ منعقد کرنے والوں نے تجویز پیش کی تھی کہ ایک عظیم الشان ایڈریس (سپاسنامہ) تیار کر کے ملکہ کی خدمت میں بھجوایا جائے میر حسن نے اسی کی تائید کی۔

''...بادشاہِ عادل کا وجود ایسی نعمت ہے کہ جب تک اس نعمت سے ہم بہرہ ور نہ ہوں دوسری نعمتوں سے محظوظ اور متمتع نہیں ہو سکتے...خدائے تعالیٰ اپنی ان نعمتوں کو جو اُس نے اپنی مخلوق کو عنائت فرمائی ہیں اپنے کلام میں متواتر ذکر فرماتا ہے تاکہ اُس کے بندے ان نعمتوں کو جان جائیں اور ان کا شکر بجا لائیں...سورہ بقرہ میں فرماتا ہے:

ولولا دفع اللّٰہ الناس بعضہم بعض لفسدت الارض ولکن اللہ ذوالفضل علی العالمین (اور اگر اللہ بعض لوگوں کے ذریعہ سے بعض لوگوں کو کرسی حکومت سے نہ ہٹاتا رہے تو ملک کا انتظام درہم برہم ہو جاوے لیکن اللہ دنیا کے لوگوں پر بڑا مہربان ہے۔)

''طوائف الملوکی یا جنگ وجدل کے زمانے میں جو بربادی اور تباہی ہوتی ہے وہ آشکارا ہے محتاجِ بیان نہیں...پھر سورۃ حج میں فرماتا ہے: ولولا دفع اللّٰہ بہ بعض لہدمت صوامع و بیع و صلوات و مساجد یذکر فیھا اسمہ اللّٰہ کثیرا (اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ہاتھ سے نہ ہٹواتا رہے تو نصاریٰ کے صوامعہ اور

گرجے اور یہودیوں کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہے کبھی کی ڈھائی جا چکی ہوتیں)۔

''ظاہر ہے کہ جب دلجمعی اور اطمینان ہی نہ ہو تو عبادتِ الٰہی جس کا رکنِ اعظم اطمینانِ قلب ہے کیونکر کوئی بجا لا سکتا ہے... اگر عادل بادشاہ نہ ہو تو جسمانی اور روحانی دونوں آسائشیں مفقود ہو جاتی ہیں... رسولِ مقبول صلعم نے ہمیں ہر نعمت کا شکر کرنے کی تعلیم فرمائی ہے اور اپنے حکامِ وقت کی اطاعت اور فرمانبرداری کی ہدایت فرمائی ہے۔ پس جب حکامِ وقت کی اطاعت کریں اور اس نعمتِ عظمیٰ کا شکر کریں تو ہم اپنے پاک رسول صلعم کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔''

اس کے بعد میر حسن نے اس حدیث کے حوالے سے جس میں رسولِ اکرمؐ نے نوشیروانِ عادل کے زمانے میں پیدا ہونے پر فخر ظاہر کیا تھا یہ واضح کیا کہ بادشاہ کا مسلمان ہونا ضروری نہیں۔ آخر میں ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کی برکتیں گنوائیں اور اس تجویز کا خیر مقدم کیا کہ ایسی مہربان ملکہ کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کرنا چاہیے۔ اس پر بھاری خرچ آئے گا'' اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ ایڈریس اُس حضرتِ قیصرۂ ہند میں پیش ہونا ہے جس کی عظمتِ ذات اور شوکت کو بچہ بچہ جغرافیہ پڑھنے والا جانتا ہے۔ اور اُس قوم کی طرف سے پیش ہونا ہے جس کے گزشتہ کارنامے ہر تاریخ دان پر آشکار ہیں گو وہ اب نہایت پست حالت میں ہے مگر گذشتہ بزرگوں کی عظمت اور بزرگی اُنہیں بالکل فراموش نہیں...''

۴۷

موسمِ گرما میں انجمن کشمیری مسلمانانِ ہند ختم ہو گئی۔

۴۸

۲۵ اگست کو اقبال نے ایک کتاب پر اپنا نام لکھا۔ [۱] غالباً یہ نئی کتاب تھی جو اُنہوں نے

نصاب کے طور پر خریدی تھی۔

A Study of Religion

James Martineaus, D.D., S.T.D., D.C.,., L.L.D.,

Vol. 1

''اگر دنیائے حادثات کے قوانین اپنی مقررہ راہ پر قائم رہتے ہیں تو اس سے مذہب کو کوئی فرق نہیں پڑتا،'' مصنف نے تحریر کیا تھا۔ ''اور اگر یہ سائنس کے قوانین خدا کے بنائے ہوئے ہیں تو اس سے سائنس کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سائنس اور مذاہب دونوں مضامین کا مطالعہ یکساں اسباب و علل پر محیط ہے۔ صرف الگ الگ کناروں پر شروع ہوتا ہے۔ جو بات ایک مطالعے میں بین السطور رہتی ہے وہی دوسرے مطالعے میں کھل کر سامنے آجاتی ہے لیکن اگرچہ ان دونوں کے درمیان تصادم نہیں ہے پھر بھی anti-thesis ضرور اُن دونوں میں ہے اور کوئی بات یہ کہنے سے زیادہ گمراہ کن نہیں کہ خدا محض فطرت کا ہم معنی لفظ ہے۔ فطرت کی صفات پیدائش، نشوونما اور موت ہیں۔ خدا نہ شروع ہوسکتا ہے نہ ختم۔ فطرت نتائج کا مجموعہ ہے، خدا ان تمام نتائج کا لازوال سبب ہے۔ فطرت ایسی چیزوں کا نظام ہے جنہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ خدا خود عقلِ کلی ہے۔ ان جوڑوں کو جدا کر دیں، ان میں سے قائم، مُسبّب، فطرتِ مطلق، عقلِ کلی کو نکال لیجیے تب جو کچھ رہ جائے گا وہ یقیناً فطرت ہے مگر یوں لٹی پٹی اور تنہا فطرت خدا کی نفی ہے اُس کی مترادف نہیں۔ چنانچہ میں اس خیال کی نفی کرتا ہوں کہ مذہب اور فطرت کے درمیان کوئی تصادم موجود ہے اور اس بات کی تائید کرتا ہوں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔''

۴۹

ستمبر یا اکتوبر میں کسی قسم کی تعطیلات ہوئیں تو اقبال پھر سیالکوٹ گئے۔ کریم بی بھی میکے سے آئی ہوئی تھیں۔

خدا کے وجود کے بہت سے عقلی دلائل دیئے گئے تھے۔

ارسطو نے کہا تھا کہ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ اسباب کا سلسلہ کہیں نہ کہیں سے تو شروع ہوا ہو گا اور وہی پہلا سبب خدا رہا ہو گا۔ مذہبی علما کہتے تھے کہ ہر چیز کا کوئی بنانے والا ہوتا ہے۔ کائنات کا بنانے والا بھی کوئی نہ کوئی رہا ہو گا۔ جدید عقلیت پسندی کے بانی ڈیکارٹس کا کہنا تھا کہ اگر ہم ایک مکمل ہستی کا تصور کر سکتے ہیں تو پھر اُس کا وجود ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ اگر وہ ہستی موجود نہیں تو پھر مکمل بھی نہیں ہو سکتی مگر چونکہ ہم مکمل ہستی کا تصور کر رہے ہیں لہٰذا وہ موجود بھی ضرور ہو گی۔

اٹھارویں صدی کے اواخر تک مذہب اور فلسفہ کافی خلط ملط ہو گیا تھا۔ کانٹ، جو عیسائی تھا یہ مشن لے کر اُٹھا کہ مذہب کو منطق کے کمزور سہاروں سے نجات دلائے چنانچہ خدا کے وجود کے تمام عقلی دلائل رد کر دیے۔ ارسطو کی دلیل اس لیے غلط تھی کہ اُس نے خود کہا تھا کہ ہر چیز کا کوئی سبب ہوتا ہے، تو پھر خدا کا بھی کوئی سبب ہونا چاہیے؟ جہاں تک اِس روایتی دلیل کا تعلق ہے کہ ہر چیز کا خالق ہوتا ہے اِس لیے کائنات کا خالق بھی ہونا چاہیے تو دنیا میں ہم جتنی بھی چیزیں دیکھتے ہیں اُن کے بنانے والے مر جاتے ہیں مگر بعض اوقات وہ چیزیں پھر بھی باقی رہتی ہیں لہٰذا خدا کے خالق ہونے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اب بھی موجود ہو گا۔

کانٹ کے خیال میں خدا کے وجود کا ثبوت انسان کے ضمیر میں ہے۔ چونکہ ہم نیکی کو اچھا سمجھتے ہیں اِس لیے اگر اس کا بدلہ نہ ملے تو ہمارے ضمیر کا کوئی جواز بھی نہیں رہے گا لہٰذا ایک ایسی ہستی کے وجود کی ضرورت ہے جو دُنیاوی زندگی کے بعد ہمیں انصاف دلائے۔

شیلے وہ شاعر تھا جس نے شیطان کو اخلاقی نمونے کے طور پر پیش کیا تھا۔ خدا سے

بغاوت کے مرکزی خیال کو نقطۂ عروج پر پہچانے والا یہی شاعر تھا جس نے ''پرومیتھیوس اَن باؤنڈ'' اُس وقت لکھا تھا جب وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر محبوبہ کے ساتھ فرار ہو رہا تھا۔ اُس نے باقاعدہ پمفلٹ لکھ کر لوگوں کو خدا اور مسیح سے منہ پھیرنے کی دعوت دی۔ بائرن کی طرح وہ بھی آزادی کا متوالا تھا خواہ سیاسی آزادی ہو یا ذہنی۔

کہتے ہیں کہ آئی سکائی لوس نے اپنے المیہ ڈرامے کا دوسرا حصہ بھی لکھا تھا جس میں دکھایا تھا کہ زیوس دیوتا اپنے باغی پرومیتھیوس کو معاف کر دیتا ہے۔ شیلے نے اِسی گم شدہ ڈرامے کا عنوان لیا تھا مگر اُس کا ہیرو معافی نہیں مانگتا:

Monarch of Gods and Daemons, and all Spirts
But One, who throng those bright and rolling worlds
Which thou and I alone of living things
Behold with sleepless eyes! regard this Earth
Made multitudinous with thy slaves, whom thou
Requitest for knee-worship, prayer, and praise,
And toil, and hecatombs of broken hearts,
With fear and self-contempt and barren hope.
Whilst me, who am thy foe, eyeless in hate,
Hast thou made reign and triumph, to thy scorn,
O'er mine own minsery and thy vain revenge.
Three thousand years of sleep-unsheltered hours,
And moments aye divided by keen pangs
Till they seemed years, torture and solitude,

Scorn and despaire, these are mine empire.

More glorious far than that which thou surveyest

From thy unenvied throne, O Mighty God!

۵۲

شیلے نے اپنے دیباچے میں لکھا تھا:

شیطان واحد خیالی پیکر ہے جس میں پرومیتھیوس سے مشابہت پائی جاتی ہے...اور میری رائے میں پرومیتھیوس شیطان سے کہیں زیادہ شاعرانہ کردار ہے کیونکہ جرأت، وقار اور خدا کی ہمہ گیر قدرت کے خلاف مزاحمت میں ثابت قدم رہنے کے علاوہ اُسے اقتدار کی ہوس، حسد، اِنتقام اور ذاتی مفادات کی طلب کے رنگوں سے پاک بھی دکھایا جاسکتا ہے جبکہ پیراڈائز لوسٹ کے ہیرو میں یہ خرابیاں دکھائی دیتی ہیں اور اس وجہ سے جبر کے خلاف مزاحمت کے اخلاقی سبق میں خلل ڈالتی ہیں۔(پیراڈائز لوسٹ میں) شیطان کا کردار ہمارے ذہنوں میں ایک تاثر کو جنم دیتا ہے جس کی وجہ سے ہم اُس کی خامیوں کو بھی اُس پر ہونے والے مظالم کے ساتھ ساتھ وزن کرنے لگتے ہیں... یہ بات اُن لوگوں کے ذہنوں کو بالکل ہی گمراہ کردیتی ہے جو اِس عظیم الشان افسانے کو کسی مذہبی احساس کے ساتھ پڑھتے ہیں مگر پرومیتھیوس ایک طرح سے اخلاقی اور طباع فطرت کا مکمل ترین نمونہ ہے جسے صاف ترین اور سچے ترین جذبے بہترین اور اعلیٰ ترین مقاصد کی طرف گامزن کرتے ہیں...

۵۳

عہدِ جدید میں جو مقام فلسفے کی تاریخ میں کانٹ کو حاصل تھا وہی ادب کے میدان میں وڈزورتھ کو حاصل تھا۔ جہاں فلسفی کے دلائل بیکار ہوگئے تھے وہاں شاعر کا جادو کام کر گیا۔

ورڈزورتھ اپنے الفاظ کی تاثیر سے پڑھنے والوں کو اُس روحانی تجربے سے دوچار کرتا تھا جہاں وہ اپنے دلوں کو فطرت کے ساتھ دھڑکتا محسوس کرتے تھے اور دھڑکنیں خود بخود اپنے بنانے والے کی حمد کرنے لگتی تھیں۔

My heart leaps up when I behold
A rainbow in the sky:
So was it when life began;
So is it now that I am a man;
So be it when I shall grow old;
Or let me die!
The child is father of the Man;
And I could wish my days to be
Bound each to each by natural piety.

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

۵۴

اقبال کا بیان ہے، ''مجھے ہیگل، گوئٹے، مرزا غالب، مرزا عبدالقادر بیدل اور ورڈزورتھ کا رہینِ منّت ہونے کا اعتراف ہے۔ پہلے دونوں نے چیزوں کے 'باطن' تک میری رہنمائی کی۔ تیسرے اور چوتھے نے مجھے سکھایا کہ شاعری کے مغربی نصب العین کو اپنی رُوح میں سمونے کے بعد اپنی روح اور اپنے طریقۂ اظہار کو مشرقی کیسے رکھا جائے۔ اور آخری نے مجھے زمانۂ طالب علمی میں خدا کا مُنکر بننے سے بچالیا۔''[۴۱]

۵۵

انجمن اتحاد کے مشاعروں میں اب اکثر شاعر اقبال کی طرح اپنا کلام ترنم سے سنانے لگے تھے۔

مرزا ارشد بھلا کب چوکنے والے تھے۔ اُنہوں نے اِس صورت حال پر ایک مصرع کہہ دیا جو آناً فاناً مشہور ہو گیا:

نظمِ اقبال نے ہر اِک کو گویا کر دیا

۵۶

اقبال اور احمد حسین خاں مشاعروں میں ایک دوسرے کے حریف سمجھے جانے لگے تھے۔

دسمبر ۱۸۹۷ء کے وسط میں حکیم امین الدین نے عید کی تقریب میں اپنے خاص احباب کو بلایا۔ شیخ گلاب دین، منشی محبوب عالم، احمد حسین اور شیخ عبدالقادر کے علاوہ اقبال بھی مدعو کیے گئے تھے۔ ان کے علاوہ بھی چھ سات مہمان تھے جن سے اقبال اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔

طعام سے فارغ ہو کر عبدالقادر نے تجویز پیش کی کہ اقبال اور احمد حسین خاں فی البدیہہ غزلیں کہیں۔ طرح مصرع دیتے ہوئے اُنہوں نے یہ شعر پڑھا:

وعدۂ وصل سے ہو دل کو تسلی کیونکر
فکر یہ ہے کہ وہ وعدے سے پشیماں ہو گا

غزل

لاکھ سرتاجِ سخن ناظمِ شرواں ہو گا
پر مرے سامنے اِک طفلِ دبستاں ہو گا
مردِ مومن کی نشانی کوئی مجھ سے پوچھے
موت جب آئے گی اُس کو تو وہ خنداں ہو گا
جو وفا پیشہ سمجھتا ہے خودی کو ایماں
جنتی ہوگا، فرشتوں میں نمایاں ہو گا

چار سُو پھولوں کا انبار نظر آتا ہے
شاید اِس بزم میں اقبالؔ غزل خواں ہو گا[۴۲]

اِس غزل کے کل آٹھ اشعار دستیاب ہیں۔ جواب میں احمد حسین خاں نے جو غزل سنائی اُس کا مقطع بظاہر اقبال کے مقطع کا جواب معلوم ہوتا تھا:

بلبلیں دُور رہیں مجھ سے تو اچھا احمدؔ
ورنہ تُو گل کی طرح چاک گریباں ہو گا

۵۷

حکیم امین الدین بیرسٹر اپنی وکالت کے سلسلے میں پشاور منتقل ہو گئے۔

انجمن اتحاد کے مشاعرے اُن کے نوجوان عزیز حکیم شہباز الدین کے مکان کے چبوترے پر منتقل ہو گئے۔ یہ لاغر اور نحیف مگر دل کے اچھے تھے۔ احباب کی خاطر مدارت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتے تھے۔

۵۸

۴ جنوری کو پنجاب یونیورسٹی کا کونووکیشن منعقد ہوا جس میں گزشتہ برس اعلان ہونے والے نتائج پر اسناد اور تمغے تقسیم کیے گئے۔ وائس چانسلر سر سی اے رو تھے اور پنجاب کے گورنر تقسیمِ اسناد کے لیے خود آئے تھے۔

کونووکیشن میں اقبال بھی گئے ہوں گے اور اپنی بی اے کی اسناد اور خلیفہ محمد حسن اپچی سن میڈل وصول کیا ہو گا۔

۵۹

انجمن حمایت اسلام کے چودھویں سالانہ جلسہ کے اگلے ماہ ایم اے کے امتحانات ہوئے۔ اقبال ایک سال فلسفہ پڑھ چکے تھے اور امتحان دینے کے مجاز تھے۔ ایک

روایت ہے کہ اُنہوں نے امتحان نہیں دیا اور قانون کے امتحان کی تیاری کرتے رہے جو دسمبر میں منعقد ہونے والا تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اُنہوں نے امتحان دیا اور فیل ہوئے۔

۶۰

پروفیسر اُشر صاحب جو اقبال کو فلسفہ پڑھاتے تھے فروری میں گورنمنٹ کالج چھوڑ کر چلے گئے اور اُن کی جگہ علی گڑھ والے ٹامس آرنلڈ لاہور آ گئے۔

اقبال کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا ہو گا جب وہ دنیا کے عظیم مستشرق سے اپنے کالج میں ایم اے فلسفہ کے واحد طالب علم کے طور پر ملے ہوں گے۔[۴۳] ممکن ہے پہلے پہل یہ جان کر آرنلڈ کو مایوسی ہوئی ہو کہ اُنہیں صرف ایک لڑکے کو پڑھانا ہے مگر اقبال سے ملنے کے بعد اُنہوں نے محسوس کیا کہ جس قسم کے طالب علم کی وہ ہمیشہ سے آرزو رکھتے تھے وہ اُن کے سامنے ہے۔

۶۱

اقبالؔ! میرے نام کی تاثیر دیکھیے
میں جس کے ساتھ ہوں اُسے ممکن نہیں شکست[۴۴]

۶۲

آرنلڈ سے پہلی ملاقات کے چند روز بعد اقبال ریل کے ایک ڈبے میں بیٹھے سیالکوٹ کا سفر کر رہے تھے اور باہر موسمِ بہار کی رعنائیاں پورے عروج پر تھیں۔

سیالکوٹ میں ۲۸ مارچ کی صبح اقبال ایک دوست کی دکان پر محمد ذکی کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ شاہ جی سامنے سے آتے دکھائی دیے۔ کالج کی راہ پر تھے مگر چہرہ دُھواں ہو رہا تھا۔ کہنے لگے، ''مجھے تار موصول ہوا ہے کل علی گڑھ میں سرسید وفات

پا گئے!"

یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ سب جانتے تھے کہ علی گڑھ کالج میں ایک لاکھ روپیہ غبن کی وجہ سے سرسید فکرمند رہنے لگے ہیں اور اس کا اثر اُن کی صحت پر مرتب ہو رہا ہے۔ یوں بھی اُن کی عمر اسّی برس سے اُوپر ہو چلی تھی مگر وہ ایسی شخصیت تھے کہ اُن کی موت کا خیال کرنا ذرا مشکل تھا۔ اقبال اور میر حسن کو اس بات کا دکھ بھی ضرور رہا ہوگا کہ سرسید نے جو تفسیر قرآن شروع کی تھی وہ اب مکمل نہ ہو سکے گی۔

میر حسن نے اقبال سے کہا کہ وہ سرسید کی تاریخ وفات نکالیں اور خود کالج روانہ ہو گئے۔ یہ کاغذ قلم لے کر ابجد کا حساب کرنے لگے اور تھوڑی دیر بعد ایک قرآنی آیت ذکی کو دے کر کہا، "ابھی کالج جا کر میر صاحب کو دے دو۔"

میر صاحب نے پرچہ ذکی کے ہاتھ سے لیا تو اُس پر لکھا تھا: انی متوفيك ورافعك الي ومطهرك۔ تمام حروف کے اعداد جمع ہو کر سید احمد خاں کی تاریخ وفات کے برابر نکلتے تھے۔

"بہت خوب ہے!" اُنہوں نے بیٹے سے کہا، "میں نے بھی ایک مادہ نکالا ہے اور وہ ہے، غفر لہٗ۔"

پھر اُنہوں نے دونوں مادّے علی گڑھ بھجوا دیے۔[٤٥]

٦٣

محمد حسین آزاد کے شاگرد مولوی ممتاز علی نے ولایت سے منگوائی ہوئی مطبع رفاہِ عام کی مشینوں پر اپنے استاد کی دربارِ اکبری شائع کی۔ مقدمہ میں درج کیا کہ آزاد نے صاف شدہ مسودہ دیوانگی کے عالم میں دریائے راوی پر ریل کے پل سے نیچے پھینک دیا تھا اور یہ کتاب مولوی ممتاز علی نے غیر صاف مسودے سے تیار کر کے شائع کی ہے جس میں اکبر کے ستر درباریوں کے حالات پر مشتمل تتمہ انہوں نے آزاد کے اشارات کی مدد سے خود لکھا ہے۔

آزاد کے صاحبزادے آغا محمد ابراہیم کو بہت افسوس ہوا۔ ان کا کہنا تھا کہ مسودہ بالکل صاف حالت میں تتمہ سمیت انہوں نے مولوی ممتاز علی کو دیا تھا اور وہ آزاد کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ آزاد دیوانگی کی کیفیت میں تھے اس لیے خود ان سے دریافت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''تائیدِ غیبی یہ ہوئی کہ میر [ممتاز علی] صاحب موصوف نے دربارِ اکبری چھاپنے کے بعد کتاب مذکور کا مسودہ جو میں نے ان کو دیا تھا مجھے واپس کر دیا اور دیتے وقت وہ تتمے کا مسودہ دست خطی حضرت مرحوم بھی نکالنا بھول گئے جس کی نسبت انہوں نے ایسی دلیری سے لکھ دیا تھا کہ وہ تقریباً تمام و کمال ہی ان کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے،'' ابراہیم نے بعد میں لکھا۔ ''مسوداتِ مذکورہ بالا جس کا جی چاہے میرے پاس دیکھ سکتا ہے۔''

٦٤

۲۳ جون کو اقبال کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔[۴۶] اُس زمانے میں اقبال میں آفتاب پرستی کا دبا دبا سا رُجحان پایا جاتا تھا شاید اسی لیے بچے کا نام آفتاب اقبال رکھا۔

بزرگوں کے سامنے اولاد کو پیار کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اقبال بھی اِسی انداز پر قائم تھے اور عموماً دوسروں کے سامنے اپنے بیٹے کو گود میں کھلانے سے پرہیز کرتے تھے۔[۴۷]

٦٥

ہاسٹل میں اقبال نے اعلان کیا کہ اُن کے یہاں لڑکا ہوا ہے جسے وہ اہلِ بیت کے دشمنوں کو جلانے کے لیے آفتاب حسین کہتے ہیں۔ نیرنگ کو یقین نہ آیا۔

''حالت یہ تھی کہ اقبال بارہا ایسے افسانے بھی گھڑ کر سنا دیا کرتے تھے، جن کی اصلیت کچھ نہ ہوتی تھی،'' نیرنگ نے بعد میں لکھا۔ ''اس لیے آفتاب حسین...کے قصے کو بھی میں باور نہ کرتا تھا۔''[۴۸] اُن کے دوست یہی سمجھتے رہے کہ لڑکے کی پیدائش کی بات

ہی سرے سے گپ ہے۔

۶۶

سیالکوٹ میں دیوانی عدالت نے شیخ نور محمد کے حق میں فیصلہ دے دیا اور مقدمے کے اخراجات اُسی پڑوسی کو ادا کرنے کا حکم دیا جس نے اُن کے گھر کے نیچے تنور لگوادیا تھا۔

پڑوسی کے پاس پیسے نہیں تھے۔ شیخ نور محمد نے اِسی کو غنیمت سمجھا کہ تازہ ہوا بازیاب ہوگئی تھی اور پیسوں کے لیے تقاضا نہ کیا۔[۴۹]

امام بی بی نے یہ سلسلہ شروع کیا کہ محلے کی غریب اور یتیم لڑکیوں کو اپنے گھر بلالیتیں۔ وہ کام کاج میں ہاتھ بٹاتی تھیں اور یہ اپنی بیٹیوں کی طرح اُن کی تربیت کرتی تھیں۔ عطا محمد کو پیسہ ہاتھ سے نکالنے کا بہانہ چاہئے تھا۔ وہ چھٹیوں میں گھر آئے تو کچھ رقم اپنی بے جی کے ''گپت دان'' کے لیے دے دی۔ امام بی بی ان پیسوں سے بھی محلے کی غریب عورتوں کی خفیہ مدد کرنے لگیں۔ رفتہ رفتہ محلے والوں کا رویہ بدل گیا اور ٹوپیوں والوں کے گھرانے کی بڑی عزت ہوگئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دُنیا میں اُونچے مقام کا جو خواب امام بی نے دیکھا تھا وہ اُن کی نیک دلی اور سخت محنت کی بدولت اب پورا ہوگیا ہے۔

تنور والے پڑوسی کے دل کا غبار پھر بھی صاف نہ ہوا۔

۶۷

اِس دفعہ سردیاں آئیں تو پنجاب میں طاعون کی زبردست وبا پھیلی۔ سیالکوٹ میں میر حسام الدین نے ضرور اپنے چچا زاد ''منکر'' بھائی سے کہا ہوگا ''تم نے دیکھا؟ ہمارے مسیح موعود نے سال کے شروع میں ہی طاعون کی پیش گوئی کردی تھی۔ ایمان لے آؤ!''

بہر حال جب بیسیوں لوگ روز مرنے لگے تو ایک روز ٹوپیوں والوں کے گھرانے

میں یہ خبر پہنچی کہ طاعون کی بیماری نے اُن کے خطرناک دشمن تنور والے پڑوسی کا گھر دیکھ لیا ہے۔

چند دنوں بعد اُس کی بیٹی روتی ہوئی امام بی بی کے پاس آئی۔ اُس کا باپ مر رہا تھا مگر جان نہیں نکلتی تھی۔ اپنی بیٹی کو بھیجا تھا کہ کسی طرح نتھو کو بلا کر لے آؤ۔ وہ جب تک معاف نہیں کرے گا مجھے تکلیف سے نجات نہیں ملے گی۔

امام بی بی کو طاعون والے گھر کی لڑکی کا اپنے یہاں آنا سخت ناگوار گذرا مگر شیخ نور محمد لٹھے کا رومال کندھے پر رکھ کر تیار ہو گئے۔ پڑوسی کے سرہانے بیٹھ کر اُسے تسلی دی اور دعائیں پڑھیں۔ وہ مر گیا تو اپنے ہاتھوں سے کفن تیار کیا اور قبرستان تک چھوڑنے گئے۔ گھر میں امام بی بی منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔ نور محمد واپس آئے تو اُنہوں نے غصے کا اظہار کیا مگر نور محمد نے کہا، ''جیل والے بھی پھانسی پانے والے قاتل کی آخری خواہش پوری کر دیتے ہیں...''[۵۰]

حکیم شہباز اپنا دل و جگر دوستوں کی نذر کر سکتے تھے مگر باقاعدگی سے مشاعروں کا بندوبست کرنا اُن کی ہمت کی بات نہ تھی۔ انجمن اتحاد کچھ ہی عرصے میں ختم ہو گئی۔ شورِ محشر بھی بند ہو گیا۔ ہاں ویسے قریب قریب روزانہ ہی ان کے چبوترے پر اہلِ سخن کی محفل جمتی تھی جس میں بزرگ اور جوان حصہ لیتے تھے۔[۵۱]

ایسے میں کبھی کسی کی جیب سے تاش کی گڈی نکل آتی تو کچھ منچلے شاعری سے نکل کر رنگوں کی دنیا میں آ جاتے۔

پنجابی محاورے میں اینٹ کتے کا بیر مشہور ہے۔ میاں فضل حسین نے اینٹ رنگ بتایا تو اقبال بول اٹھے، ''اِس کے ساتھ تو تمہارا بیر تھا۔ تم نے اینٹ کیوں بولی؟''[۵۲]

گورنمنٹ کالج میں اقبال اور آرنلڈ کے باہمی ربط کے بارے میں شیخ عبدالقادر کا بیان ہے، ''کئی مسئلے دورانِ تعلیم میں ایسے آئے جن کی تحقیقات کی مزید غرض سے آرنلڈ صاحب بہادر کو یورپ کے نامور فلسفہ دانوں سے خط و کتابت کرنی پڑی اور یہ خط و کتابت استاد و شاگرد دونوں کے لیے مفید ثابت ہوئی۔''[۵۲]

یہ مسئلے کیا تھے؟ تفصیل معلوم نہیں مگر تعلیم مکمل کرتے ہی اقبال نے جو مقالہ لکھا وہ اُن کے ذہنی جھکاؤ کی نشاندہی ضرور کرتا ہے۔ اُس زمانے میں ویدانتی فلسفہ اہلِ مغرب میں متعارف ہو چکا تھا بلکہ بعض بڑے فلسفہ اس سے متاثر بھی ہوئے تھے۔ اس کے برعکس اسلامی تصوف اور فلسفہ کے بارے میں مغرب کا علم بہت محدود تھا اگرچہ کچھ عرصہ پہلے آر اے نکلسن نے مولانا روم کے دیوانِ شمس تبریز سے ایک انتخاب کا ترجمہ کیا تھا اور خود آرنلڈ بھی اسلامی علوم کو اپنے اہلِ وطن سے متعارف کروانے میں دلچسپی لیتے تھے۔ اقبال کا خیال تھا کہ مسلمان مفکرین نے تصوف کے پیرائے میں ایسے نکات پیش کیے ہیں جنہیں مغربی فلسفہ کی مروجہ اصطلاحات میں ترجمہ کر کے دکھایا جائے تو وہ انسانیت کی رہنمائی میں نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں۔ غالباً یہی ذہنی رویہ تھا جس کی وجہ سے انہیں آرنلڈ سے ایسے سوالات پوچھنے پڑے جن کے جواب خود آرنلڈ کے پاس نہیں تھے کیونکہ ان نکات پر پہلے کسی نے غور نہیں کیا تھا۔ تب آرنلڈ کو مغرب کے نامور فلسفہ دانوں سے رجوع کرنا پڑا ہوگا اور کم و بیش اُسی زمانے میں شیخ عبدالقادر نے آرنلڈ کو یہ کہتے بھی سنا کہ اقبال جیسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے۔

ایک روز پروفیسر آرنلڈ نے محسوس کیا کہ اقبال کھوئے کھوئے سے اور پریشان ہیں۔ معلوم ہوا ایک مولوی صاحب نے جن سے اقبال بہت زیادہ متاثر تھے کوئی جھوٹا بیان دیا ہے۔

''زندگی میں یہی کچھ دیکھنے کو ملتا ہے،'' آرنلڈ نے اُنہیں سمجھایا۔[۵۳]

۷۰

شیخ عبدالقادر کا بیان ہے، ''اقبال کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت اُس کا 'کیفِ غم' ہے اور یہی کیفیت [اقبال] کے ذاتی خصائل میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی تھی۔ جو لوگ اُن سے ملتے رہے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ اُن میں یہ عجیب وصف تھا کہ سنجیدگی اور متانت بیٹھے بیٹھے ظرافت پر غالب آجاتی تھی اور چہرے پر یکا یک غم آمیز اثرات نظر آجاتے تھے۔ آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے جیسے کوئی دردانگیز خیال دفعتہً دل میں آگیا ہے۔ یہ رنگ اُن کے اشعار میں بہ کثرت پایا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ شاعر کے کلام میں اثر گدازِ دل سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ غالب کا یہ شعر اس خیال کی ترجمانی کرتا ہے:

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی''[۵۵]

۷۱

اقبال کی جذباتی زندگی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ بہت جلد توقعات وابستہ کر لیتے تھے اور اُن کے پورے نہ ہونے پر ایک طرح سے بچوں کی طرح افسردہ یا پھر ناراض ہو جاتے تھے۔

۷۲

دسمبر میں اقبال نے قانون کا امتحان دیا۔[۵۶]

یہ ایک اہم موقع رہا ہوگا۔ وکالت کی منزل تک پہنچنے اور ایک درخشاں زندگی کا آغاز کرنے میں اب صرف نتیجہ آنے تک کی دیر تھی۔

۷۳

سرسید احمد خان کے بعد نواب محسن الملک علی گڑھ تحریک کی بیشتر ذمہ داریاں پوری کر رہے تھے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے تیرھویں اجلاس کا اہتمام بھی اُنہوں نے لاہور کے ایک ٹیکنیکل اسکول میں کیا تھا۔ میر حسن اس میں شرکت کرنے سیالکوٹ سے اپنے لڑکے محمد ذکی کے ساتھ آئے اور ممکن ہے اقبال بھی شامل ہُوئے ہوں۔

میر حسن جلسہ گاہ پہنچے تو بارش ہو رہی تھی۔ اتفاق سے یہ اپنا ٹکٹ بھول آئے تھے۔ رضا کاروں نے روک لیا مگر نواب محسن الملک دُور ہی سے پکارے، ''ارے! اِن کو روکتے ہو جنھوں نے کانفرنس بنائی ہے؟'' ہمیشہ کی طرح اس بار بھی شاہ صاحب کو ڈائس پر جگہ دی گئی۔[۵۵]

کانفرنس میں تقریروں کے علاوہ نظمیں بھی پڑھی گئیں۔ کشمیر کے جواں سال شاعر خوشی محمد ناظر نے اپنی نظم میں ایک مصرع پڑھا:

کل خوابِ گراں جو مجھ کو آئی

شاہ صاحب خود پنجابی تھے مگر غلط اُردو برداشت کرنا اُن کے بس میں نہ تھا اِس لیے بعد میں ناظر کو بلا کر سمجھایا، ''بھئی آپ نے خوابِ گراں کو مونث کیسے باندھا؟'' معلوم نہیں ناظر نے کوئی جواب دیا یا ادب سے خاموش کھڑے رہے مگر خواب نیند کے معنوں میں مؤنث ہی ہوتا ہے۔

۷۴

کسی مہمان کے سامنے اقبال نے اپنی غزل پڑھی جس کا ایک شعر سننے والے کے ذہن سے مٹ نہ سکا:

فتنے اُٹھتے ہیں تیرے کوچے میں
یہ زمیں آسمان ہے گویا

غزل

فتنے اُٹھتے ہیں تیرے کوچے سے
یہ زمیں آسمان ہے گویا
ہے کشش پر مدار ہستی کا
عشق جانِ جہان ہے گویا
جب سے دل میں ہوا گزر تیرا
یہ مکاں لامکان ہے گویا
اہلِ دل ہی اِسے سمجھتے ہیں
شعر دل کی زبان ہے گویا

دستیاب غزل میں دس اشعار ہیں۔[۵۸]

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
اقبال اکادمی پاکستان

۷۵

غالباً جنوری ۱۸۹۹ء میں قانون کے امتحان کا نتیجہ نکلا۔[۵۹] اقبال اصولِ قانون (jurisprudence) کے پرچے میں فیل ہُوئے تھے۔

غزل

جس کو شہرت بھی ترستی ہے وہ رُسوا اَور ہے
ہوش بھی جس پر پھڑک جائیں وہ سَودا اَور ہے
جان دیتا ہوں تڑپ کر کوچۂ اُلفت میں مَیں
دیکھ لو تم بھی کوئی دَم کا تماشا اَور ہے
تم ہنسی میں سچ سمجھ بیٹھے، نہیں حاشا نہیں
وصل کیسا؟ اب مِرے دل کی تمنا اَور ہے

قیس پر یوں طعنہ زن ہوتی ہے لیلیٰ دشت میں
جس کے کانٹے دِل میں چبھتے ہیں وہ صحرا اَور ہے

وہ صفِ محشر میں کہتے ہیں مجھے پہچان کر
تم وہی اقبالؔ ہو، لو میں نے جانا اَور ہے

دستیاب غزل میں پندرہ اشعار ہیں۔[10]

۷۶

مکتوب احسن مارہروی مدیر ''ریاض سخن'' کے نام

مکرمِ بندہ، جناب میر صاحب۔ السلام علیکم

دونوں رسالے پہنچے۔ سبحان اللہ... افسوس ہے کہ اب تک میں نے آپ کے گلدستے کو کوئی غزل نہیں دی۔ انشاء اللہ تعالیٰ امتحان کے بعد باقاعدہ ارسال کیا کروں گا۔ ایک تکلیف دیتا ہوں۔ اگر آپ کے پاس اُستاذی حضرت مرزا داغؔ کی کوئی تصویر ہو تو ارسال فرمائیے گا۔ بہت ممنون ہوں گا... مَیں نے تمام دُنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے فوٹو جمع کرنے شروع کیے ہیں۔ چنانچہ انگریزی، جرمنی اور فرنچ شعراء کے لیے امریکہ لکھا ہے... حضرت امیرؔ مینائی کے فوٹو کی بھی ضرورت ہے۔ والسلام

خاکسار

محمد اقبال

از لاہور گورنمنٹ کالج بورڈنگ ہاؤس

۲۸ فروری ۱۸۹۹ء

۷۷

مارچ ۱۸۹۹ء میں ایم اے کا امتحان ہوا۔[11] خان بہادر نواب بخش میڈل فلسفہ میں

اوّل آنے والے طالب علم کو ملتا تھا۔ چونکہ اقبال واحد امیدوار تھے لہٰذا اُن کا میڈل یوں ہی پکا تھا۔ شرط صرف یہ تھی کہ فیل نہ ہوتے۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

باب ۶

مشرقی کالج

۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۰ء

۱

لاہور کے یونیورسٹی اورینٹل کالج میں عربی، فارسی اور سنسکرت کی تدریس اور اُن پر تحقیق ہوتی تھی۔ جو محقق یہ کام کرتے تھے اُنہیں ریڈر کہا جاتا تھا اور یہ تین برس کے لیے مقرر کیے جاتے تھے۔[۱]

اپریل ۱۸۹۹ء میں کالج کے پرنسپل سبکدوش ہوکر کلکتہ چلے گئے تو ٹامس آرنلڈ قائم مقام مقرر ہوئے۔ میکلوڈ پنجاب عربک ریڈر کی اسامی خالی تھی اور تنخواہ بہتر روپے چودہ آنے۔ آرنلڈ کو اپنے چہیتے شاگرد کا خیال آیا ہوگا جس نے فلسفے میں ایم اے کیا تھا مگر ایف اے اور بی اے میں عربی کے مضمون میں اول آتا رہا تھا جو ریڈر کی اسامی کے لیے بہت کافی تھا۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال نے اس تجویز پر کیا محسوس کیا۔

پہلی بات یہ تھی کہ وہ اُستاد بننا نہیں چاہتے تھے۔ باپ کی طرح تخیلات کے سوداگر نہیں بلکہ بڑے بھائی کی طرح میدانِ عمل کے شہسوار بننے کے خواہش مند تھے۔ اُنہیں ابھی تک اُمید تھی کہ قانون کے جس پرچے میں وہ فیل ہوئے تھے اُس میں دوبارہ کوشش کر کے کامیاب ہو جائیں گے۔ دوبارہ ناکامی کی صورت میں مقابلے کا امتحان بھی برا نہیں تھا۔ وکیل نہ بن سکے تو اسسٹنٹ کمشنر اور خدانخواستہ اُستادی ہی کرنی پڑی تو عربی کیوں؟ مولوی محمد اقبال کہلوانا نہیں چاہتے ہوں گے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی اور فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر بھی ڈھائی سو روپے ماہوار سے کم نہیں پاتے تھے اور پرنسپل کو پندرہ سو روپے ملتے تھے۔

شاید آرنلڈ نے اُنہیں یہ کہہ کر راضی کیا ہو کہ ابھی تو ایم اے کا نتیجہ بھی نہیں نکلا۔ ابھی سے ملازمت میں آ جائیں تو بعد میں آرنلڈ کے لیے اپنے اثر و رسوخ سے اُنہیں گورنمنٹ کالج میں منتقل کروانا دشوار نہ ہوگا۔ پھر تدریس کے ساتھ ساتھ وہ وکالت کے امتحان کی تیاری بھی کر سکتے تھے۔

درخواست دینے کی آخری تاریخ ۱۵ اپریل تھی۔

۲

۲۲ اپریل کو ایم اے کا نتیجہ برآمد ہوا۔ اقبال تیسرے درجے میں پاس ہوئے تھے۔ اگلے کانووکیشن میں اُنہیں میڈل ملنے والا تھا۔[۲]

۳

۲۸ اپریل کو آرنلڈ قائم مقام پرنسپل بن کر اورینٹل کالج آ گئے۔

۵ مئی کو پنجاب یونیورسٹی سنڈیکیٹ کی سب کمیٹی نے متفقہ طور پر اقبال کے تقرر کی تجویز پیش کی۔ اب سنڈیکیٹ کو اِس کی رسمی منظوری دینی تھی۔

۱۳ مئی سے اقبال نے مشروط طور پر ریڈر کا عہدہ سنبھال لیا۔

۴

اقبال کے فرائضِ منصبی یہ تھے:

(۱) کالج کی عربی تالیفات کی طباعت کا اہتمام کرنا

(۲) علوم و فنون کی کتابوں کا اُردو ترجمہ کرنا خواہ عربی سے کریں یا انگریزی سے

(۳) کالج میں پڑھانا

اقبال نے کون کون سی تالیفات کی طباعت کا اہتمام کیا یہ معلوم نہیں مگر ترجمے کے لیے اُنہوں نے سب سے پہلے جس کتاب کو منتخب کیا وہ عربی میں لکھی ہوئی ایک فلسفہ کی کتاب تھی۔

عبدالکریم الجیلی ۷۶۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۸۱۱ھ میں فوت ہوئے۔ وہ ابن عربی کے طرزِ فکر سے بہت متاثر تھے اور ان کی مشہور ترین تصنیف الانسان الکامل دراصل ابن عربی کے فلسفے کی ایک آزادانہ شرح ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اقبال اپنی تعلیم مکمل ہوتے ہی سب سے پہلے الجیلی کے نظریات کو انگریزی میں پیش کرنے کی طرف کیوں متوجہ ہوئے؟

ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بچپن میں ابن عربی کی تحریروں سے جو دلچسپی انہیں پیدا ہوئی تھی وہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی تھی اور اب رنگ لانے والی تھی۔ دوسری وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مغربی تعلیم نے فلسفے اور الٰہیات کا چسکا لگا دیا تھا۔ مابعد الطبیعیات کی مدد سے کفر و اسلام، مشرق و مغرب اور قدیم و جدید کے درمیان روابط دریافت کرنے اور ضرورت ہو تو روابط پیدا کرنے کا موقع نظر آ رہا تھا۔

۵

کالج میں اقبال بی اے (سال اول و دوم) کو تاریخ اور اقتصادیات پڑھاتے تھے جس کا نصاب یہ تھا:

Selley's *Expansion of England*

Notes on English and Indian History

Fawcett's *Political Economy*

انٹرمیڈیٹ (سالِ اول) کے لیے اُنہیں منطق کا مضمون سونپا گیا تھا۔

Ray's *Deductive Logic (Revised)* pp. 1- 100

انٹرمیڈیٹ (سالِ دوم) میں منطق کی کتاب کے بقیہ حصے پڑھانے کے ساتھ ساتھ نفسیات بھی اُن کے سپرد تھی:

Ladd's *Primer of Psychology*

اِن میں سے ہر کلاس میں ہفتے میں چھ پیریڈ یعنی اوسطاً روزانہ تین پیریڈ!

اِس نظامُ الاوقات میں جو اقبال کی پیشہ ورانہ زندگی کی پہلی دستاویز ہے اُن کے ذہن کے اُس مخصوص وصف کا عکس دکھائی دیتا ہے جو اُن کی سب سے بڑی طاقت بھی تھا اور سب سے بڑی کمزوری بھی یعنی ایک ہی وقت میں بہت سی چیزوں پر توجہ مرکوز کرنا۔ دُوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ اِن متنوع مضامین میں جو مضمون شامل نہیں وہ عربی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اورینٹل کالج میں عربی پڑھانے کی نوبت نہیں آئی۔

۶

معلوم ہوتا ہے کہ کلاس لینے سے پہلے اقبال با قاعدہ نوٹ بنایا کرتے تھے کیونکہ اُس زمانے کے چند کاغذوں پر جنہیں وہ *The Poets of the 19th Century* میں رکھ کر ہمیشہ کے لیے بھول گئے بعض ایسے موضوعات پر اُن کے نوٹ دستیاب ہوئے ہیں جنہیں وہ اُن دنوں پڑھا رہے تھے: (۱) علم النفس والقویٰ (۲) انگلستان کی حالت اُنیسویں صدی میں (۱۸۱۵ء تا ۱۸۸۸ء) (۴) بستیاں آباد کرنے کا پرانا اور نیا طریقہ (۵) تجارت اور جنگ۔ یہ نوٹ اُردو میں لکھے گئے تھے۔[۳]

۷

اقبال نے بھاٹی دروازے میں کسی میاں محمد بخش کا مکان کرائے پر لیا۔ اس علاقے میں اور بھی کئی معلم رہتے تھے جن میں سے محمد حسین آزاد ہوش و حواس سے بیگانہ گلیوں میں گھومتے دکھائی دیتے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے اگلے چھ برس میں کئی مکان تبدیل کیے مگر اب آخری دو مکانات کے سوا اور کسی کی نشاندہی ممکن نہیں ہے۔

کریم بی کو وہ اب بھی لاہور نہ لائے یا شاید اُنہوں نے ہی آنا پسند نہ کیا۔[۴] اقبال نے ایک باورچی رکھ لیا جس کا نام محمد حسین تھا۔ اُس زمانے میں جبکہ گوشت اور سبزی محفوظ رکھنے کا کوئی طریقہ نہ تھا محمد حسین ہر روز بازار سے سودا خرید کر لے آتا جس کا اہم جزو

بکری کا گوشت تھا۔ یہ اقبال کی مرغوب غذا تھی۔[۹] گائے کا گوشت نہ اُنہیں ہضم ہوتا تھا نہ وہ کھاتے تھے۔

۸

روپے ہاتھ میں آئے تو معلوم ہوا کہ خرچ کرنے کے معاملے میں اقبال بڑے بھائی کی ضد اور ماں کی طرح کفایت شعار ہیں۔

۸ جون کو انہوں نے کالج کے نوٹس والے کاغذات کی پشت پر باورچی خانے کا حساب لکھنا شروع کیا۔[۱۰]

اُس زمانے میں روپے کے سولہ آنے اور ایک آنے کے چار پیسے ہوتے تھے۔ آنے اور پیسے کا اندراج کرنے کے لیے عام طور پر علامات لکھی جاتی تھیں جو یہ تھیں:

ایک پیسہ	ایک آنہ ایک پیسہ
دو پیسے	ایک آنہ دو پیسے
تین پیسے	ایک آنہ تین پیسے
ایک آنہ (چار پیسہ)	دو آنے
عصہ	ایک روپیہ
للعہ	چار روپے

اقبال اُردو لکھتے ہوئے اُردو کے ہندسے اور انگریزی لکھتے ہوئے انگریزی کے ہندسے استعمال کرتے تھے۔

حساب نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۷ جون کو اقبال نے محمد حسین کو کچھ روپے دیے تھے جن میں سے وہ ۴ آنے ۳ پیسے کا سودا خرید کرلایا۔ اُس میں دال (۲ پیسے)، املی (۲ پیسے)، گوشت (۱ آنہ ۲ پیسے)، دہی (۲ پیسے)، لہسن (۲ پیسے)، دھنیا اور سونف (۱ پیسے) شامل تھا۔

۹ جون کو مزید خریداری ہوئی۔ شاید ۲ آنے کا گھڑا اور کونڈا خریدا ہو گیا۔ اس کے علاوہ گوشت (وہی ا آنہ ۲ پیسے)، دال چنا (ا پیسہ)، دہی (وہی ۲ پیسے)، اور سبزی (ا پیسہ) خریدی گئی جس کا کل میزان ۴ آنے ۲ پیسے بنتا تھا۔ اٹھنی محمد حسین کے ہاتھ میں آئندہ اخراجات کے لیے باقی رہنے دی گئی۔

۱۰ جون سے ۱۳ جون کا حساب اقبال نے اکٹھا لکھا۔ اس دوران ۲ پیسے کے لیمپ کی خریداری ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ابھی بجلی کی فراہمی عام نہیں ہوئی تھی۔

اِن چار دِنوں میں تین دفعہ ا آنہ ا پیسے کا گوشت خریدا گیا۔ دو دفعہ ایک ایک آنے کا دودھ، ایک دفعہ سبزی (۳ پیسہ)، مسالہ (ا پیسہ) مصری (آنہ) اور آلو (۲ پیسے) خریدے گئے۔ اِن کے بعد باورچی کے ہاتھ میں ۲ آنے باقی رہے۔ لیکن ۱۲ جون کے اندراج سے کچھ ایسا لگتا ہے کہ یہ پیسے اقبال نے کسی وقت واپس لے لیے۔

۱۴ سے ۱۳ جون کی تاریخیں اقبال نے اپنی عادت کے خلاف انگریزی ہندسوں میں درج کیں۔ اِس کے علاوہ گوشت اور سبزی (پانچ دفعہ)، قیمہ (۲ آنے کا) اور آم (۲ پیسے) خریدے گئے۔ محمد حسین کی اپنی جیب سے ۳ روپے ۲ آنے خرچ ہو گئے۔ جو اقبال نے غالباً اگلے ایک دو روز میں اُسے لوٹا دیے ہوں گے۔

۹

۲۲ سے ۲۶ جون کے درمیان اقبال نے ۱۱ آنے ا پیسہ کے سودے کا اندراج کیا جس میں چار دفعہ گوشت، تین دفعہ سبزی اور ایک دفعہ چاول کے علاوہ آم (ا پیسہ) اور گھیا (ا پیسہ) شامل تھے۔

۲۸ جون کو خاص خریداری ہوئی۔ کل ۴ روپے ۲ آنے خرچ ہوئے جن میں آٹا (ا روپیہ)، روغن زرد (ا روپیہ)، دال (۲ آنے) چاول (۸ آنے) اور مسالہ شامل تھا۔ غالباً چولہا جلانے کے لیے لکڑی (ا روپیہ) بھی آئی۔ ۸ آنے محمد حسین کو پیشگی دیے۔

بعد کا حساب کسی دوسرے کاغذ پر لکھا گیا جو دستیاب نہیں ہو سکا بلکہ زیادہ قرین قیاس

یہ ہے کہ اس کے بعد اقبال حساب لکھنے سے بیزار ہو گئے ہوں۔

۱۰

کالج جانے کے لیے وہ تانگہ استعمال کرتے ہوں گے۔

عام پنجابی نوجوانوں کی طرح وہ شلوار قمیض پہنتے تھے جس پر سردیوں میں کوٹ کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ شرفا کا ننگے سر گھومنا معیوب تصور کیا جاتا تھا لہٰذا کالج آتے ہوئے سر پر پگڑی باندھ لیتے تھے۔ حقہ نہ ملنے پر قینچی کے سستے سگریٹ اُن کا ساتھ دیتے تھے۔

گھر آ کر وہ بنیان اور دھوتی پہن لیتے اور زیادہ تر وقت مطالعہ کرتے رہتے یا پھر کبوتروں سے دل بہلاتے جن کے لیے اُنہوں نے باقاعدہ کابک بنوائے تھے۔ حقہ اس تمام عرصہ میں اُن کا لازمی ساتھی ہوتا تھا۔[7]

شام کو وہ گھر سے نکلنے یا پھر دوستوں کو گھر بلا کر گپ شپ میں وقت گزارتے۔ اب اُنہوں نے ستار بھی خرید لیا تھا۔ لاہور کے سرکردہ فقیر گھرانے کے نوجوان فقیر سید نجم الدین اُن کے خاص دوستوں میں سے تھے جو طاؤس بجانے میں مہارت رکھتے تھے۔[8]

۱۱

کالج میں تو آرنلڈ سے روزانہ کی ملاقات تھی ہی سہی۔ اب یہ مراسم اُن کے گھر تک پہنچ گئے۔

آرنلڈ کا گھرانہ اُنہیں ''حقیقی خوشیوں کا نمونہ'' نظر آتا تھا۔ مسز آرنلڈ ایک خوش اخلاق خاتون تھیں اور اُن کی چھوٹی سی بچی نینسی بھی ہنستی کھیلتی دکھائی دیتی تھی۔ ممکن ہے اقبال کو کبھی کبھی خیال آتا ہو کہ وہ اپنے لیے بھی ایسی ہی خوشیاں ڈھونڈ سکتے تھے اگر اُن کے بزرگوں کی بے جا ضد نے یہ راستہ بند نہ کر دیا ہوتا۔

بھاٹی دروازے سے ہیرا منڈی بہت دور نہیں تھی۔ اقبال فضول خرچ نہیں تھے مگر حسن اور موسیقی سے متاثر ضرور ہوتے تھے۔

غزل

تم نے آغازِ محبت میں یہ سوچا ہو گا
کس طرح کا یہ نیا چاہنے والا ہو گا

تم نے سمجھا تو ہے اس گھر کو ہمارا لیکن
اب ہمارا ہے، کوئی دِن میں تمہارا ہو گا

حشر میں کچھ تو تمہیں حسن پہ ہو گی اُمید
کچھ مرے شکوہ نہ کرنے کا بھروسا ہو گا

نامہ بر! کام تو باتوں میں ہُوا کرتے ہیں
مان جائیں گے اگر تجھ کو سلیقہ ہو گا

ہم کہیں جائیں کسی کام کو جائیں لیکن
دل یہ کہتا ہے اسی رہ سے گزرنا ہو گا

تیرے اشعار میں اقبالؔ! یہ رنگت تو نہیں
تُو نے کم بخت کسی شوخ کو تاکا ہو گا

دستیاب غزل میں آٹھ اشعار ہیں۔

۱۲

شبلی نعمانی کی کتاب الفاروق ایک طویل انتظار کے بعد ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی۔ اقبال کی نظروں سے ضرور گزری کیونکہ اگلے چند برسوں میں اُن کے خیالات پر الفاروق کا رنگ مرتب ہوتا نظر آتا ہے۔

۱۳

سوامی رام تیرتھ سے اگر کوئی معلوم کرنا چاہتا کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان تو وہ کسی صوفی

کا شعر سنا دیتے تھے۔[10]

نئے زمانے کے یہ سادھو اقبال سے چار برس بڑے تھے۔ گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے مگر نہ جانے کہاں کہاں سے ہوتے ہوئے اور پنجابی، اُردو، فارسی، انگریزی، سنسکرت، ریاضی اور ویدانت پڑھتے ہوئے لاہور پہنچے تھے۔ پہلے کرسچین کالج میں عارضی لیکچرار مقرر ہوئے مگر اُس وقت نکالے گئے جب تمام عیسائیوں کو سامنے بٹھا کر کہا، ''حضرات! ایک بار میں عیسیٰ مسیح بن کر پیغام دینے آیا تھا۔ مجھے غلط سمجھا گیا اِس لیے دوبارہ حاضر ہوا ہوں''۔

اقبال اورینٹل کالج پہنچے تو عربی اور فارسی شعبوں میں ایسی دشمنی چل رہی تھی کہ سنسکرت کے دامن میں پناہ لینی پڑی اور یوں سوامی جی سے ملاقات ہوئی۔ سنسکرت سیکھ لی اور یہ چھٹی زبان تھی جس سے باقاعدہ واقفیت حاصل ہوئی۔ چھ زبانوں کا عالم ہونا یقیناً ایک غیرمعمولی بات تھی۔ اُنہوں نے ایک دوست سے ذکر کیا کہ ہندو فلسفے کے مطالعے سے طبیعت میں ایک قسم کا سکون محسوس ہونے لگا ہے، شانتی کے معانی سمجھ میں آ گئے ہیں اور اب مذہب میں تعصب ممکن نہیں رہا۔[11]

گزر کس صنم کا ہوا بت کدے میں
کہ بت بن گئے آج سب برہمن بھی
تصور کی اے دل یہ سب خوبیاں ہیں
کہ غربت میں کرتا ہے سیرِ وطن بھی

اِس غزل کے آٹھ اشعار دستیاب ہیں۔[12]

۱۴

اُس برس عطا محمد کے کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو اُس کا نام اعجاز احمد رکھا گیا۔[13]

۱۵

اکتوبر میں آرنلڈ اورینٹل کانگریس میں شرکت کرنے روم گئے تو اگلے ماہ ایک دبلے پتلے کینیڈین کو ہمراہ لے کر واپس لوٹے۔ اِن صاحب کا نام اسٹراٹن تھا اور مستشرق تھے۔ سنسکرت اور ویدانت کے ماہر۔ اورینٹل کالج میں پرنسپل مقرر ہوئے۔

اقبال کو ویدانت کی طرف لانے میں سوامی نے کسر چھوڑی تھی تو اسٹراٹن صاحب نے پوری کر دی۔[۱۴]

۱۶

نومبر میں اقبال نے انجمن حمایت اسلام کی مجلس منتظمہ کی رکنیت اختیار کر لی۔[۱۵]

عیسائی مشنریوں کے خلاف جذبا بھی سینے میں موجزن رہا ہوگا۔

دُوسری طرف ذات برادری کے نظام پر مبنی جس معاشرے میں اقبال بڑے ہوئے تھے اُس کی یہ روایت بھی تھی کہ شرفا کسی نہ کسی سماجی تنظیم میں شرکت کر کے نمایاں ہوتے تھے۔ کم پڑھے لکھے دیہاتی گاؤں کی چوپال یا جرگے میں بیٹھتے تھے اور پنجاب کے شہروں میں سماجی تنظیمیں اور انجمنیں اس کی توسیع تھیں۔

۱۷

ناظم لکھنوی نے مرزا ارشد سے لڑ جھگڑ کر اپنی ڈیڑھ انچ کی مسجد الگ بنائی تھی۔ قلعے اور بادشاہی مسجد کے درمیان جو حضوری باغ تھا وہیں اُن کی بزمِ قیصری سجتی تھی۔ مرزا ارشد کو چھیڑنے کے لیے بزمِ قیصری میں ایک نومشق نے ارشد تخلص کر لیا۔ اُدھر مرزا ارشد کی پارٹی میں کسی شاگرد نے اپنے آپ کو ناظم کہلوانا شروع کر دیا:

اقبالؔ گر یہی ہیں حسد کی بناوٹیں
جانے مشاعرے میں ہماری بلا لگی

دستیاب غزل میں دس اشعار ہیں۔[۱۶]

۱۸

کجی جزوِ فطرت ہے اہلِ ستم کی
کبھی ہم نے خنجر کو سیدھا نہ دیکھا

دستیاب غزل میں چار اشعار ہیں۔[۱۷]

۱۹

یکم جنوری ۱۹۰۰ء!

نئی صدی کا آغاز نئی اُمنگیں لے کر آیا۔

جب پچھلی صدی کا آغاز ہوا تھا تو دنیا کے اُفق پر ایک طرف گوئٹے اور ورڈز ورتھ کے آزادی کے نغمے چھائے ہوئے تھے اور دُوسری طرف نپولین کے فاتحانہ عزائم کی گھٹا۔ اُس وقت یورپ سمجھتا تھا کہ عقلی دلائل اور سائنس کی مدد سے دنیا کے تمام مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔ آج سو سال بعد وقت کا مؤرخ پکار رہا تھا کہ عقل اور سائنس فقط پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں جو نئے مسائل کو جنم دیتا ہے۔ پیداوار اور ذرائع کی مساوی تقسیم مسائل کا اصل حل ہے۔

وقت کے مزاج سے اقبال ضرور واقف رہے ہوں گے۔ اقتصادیات میں اُن کی دلچسپی بتدریج بڑھتی نظر آتی ہے۔ معاشیات کی تدریس فرائض منصبی میں شامل نہ ہوتی تب بھی اِس مضمون میں دلچسپی لیتے مگر اب تو فوسیٹ کی کتاب کے خشک صفحات اُنہیں بڑے رنگین خواب دکھا رہے تھے۔ الجیلی کے جس مقالے پر کام کر رہے تھے وہ تصوف کے اُس ذوق کی تسکین کرتا تھا جو باپ سے ورثے میں ملا تھا مگر اقتصادیات کی کتابوں میں جو کچھ درج تھا وہ اُس حصے کے لیے ضروری تھا جو ماں کا ورثہ تھا۔ مٹی سے پیدا ہونے والی دولت کس طرح مٹی کے بنے ہوئے انسانوں کے کام آتی ہے، کس طرح چند

روپے لاکھوں کی جائداد میں بدلتے ہیں اور کس طرح ایک مفلس قوم امارات اور شکوہِ خسروی حاصل کرتی ہے یہ بہت دل کش خواب تھے چنانچہ ایک دفعہ پھر اقبال متضاد موضوعات میں ذہن لڑا رہے تھے۔ الجیلی کا نظریہ ٔتوحید اور فاسیٹ کے اقتصادی نظریات۔عربی اور ویدانت۔انگریزی اور ویدانت۔اور پھر وہ نظم جو انہیں فروری میں پڑھنی تھی۔

فروری میں انجمن حمایت اسلام کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔پیسہ اخبار والے مولوی محبوب عالم نے تجویز پیش کی تھی کہ اقبال سے نظم پڑھوائی جائے۔

۲۰

۴ جنوری کو پنجاب یونیورسٹی کا کانووکیشن گورنمنٹ کالج لاہور کے ہال میں منعقد ہوا۔ان دنوں وائس چانسلر مسٹر واکر تھے۔اقبال نے شرکت کرکے اپنی ایم اے کی سند اور رنانک بخش میڈل حاصل کیا ہوگا۔[۱۸]

۲۱

یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ اتنے بڑے جلسے میں نظم سنانے والے تھے۔یتیم خانے کی مناسبت سے ایک یتیم بچے کی فریاد لکھنے کا فیصلہ کیا جو پہلے حاضرین سے اپنا درد بیان کرے گا اور پھر رسول اللہؐ کے روضے پر فریاد کرے گا۔نظم کے آخری حصے میں رسول پاکؐ یتیم کی فریاد کے جواب میں اُمت سے خطاب کریں گے۔گویا نعت کی صنف میں ایک نئی طرح ڈالنے کا اہتمام تھا۔

نظم پوری کی پوری آمد نہ تھی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس کا مسالہ بھی مختلف ذرائع سے اکٹھا کیا ہوا لگتا تھا۔لب ولہجہ پر غالب کی گہری چھاپ تھی مگر جہاں جہاں انگریزی شاعری کے مزاج کی جھلک دکھانا چاہی تھی وہاں یہی لہجہ ایک رکاوٹ بن گیا تھا۔تھامس گرے نے اپنی مشہور *Elegy Written in a Country Churchyard* میں قبر

میں سوئے ہوؤں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

The breezy call of incense-breathing morn,
The swallow twittering from the straw-built shed,
The cock's shrill clarion or the echoing horn,
No more shall rouse them from their lowly bed.

غالباً نظم کا ایک بند لکھتے ہوئے یہ مصرعے بھی اقبال کے سامنے رہے تھے۔ مکمل ہوئی تو حکیم شہباز کے چبوترے پر سنائی گئی۔ جن بزرگوں نے رائے دی اُن میں مولوی سراج الدین بھی تھے۔ جن کا لڑکا ظفر علی خان علی گڑھ میں پڑھتا تھا۔ اُس وقت شاید اقبال کو اندازہ نہ رہا ہو کہ آگے چل کر مولوی صاحب سے زیادہ ظفر علی خان سے اُن کا ربط رہے گا۔ مولوی صاحب بھی نہیں جانتے تھے کہ اِس نوجوان شاعر کی نظمیں اُن کے خاندانی اخبار زمیندار کی زینت بنیں گی۔

۲۲

نظم مسدّس کی صورت میں تھی اور اس میں ۳۵ بند تھے۔ مسودہ مولوی محبوب عالم کے سپرد کیا گیا جنہوں نے اسے اپنے مطبع میں چھاپنے کی ذمہ داری اُٹھائی۔

انجمن کے کارکن اقبال سے واقف نہ تھے چنانچہ یہ دیکھ کر کہ وہ ایم اے کر چکے ہیں پروگرام میں اُن کے نام کے سامنے ''نظم انگریزی'' چھاپ دیا۔ دوستوں کو ہنسی آئی مگر اقبال نے کہا کہ خیر یہ لوگ خود ہی دیکھ لیں گے کہ کم از کم اِس شخص کی حالت میں انگریزی خوانی مذاقِ زبان اور علومِ مشرقیہ کے پڑھنے میں سدِ راہ نہیں بنی۔[۱۹]

۲۳

جلسہ ۲۴ فروری کو اسلامیہ کالج کے صحن میں ہوا۔ ڈپٹی نذیر احمد صدارت کر رہے تھے۔ انہوں نے لیکچر میں اِس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں کو آخرت کی فکر کے ساتھ

ساتھ دنیا میں بھی کوئی مقام حاصل کرنا چاہیے۔ مولویوں پر تنقید اس لیکچر میں بھی ٹیپ کے مصرعے کی طرح شامل تھی۔[20]

نمازِ عصر کے بعد اقبال کی نظم کا اعلان ہوا۔ نالۂ یتیم!

یوں گویا اقبال نے اپنی زندگی کی پہلی بڑی پرفارمنس کا آغاز کیا:

آہ! کیا کہیے کہ اب پہلو میں اپنے دِل نہیں
بجھ گئی جب شمعِ محفل در خورِ محفل نہیں

وہ بزرگ جنہوں نے غالبؔ کا زمانہ دیکھا تھا جان گئے کہ اسداللہ خاں نے دُوسرا جنم لیا ہے اور پنجابی لباس پہنے اُن کے سامنے کھڑا ہے۔

پیسہ اخبار کے منشی عبدالعزیز نے محسوس کیا کہ شروع کے بند سن کر لوگوں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے ہیں۔ اُنہوں نے اقبال کو ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور نظم کی کاپیاں فروخت کروانا شروع کر دیں۔ حاضرین پر تاثر قائم ہو چکا تھا۔ بڑھ چڑھ کر قیمت لگائی گئی۔ ایک روپیہ، دو روپیہ، تین روپیہ۔[21]

کچھ دیر بعد اقبال کو اشارہ ہوا کہ آگے بڑھیں۔ یتیم بچہ اپنی تنہائی کا غم بیان کرنے لگا:

آمدِ بُوئے نسیمِ گلشنِ رشکِ اِرم
ہو نہ مرہونِ سماعت جس کی آوازِ قدم
لذّتِ رقصِ شعاعِ آفتابِ صبح دَم
یا صدائے نغمۂ مُرغِ سحر کا زیر و بَم
رنگ کچھ شہرِ خموشاں میں جما سکتے نہیں
خفتگانِ کُنجِ مرقد کو جگا سکتے نہیں

بچے کو خیال آیا کہ ''داستاں جیسی ہو، ویسا سننے والا چاہیے،'' جب یتیمی کی فریاد ہے تو پھر یتیم ہاشمیؐ سے کیوں نہ ہو! اس کے بعد انجمن کا جلسہ جذبات کی ایک انوکھی انتہا پر پہنچ

گیا:

تھم ذرا بیتابیٔ دل کیا صدا آتی ہے یہ
لطفِ آبِ چشمۂ حیواں کو شرماتی ہے یہ
دل کو سوزِ عشق کی آتش سے گرماتی ہے یہ
روح کو یادِ الٰہی کی طرح بھاتی ہے یہ

ہاں ادب، اے دل بڑھا اعزاز مشتِ خاک
کا
میں مخاطب ہوں جنابِ سید لولاکؐ کا

رسولِ پاکؐ اپنے روضے سے فرما رہے تھے، ''انجمن لاہور میں اک حامیٔ اسلام ہے،'' بچہ اُس انجمن کے اجلاس میں جائے جہاں ''جمع ہیں عاشق مرے سب' ہند اور پنجاب کے،'' اُن عاشقوں کو وہ محبوبؐ کا پیغام دے:

جس طرح مجھ کو شہید کربلا سے پیار ہے
حق تعالیٰ کو یتیموں کی دعا سے پیار ہے

تھی یتیمی کچھ ازل سے آشنا اِسلام کی
پہلے رکھی ہے یتیموں نے بنا اِسلام کی
کہہ رہی ہے اہلِ دِل سے ابتدا اِسلام کی
ہے یتیموں پر عنایت انتہا اِسلام کی

تم اگر سمجھو تو یہ سَو بات کی اِک بات ہے
آبرو میری یتیمی کی تمہارے ہات ہے

ابتدا اور انتہا کے متضاد الفاظ کو جس طرح اکٹھا کیا گیا تھا اُس نے کم پڑھے لکھے، اَن پڑھ اور عالم سب کو یکساں متاثر کیا ہو گا۔ نظم کے دوران تین سو روپیہ چندہ جمع ہو گیا۔

تمام کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں۔ گیلری میں بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے نے ایک کاپی سولہ رُوپے میں خریدی۔ وہ تو خیر اقبال کے والد ہی تھے مگر دوسروں نے بھی چار چار روپے تک خرچ کر دیے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے کہا، ''میں نے دبیر اور انیس کی بہت نظمیں سنی ہیں مگر واقعی ایسی دل شگاف نظم کبھی نہیں سنی!'' یہ یہ مطلب نہ تھا کہ نوجوان شاعر اُن بزرگوں سے آگے بڑھ گیا۔ بات یہ تھی کہ اقبال نے ایک تاریخی فضا قائم کرنے کے بعد سننے والوں کو نظم کی کہانی کا مرکزی کردار بنا دیا تھا۔ نظم کی خوبی یہی تھی کہ سننے والوں کا چندہ دینا اِس جمالیاتی شہ پارے کا حصہ اور اس کی تکمیل بن گیا تھا۔

عوام کے بیحد اصرار پر اگلے روز پوری نظم دوبارہ سنائی گئی۔[22]

۲۴

صوتی اعتبار سے غالبؔ کے یہاں ہندی آوازیں مثلاً بھ۔ گھ۔ کھ بہت کم ہیں چنانچہ لب و لہجے سے تمکنت اور وضعداری کا احساس پیدا ہوتا ہے[23] مگر دوسری طرف اُن کے یہاں طویل مصوتوں مثلاً آ۔ اے۔ ہو وغیرہ کی کمی لہجے میں دھیما پن پیدا کرتی ہے:

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

اِن کے برعکس میرؔ کے کلام میں طویل مصوتوں کا استعمال زیادہ ہوا ہے جس کی وجہ سے اُن کا لہجہ بلند ہے مگر ہندی آوازوں کا کثرت سے استعمال اُسے عام لوگوں کی بول چال سے قریب لے آتا ہے۔

غالبؔ کے زیرِ اثر اِقبال کا مزاج بھی ہندی آوازوں سے گریزاں ہو گیا مگر طویل مصوتوں کی کثرت بھی تھی جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ ابتدا ہی سے مجمعوں میں سنانے کے لیے اشعار لکھنے لگے تھے اور اُس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر میسر نہیں تھا۔ بہر حال اقبال

کے اس منفرد لہجے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں تمکنت اور شوکت بھی ہے اور عوام تک پہنچنے والی لمبی لمبی تانیں بھی۔

۲۵

انجمن کا جلسہ لُوٹ کر کم از کم اُردو بولنے والوں کے لیے اقبال بھی بادشاہی مسجد اور شالامار باغ کی طرح لاہور کے نوادرات میں شامل ہو گئے۔

اُن کے نئے مداحوں میں میاں شاہ دین ہمایوںؔ شامل تھے جنہوں نے سات سال پہلے اقبال کا انٹرنس کا پرچہ بنایا تھا۔ ہمایوںؔ کے چچازاد میاں محمد شفیع سے بھی اقبال کی گہری دوستی ہو گئی۔

۲۶

مارچ میں الجیلی کے رسالے کا ترجمہ مکمل ہوا۔[۴۳]

۳۱ مارچ کو کالج کی سالانہ رپوٹ میں اِس کا تذکرہ آیا اور اقبال کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ دلچسپ بات تھی کہ الجیلی نے اپنی کتاب کا عنوان الانسان الکامل رکھا تھا مگر اقبال نے انگریزی میں اس کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے اسے توحیدِ مطلق کا بیان قرار دیا:

The Doctrine of Absolute Unity As Propounded by Abdul Karim Al Jili

۲۷

توحیدِ مطلق

خالص اور سادہ جوہر وہ چیز ہے جسے نام اور صفات دیے گئے ہیں۔ یہ جوہر موجود ہے خواہ اس کا یہ وجود واقعی ہو یا خیالی۔ جو موجود ہے اُس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) وجودِ مطلق یا وجودِ خالص، یہ خدا کی ذات ہے۔

(۲) وجود جو عدم سے ملا ہوا ہے، تخلیق یا فطرت۔

خدا کے جوہر یا فکرِ خالص کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ الفاظ اُسے بیان نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ہر تعلق سے بالاتر ہے اور علم تعلق ہی تو ہے۔ انسانی سوچ بے کراں خلاؤں میں سے پرواز کرتی ہوئی ناموں اور صفات کے پردے میں سے گزر جاتی ہے۔ وقت کے وسیع کرّہ کو عبور کر لیتی ہے۔ عدم وجود کی سلطنت میں داخل ہوتی ہے اور وہاں فکرِ خالص کے جوہر تک پہنچ جاتی ہے جو اس طرح ملتا ہے کہ عدم کے اندر موجود ہے، تضادات کا مجموعہ! اس فکرِ خالص کے جوہر (حادثات) دو ہیں: تمام گزرے ہوئے وقت میں حیاتِ ازلی اور تمام آنے والے وقت میں حیاتِ ازلی۔ اس کی دو صفات ہیں، خدا اور مخلوق۔ اس کی دو تعریفیں ہیں، وہ جسے تخلیق نہیں کیا جا سکتا اور وہ جسے تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ اس کے دو نام ہیں، خدا اور انسان۔ اس کے دو چہرے ہیں، ظاہر (یہ دنیا) اور باطن (اگلی دنیا)۔ اس کے دو اثرات ہیں ضرورت اور امکان۔ اس کے دو نقطہ ہائے نظر ہیں، پہلے نقطۂ نظر سے یہ اپنے لیے غیر موجود اور باقی سب کے لیے موجود ہے۔ دُوسرے نقطۂ نظر سے یہ اپنے لیے موجود اور باقی سب کے لیے غیر موجود ہے!

نام، ابن الجیلی کہتا ہے، اُس کو سمجھ میں بٹھا دیتا ہے جس کا وہ نام ہوتا ہے۔ نام اُس کی تصویر ذہن میں بناتا ہے، اُس کو تخیل میں پیش کر دیتا ہے اور یادداشت میں باقی رکھتا ہے۔ نام گویا اُس چیز کا بیرونی چھلکا ہوتا ہے جس کا نام لیا جاتا ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)[۲۵]

ابن الجیلی کا بقیہ فلسفہ انسان کو نام سے حقیقت یا خدا کی طرف لے جانے کے طریقوں پر مشتمل تھا جنہیں تصوف کی اصطلاح میں تنزیلاتِ ستہ کہا گیا تھا یعنی خدا کے مقام سے انسان تک پہنچنے میں چھ قدم نیچے اترنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور انسان کے مقام سے خدا تک پہنچنے کے لیے چھ قدم اوپر اٹھنا پڑتا ہے۔

یوں ان چھ سطحوں کے درمیان پانچ مقامات کا تعین کیا جا سکتا تھا جن پر تقریباً ہر مذہب اور علم الکلام کسی نہ کسی حد تک متفق تھا۔ اسلامی روایت میں اس نظام کی ایک مکمل صورت بارہویں صدی عیسوی کے فارسی شاعر نظامی گنجوی کے یہاں دکھائی دیتی تھی جنہوں نے پانچ منظوم کتابوں یعنی خمسہ میں یہ نظام بین السطور پیش کیا۔ ان میں سے کچھ کہانیاں تو ایسی مشہور ہوئیں کہ بچہ بچہ ان سے واقف تھا مثلاً لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، اسکندر ذوالقرنین اور خواجہ خضر کے کردار اگرچہ پہلے سے ادب میں موجود تھے مگر انہیں شہرۂ عام نظامی کے خمسہ ہی سے ملا۔

خود نظامی نے کہیں بھی اپنے نظام الاسرار کی شرح نہیں کی تھی مگر بعد میں آنے والوں نے اسے صاف محسوس کیا اور ان کے خمسہ کو سمجھنے کے لیے وہ نظام وضع کیا جو اگلی صدی میں مزید کھل کر پانچ مقامات کی صورت میں بیان ہوا:

☆ انسان کی ظاہری دنیا جس میں ہم ہیں
☆ فرشتوں کی دُنیا
☆ روح کی دنیا جس کی ایک سطح کا تعلق خواب اور تخیل سے ہے
☆ صفاتِ الٰہی جو اس زندگی میں انسان کی دسترس سے باہر ہے
☆ وہ عالم جہاں خدا کے سوا کسی کی پہنچ نہیں

عجیب بات تھی کہ نظامی نے اتنی عظیم الشان دنیا تعمیر کی مگر اُس کے راز ظاہر کیے بغیر اُسے آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑ گئے! بہر حال اگلی نسل میں ابن عربی کے یہاں یہ نظامِ فکر اپنی مکمل شرح کے ساتھ نظر آیا جبکہ مولانا روم کی شاعری نے ان بنیادوں کو نظامی سے پچھلے شاعروں سنائی اور عطار کی طرز پر آگے بڑھایا۔ عبدالکریم الجیلی جو ان بزرگوں کے بہت بعد میں آئے اُنہوں نے ابن عربی کے حوالے سے اسی نظام الاسرار کی مبسوط شرح لکھی جسے اب اقبال اپنے الفاظ میں دوبارہ بیان کر رہے تھے۔

۲۸

منشی محبوب عالم یورپ کے سفر پر روانہ ہونے والے تھے۔

۲۵ مئی کو اُن کے دوستوں کی طرف سے الوداعی جلسہ ہوا جس میں اقبال بھی مدعو تھے اور احمد حسین خاں بھی۔ دونوں نظمیں لکھ کر لائے مگر صرف احمد حسین خاں نے اپنی نظم سنائی۔ کھانے کے بعد حاضرین اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے اور جب پندرہ بیس افراد رہ گئے تو اقبال نے اپنی ۴۸ اشعار کی نظم 'خدا حافظ' نکالی:

ہو نہ محبوب سے جدا کوئی
اے رگِ جانِ عالم آرائی[۲۶]

نظم ترکیب بند میں تھی لیکن اقبال نے جدت یہ کی کہ پہلے بند سے بھی پہلے ٹیپ کی ایک بیت لگا دی۔ پہلے بند میں نواب مرزا شوق کی مثنوی زہرِ عشق کے ایک شعر پر گرہ لگائی اور دُوسرا بند غالب کے اُس مشہور قصیدے کی زمین میں تھا جس میں یہ شعر ہے:

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ پاک
اِس کو کہتے ہیں عالم آرائی

۲۹

۶ جون کو اقبال نے چیف کورٹ پنجاب کے رجسٹرار کے نام درخواست لکھی کہ اُنہیں دوبارہ کلاسیں پڑھے بغیر دسمبر میں ہونے والے قانون کے امتحان میں بیٹھنے دیا جائے۔[۲۷]

۱۴ جون کو یہ درخواست دفتر کی اگلی میز پر کھسک گئی۔ دو دن بعد اس پر لکھا گیا ''کیا ۱۸۹۸ء کے امتحانات اب تک آخری تھے؟'' اور درخواست کھسک کر واپس پہلی میز پر آ گئی۔ پہلی میز والے نے اسی وقت لکھا... ''نہیں' آخری دفعہ ۱۸۹۹ء میں امتحان ہوئے تھے' اور اُسے دوبارہ آگے بھیج دیا۔

دو روز بعد میز نمبر دو والے صاحب نے اپنا فیصلہ لکھ دیا جس کی روشنی میں ۲۱ جون کو چیف کورٹ کے کسی ٹائپسٹ نے مسٹر محمد اقبال ایم اے کے نام جوابی خط رقم کیا اور رجسٹرار صاحب نے اپنے دستخط کر دیے:

...I am desired by the judge to inform you that your application has been refused.

وہ دوبارہ کلاسیں پڑھے بغیر قانون کے امتحان میں نہیں بیٹھ سکتے تھے۔

۳۰

یہ شعلوں میں پلی ہے بجلیوں کے ساتھ کھیلی ہے

غالباً یہ بھی کوئی مصرع طرح تھا جس پر اقبال گرہ نہ لگا سکے اگرچہ غزل کے تین اور اشعار ہو گئے:

سمجھ میں آ گئی تیرے پہیلی رازِ قدرت کی
مگر یہ بھی کبھی سوچا ہے تُو خود بھی پہیلی ہے[۴۸]

۳۱

داغ نے ایک دعویٰ کیا:

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اقبال کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ یہ غزل اُسی زمانے میں لکھی ہو گی:

پاس ہیں اور ڈھونڈتے ہیں اُسے
کتنے غافل جہان والے ہیں
دَب کے رہتے نہیں کسی سے بھی

جو زمانے میں آن والے ہیں
میرے دل کے مکان میں رہنا!
آپ تو لامکان والے ہیں
کہہ رہے ہیں مَلَک "یہ اہلِ زمیں
کتنی اونچی اُڑان والے ہیں"
تجھ کو اقبالؔ اُن سے کیا نسبت
دِلّی والے زبان والے ہیں[۴۹]

۳۲

شہر میں جوگی کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ جولائی میں اقبال کو اُسے رُخصت کرنا پڑا۔ اس دفعہ سوامی نے ہمالہ کی ترائیوں کا ارادہ کیا تھا۔

سوامی جی کو اپنے سفر میں قصے کہانیوں کے روایتی سادھوؤں جیسے بہت سے واقعات پیش آیا کرتے تھے۔ شری کرشن کی محبت میں کالے رنگ سے عشق تھا۔ ایک مرتبہ راستے میں کالا ناگ دیکھا تو خوش آمدید کہنے دوڑ پڑے، "میرے پربھو..تو جس روپ میں بھی نظر آئے!"

کہیں اور ٹھہرے تو قریب کی مسجد میں کبھی کبھی قرآن کی تلاوت کر دیتے۔ لوگ عرصہ تک مسلمان سمجھتے رہے۔

۳۳

جن دنوں سوامی جی ہمالہ کے چشموں اور آبشاروں سے قدرت کے بھید پوچھ رہے تھے اقبال اپنی محنت کے حاصل کو مطبوعہ شکل میں دیکھ کر آنکھیں روشن کر رہے تھے۔ عبدالکریم الجیلی کا انسانِ کامل والا مقالہ بمبئی کے رسالے *Indian Antiquary* میں ستمبر میں شائع ہوا تھا۔ یہ اُن کا پہلا علمی اور تخلیقی کارنامہ تھا جو زیورِ طباعت سے

آراستہ ہوا تھا۔ اُن کی اپنی حد تک فلسفے کی دُنیا میں ایک بہت بڑا اقدم!

اِس دوران اقبال واکر کی کتاب پولیٹکل اکانومی کا ترجمہ شروع کر چکے تھے مگر وہ اقبال ہی کیا جو ایک وقت میں ایک کام کر کے خوش ہو جاتا۔ چنانچہ اسٹبز کی تاریخی کتاب Early Plategenets کا ترجمہ بھی جاری تھا۔[30]

۳۴

لاہور کے حلقے میں اقبال کو جن لوگوں سے ارادت تھی اُن میں سے ایک اہم نام اکثر سوانح نگار نے نظر انداز کیا ہے۔ یہ پیرزادہ محمد حسین عارف تھے جن کی زندگی کے بعض حالات اقبال سے اِس حد تک مماثل ہیں کہ خیال آتا ہے اقبال نے اُن سے خاص رہنمائی حاصل کی ہوگی۔

پیرزادہ عارف اقبال سے اکیس سال بڑے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے پہلے ایم اے فارسی تھے اور محمد حسین آزاد کے شاگرد تھے۔ اقبال کی طرح یہ بھی اورینٹل کالج لاہور کے مدرس رہے مگر شعبہ اُردو کے صدر کی حیثیت میں۔ فلسفہ اور ریاضی بھی پڑھائی اور قانون دانی میں بھی دخل تھا۔ زندگی میں انقلاب اُس وقت آیا جب ۱۸۸۵ء میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کا امتحان پاس کر کے اِس معزز منصب پر فائز ہوئے۔ پھر سیشن جج ہو کر فیروزپور چلے گئے جہاں مرزا ارشد گورگانی سے شعر میں اصلاح لینے لگے۔ غالباً مرزا ارشد ہی کے ذریعے اقبال اِن سے متعارف ہوئے ہوں گے۔ ان دنوں مثنوی مولانا روم کی حکایات کا عقدِ گوہر کے نام سے اصل بحر میں ترجمہ کر رہے تھے۔ دیگر احباب کے علاوہ اقبال سے بھی تاریخِ طباعت نکالنے کے لیے کہا۔

اقبال نے مادۂ تاریخ نکالا، ''حقا یہ نظم موجِ شرابِ طہور ہے'' مگر تمام حروف ابجد کے حساب سے جمع کرنے پر شمار ۱۹۰۱ بنتا تھا جبکہ سال ۱۹۰۰ء چل رہا تھا چنانچہ اس سے پہلے یہ مصرع لکھا:

ہاتف نے دی صدا سرِ اعدا کو کاٹ کر

''سر اعدا'' سے مراد لفظ ''اعدا'' کا پہلا حرف یعنی الف تھا جس کا عدد ایک تھا۔ اسے کاٹنے سے مراد یہ تھی کہ مصرعِ تاریخ میں سے ایک منہا کر دیا جائے۔ اس طرح سالِ اشاعت ۱۹۰۰ء نکل آتا تھا۔ اس سے پہلے کتاب کی تعریف میں دو اشعار لکھ کر قطعۂ تاریخ مکمل کیا۔ پھر دو قطعاتِ تاریخ فارسی میں بھی لکھ کر پیش کر دیے۔[۳۱]

اِس کے ساتھ ہی خود بھی ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے امتحان کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔[۳۲]

۳۵

اکتوبر ۱۹۰۰ء کی سب سے افسوسناک خبر یہ تھی کہ امیر مینائی انتقال کر گئے ہیں۔ اپنے وطن لکھنؤ سے کوسوں دُور حیدر آباد دکن میں تھے۔

۳۶

نئے لکھنے والوں میں بیس سالہ سجاد حیدر یلدرم کا نام ابھی بہت مشہور نہیں ہوا تھا مگر معارف میں ان کے جو مضامین اب تک شائع ہوئے تھے ان کے موضوعات نے شاید اقبال کو متوجہ کیا ہو۔ 'مسئلہ ازدواج پر تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات'، 'انگریزی لٹریچر اور ہندوستانی مسلمان' وغیرہ کے علاوہ ابھی تین ماہ پہلے اگست کے شمارے میں چھپنے والا مضمون 'مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ' اندازِ تحریر کی شگفتگی اور پرانی طرزِ معاشرت کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی مصنوعی مروّت کے خلاف احتجاج کی وجہ سے نئی نسل میں مقبول ہو رہا تھا۔

اکتوبر کے شمارے میں ترکی افسانہ نگار مفاخر بے کے ایک افسانے کا ترجمہ یلدرم کے قلم سے 'نشے کی پہلی ترنگ' کے عنوان سے شائع ہوا۔

اقبال کے نزدیک آرنلڈ کی یہ بھی خوبی رہی ہوگی کہ جدید اُردو نظم کے مسائل کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اقبال کو مشورہ دیا کہ انگریزی نظم کی خصوصیات کو کامیابی سے اُردو میں منتقل کرنے کے لیے پہلے بچوں کی نظموں پر طبع آزمائی کی جائے۔[۳۳]

اقبال نے جو نظمیں منتخب کیں اُن میں امریکی شاعر ایمرسن اور انگریز شاعر ولیم کوپر کے علاوہ بعض ایسی شاعرات بھی شامل تھیں جن کی نظمیں خاص طور پر بچوں کے لیے ہوتی تھیں۔ اُنہی دنوں بچوں کے لیے کچھ طبع زاد نظمیں بھی ہوگئیں جن میں حالؔی کا اثر زیادہ نمایاں تھا مثلاً حالؔی کا مشہور شعر ہے:

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

اسی ترنگ میں اقبال نے بچوں کی نظم 'محنت' شروع کی ہوگی:

وہی لوگ پاتے ہیں عزت زیادہ
جو کرتے ہیں دنیا میں محنت زیادہ

اور ایک دوسری نظم 'بچوں کے لیے چند نصیحتیں' میں حالؔی کا وہی شعر لفظی ردوبدل کے ساتھ شامل کر دیا:

دیکھنا آپس میں پھر نفرت نہ ہو جائے کہیں
اس قدر حد سے زیادہ بھی نہ ملت چاہیے

انگریزی نظموں کے ترجمے میں اُنہیں کامیابی ہوئی۔ میلڈا بیتھم کی نظم تھی 'A Child's Hymn' جس کا پہلا بند تھا:

God make my life a little light,
within the world to glow.
A little flame that burneth bright,

wherever I may go.

اقبال نے پوری نظم کا ترجمہ کیا جو یوں شروع ہوتا تھا:

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دُور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے[۳۴]

۳۷

اقبال کے بارے میں یہ تبصرہ نہایت دلچسپ ہے کہ جب ہم اقبال کو پڑھتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے، ''اُستاد جیسے کچھ بتا رہا ہے۔ کچھ ڈانٹتا بھی جاتا ہے۔ ہم سے کچھ شکایت بھی ہے۔ کچھ محبت بھی ہے۔ شفیق اُستاد ہے مگر اُستادوں کی طرح سے ذرا سختی بھی مزاج میں ہے کہ ہم کس طرح صحیح راستے سے بھٹک گئے ہیں لیکن...ایک فاصلہ برقرار رہتا ہے...اقبال کے کلام میں اگر بچہ بھی ہے تو وہ کہہ رہا ہے کہ میرے دم سے دُنیا کا اندھیرا دُور ہو جائے اور دُنیا میں اُجالا ہو جائے!''[۳۵]

باب ۷

ہمالہ

۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۲ء

۱

گورنمنٹ کالج لاہور میں اقبال کے اُستاد لالہ جیارام ایک مہینہ کی چھٹی پر چلے گئے اور قائم مقام اسسٹنٹ پروفیسر فلسفہ کی گنجائش نکل آئی۔ اقبال یکم جنوری ۱۹۰۱ء کو غالباً آرنلڈ کی مہربانی سے وہاں متعین ہو گئے۔ تنخواہ دوسو روپے ماہوار!

اِس کلاس کے ایک طالب علم چوہدری نبی احمد کا بیان ہے، ''مسلمان طلبہ... ہندو، سکھ اور عیسائی طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر اپنے پیغمبر کا ذکر دوسرے مذہبی رہنماؤں کے مقابلہ میں کرنے ہوئے جھجکتے تھے۔ مسلم طلبہ کی گفتگو اس موضوع پر اول تو مختصر ہوتی تھی۔ پھر اندازِ گفتگو میں مصلحت شناسی کی جھلک پائی جاتی... اقبال ہی کی بدولت مسلم طلبہ میں یہ اخلاقی جرات پیدا ہوئی کہ وہ معذرت آمیز انداز کے بجائے کھل کر پوری جرات سے اسلام کی جامعیت اور اپنے نبی کی عظمت بیان کرنے لگے...''[۲]

فروری میں لالہ جیا رام تو واپس آ گئے مگر اقبال کے دوست شیخ عبدالقادر جو اسلامیہ کالج میں ایف اے کی جماعتوں کو انگریزی ادب پڑھاتے تھے رخصت پر چلے گئے۔ اقبال واپس اورینٹل کالج جانے کی بجائے اسلامیہ کالج آ گئے۔ حکیم شجاع الدین اسی جماعت میں پڑھتے تھے۔ اُنہوں نے اقبال کا طریقہ تدریس قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ چوہدری نبی احمد نے جس اخلاقی جرات کا ذکر کیا ہے وہ طلبہ میں کیونکر پیدا ہوئی ہوگی۔

''نصاب میں Seekers of God کے نام سے ایک کتاب شامل تھی جس میں

زمانہ قبل از مسیح کے تین حکماء کی سرگذشتیں درج تھیں۔ عیسائی مصنف نے ان متلاشیانِ حق کے بعض اقوال کا موازنہ انجیل کی آیات سے کیا لیکن (اقبال) نے کلامِ پاک کی اُن آیات سے اِن اقوال کی تشریح کی جو اُن کے ساتھ مطابقت رکھتی تھیں۔ موازنہ کے دوران آپ یہ بھی ثابت کرتے جاتے تھے کہ قرآن کی آیات ان اقوال سے بدرجہا افضل اور بہرنوع اکمل ہیں۔"[۳]

۲

میاں شاہ دین ہمایوں نئی طرزِ شاعری کے دلدادہ تھے۔ یورپ سے واپسی کے بعد سے تو باقاعدگی کے ساتھ نظمیں کہنے لگے تھے اور نوجوانوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ اُن کی تحریک پر احمد حسین خاں اور مدن گوپال نے ایک لٹریری سوسائٹی کی بنیاد رکھی اور انارکلی بازار کے شروع میں ایک مقام منتخب کر کے نظموں کے مشاعروں کا منصوبہ بنایا۔ پہلے مشاعرے کا عنوان تجویز ہوا 'ہمالہ'۔[۴]

اتفاق سے سوامی رام تیرتھ ہمالہ کی گھاٹیوں میں سنیاس لے کر واپس آئے تھے۔[۵] ہمالہ کی فضا اور قدرتی مناظر اُن کی رُوح میں سمائے ہوئے تھے۔ وہ گھنٹوں اقبال کے پاس بیٹھے ہمالہ کا نقشہ کھینچتے رہتے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس معلومات نے اقبال کو نظم کے لیے کافی مواد فراہم کیا۔ خود اُنہوں نے پہاڑ نہ دیکھے تھے مگر سوامی کی سیریوں ہی تھی جیسے اقبال خود ہمالہ کی گھاٹیوں سے ہو آئے ہوں۔ باقی کسر پوری کرنے کے لیے تخیل بہت تھا۔

نظم ہوگئی مگر اقبال اُس کی بندش سے مطمئن نہ تھے۔ نظرِ ثانی کی طرف طبیعت مائل نہ ہوئی چنانچہ اگلے بائیس تیئیس برس تک اِس نظم کی جو صورت لوگوں کے سامنے رہی وہ حتمی نہ تھی بلکہ نظرِ ثانی کی محتاج تھی البتہ اُس متن میں بھی دو نکات خاص طور پر توجہ کے قابل تھے۔

اقبال اب تک خوبصورت مناظر کو کشمیر سے منسوب کرتے رہے تھے مگر اس نظم میں کشمیر کا ذکر نہیں کیا اگرچہ موقع موجود تھا۔ اس کی بجائے ہمالہ کو ''دیوارِ ہندوستاں'' کہا اور اسی حوالے سے اپنا پاسباں قرار دیا۔ یہ تصور اُن کی شاعری کا مستقل موضوع بن کر کئی مراحل سے گزرا۔

اِس کے علاوہ بدھ مذہب کی تعریف کرتے ہوئے اُنہیں ''نفی ہستی'' کی اصطلاح استعمال کرنی پڑی تھی۔ مادی دنیا سے بلند ہو کر روح کے ذریعے اپنی ذات کو وسیع کرنے کے لیے روایتی طور پر اسی قسم کے تصورات رائج تھے لیکن اگر تاریخی حقیقت کو فلسفیانہ خیالات کی کسوٹی سمجھا جائے تو اُس زمانے کے حقائق اس روایتی تصور میں ترمیم کا تقاضا کر رہے تھے جس سے اقبال بے خبر نہ تھے۔ مادی سطح سے بلند ہوئے بغیر شخصیت کی تعمیر ممکن نہیں اور اس کے لیے کسی نہ کسی صورت میں اپنی ہستی کو مٹانا بھی پڑتا ہے مگر کیا اسے نفی ہستی کہنا مناسب ہو گا؟ اقبال کو کسی متبادل تصور کی تلاش تھی جو مشرق میں موجود تھا نہ مغرب میں۔

اِس کے علاوہ نظم میں بعض مقامات ایسے تھے جو ادبی اعتبار سے اقبال کو کھٹکتے ہوں گے مثلاً ایک جگہ انہوں نے ہمالہ کے دامن میں بہتی ندی کے بارے میں کہا تھا، ''کوثر و تسنیم کی مانند لہراتی ہوئی۔'' یہ مصرع کہنے کا جواز تب ہو کہ شاعر نے کوثر و تسنیم کا لہرانا اپنی آنکھوں سے دیکھ رکھا ہو چنانچہ اِس قسم کے مقامات پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت تھی۔

ہمالہ

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں!
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ پہ کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں

تو جواں ہے دورۂ شام و سحر کے درمیاں
تیری ہستی پر نہیں بادِ تغیر کا اثر
خندہ زن ہے تیری شوکت گردشِ ایام پر

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تُو
پاسباں اپنا ہے تُو، دیوارِ ہندوستاں ہے تُو
سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تُو
مطلعِ اوّل فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تُو
برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر

سلسلہ تیرا ہے یا بحرِ بلندی موجزن
رقص کرتی ہے مزے سے جس پہ سورج کی کرن
تیری ہر چوٹی کا دامانِ فلک میں ہے وطن
چشمۂ دامن میں رہتی ہے مگر پرتوفگن
چشمۂ دامن ہے یا آئینۂ سیال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لیے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کوہسار نے
اے ہمالہ! کوئی بازی گاہ ہے تُو بھی جسے
دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے
ہائے کیا جوشِ مسرّت میں اُڑا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اُڑا جاتا ہے ابر

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی

جھومتی ہے کیا مزے لے لے کے ہر گل کی کلی
یوں زبانِ برگ سے کہتی ہے اس کی خامشی
دستِ گل چیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی
کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

نہر چلتی ہے سرودِ خامشی گاتی ہوئی
آئنہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی مانند لہراتی ہوئی
ناز کرتی ہے فرازِ راہ سے جاتی ہوئی
چھیڑتا جا اس عراقِ دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلیِ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا
دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

وہ اُچھالی پنجۂ قدرت نے گیند اک نور کی
جھانکتا ہے وہ درختوں کے پرے خورشید بھی
دل لگی کرتی ہے ہر پتے سے جس کی روشنی
میرے کانوں میں صدا آئی مگر کچھ اور ہی
دل کی تاریکی میں وہ خورشیدِ جاں افروز ہے

شمعِ ہستی جس کی کرنوں سے ضیا اندوز ہے

وہ اصولِ حق نمائے نہیِ ہستی کی صدا
رُوح کو ملتی ہے جس سے لذتِ آبِ بقا
جس سے پردہ رُوئے قانونِ محبت کا اُٹھا
جس نے انساں کو دیا رازِ حقیقت کا پتا

تیرے دامن کی ہواؤں سے اُگا تھا یہ شجر
بیخ جس کی ہند میں ہے چین و جاپاں میں ثمر

تُو تو ہے مدت سے اپنی سرزمیں کا آشنا
کچھ بتا اُن رازدانانِ حقیقت کا پتا
تیری خاموشی میں ہے عہدِ سلف کا ماجرا
تیرے ہر ذرے میں ہے کوہِ الپس کی فضا

ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے

اے ہمالہ! داستاں اُس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اُس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

آنکھ اے دل کھول اور نظارۂ قدرت کو دیکھ
اِس فضا کو اِس گل و گلزار کی نکہت کو دیکھ
اپنی پستی دیکھ اور اِس کوہ کی رفعت کو دیکھ

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

اِس خموشی میں سرورِ گوشۂ عزلت کو دیکھ

شاہدِ مطلب ملے جس سے وہ ساماں ہے یہی

دردِ دل جاتا رہے جس سے وہ درماں ہے

یہی'

۳

مشاعرے میں احمد حسین بھی اپنی ہمالہ لائے تھے مگر اس دفعہ اقبال نے میدان مارلیا

۔

اقبال کی نظم میں ہر چیز متحرک تھی اور ایک نغمگی کے ساتھ زندگی کے راستے پر رواں دواں تھی جس کی وجہ سے لگتا تھا کہ شاید گزری ہوئی زندگی کا ماجرا سنانے کے لیے ہمالہ بھی سچ مچ بول اُٹھے گی یا وقت کی گردش بھی دوبارہ پیچھے کی طرف دوڑنے لگے گی۔ اقبال مدت سے جس اسلوب کی تمنا کر رہے تھے وہ اب اُن کی گرفت میں تھا۔

۴

بہت سے ہندوستانی افریقہ کے ممالک مثلاً جنوبی افریقہ وغیرہ میں کام کرنے جاتے تھے جہاں برطانوی سرمایہ دار مقامی لوگوں کو تہذیب سکھا رہے تھے اور اُن کا سونا چاندی انگلستان بھیج رہے تھے۔ اقبال نے ایک پنجابی مزدور کا تصور کیا جو ڈربن کے ساحل پر خواب میں راوی کے کنارے اپنا ٹوٹا ہوا گھر دیکھ رہا تھا:

جہاں محنت ہم آغوشِ کفایت ہو کے رہتی تھی

قناعت خانہ پرورِ محبت ہو کے رہتی تھی

جہاں چرخے کی خواب آور صدا پردہ تھی

آہوں کا

'مزدور کا خواب' میں ہیئت کا تجربہ کر رہے تھے یعنی مثنوی کی طرز پر دو تین اشعار کے

بعد بند کا اختتام کسی شعر کی بجائے تنہا مصرعے پر ہوتا تھا۔ تیسرے بند سے آگے نہ لکھا گیا اور تجربہ ادھورا رہا۔ ؎

۵

پچاس برس سے زیادہ عرصے سے ملکہ وکٹوریہ انگلستان پر حکومت کر رہی تھی اور ہندوستان والے تو اُن کے بغیر انگریز کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ پچھلی صدی میں غدر کے بعد جب کمپنی کے ظلم وستم کا بازار گرم ہوا تھا تو ملکہ وکٹوریہ ہی کے فرمانِ عالی سے رعایا نے جان و مال کی امان حاصل کی تھی۔

۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کو عید الفطر تھی۔ تار کے ذریعے یہ خبر پہلے لندن سے کلکتے اور پھر پورے ہندوستان میں پھیل گئی کہ ملکہ وکٹوریہ انتقال کر گئی ہیں۔

۶

تقریباً چار سال پہلے مسلمانوں کی طرف سے ملکہ وکٹوریہ کو سپاس نامہ پیش کرنے کی تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے میر حسن نے کہا تھا کہ یہ ایسا شاندار ہو جس سے معلوم ہو جائے کہ کل کی فاتح قوم نے آج کی ملکہ کو پیش کیا ہے۔ کچھ ایسا ہی جذبہ اقبال کے دل میں کارفرما دکھائی دیتا ہے جب وہ ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ لکھ رہے تھے جسے صرف دو تین روز بعد مسلمانوں کی طرف سے ایک تعزیتی جلسے میں پڑھا جانا تھا۔

یہ تجربہ اُن کی تخلیقی صلاحیت کو ایک انوکھی انتہا پر لے گیا۔ آخر اُس قوم کے فرزند تھے جس نے تاج محل بنایا تھا۔ اب وہ وسائل نہ سہی مگر ایسی نظم ضرور تعمیر کر سکتے تھے جو دُنیا بھر کے تعزیتی پیغامات میں ممتاز دکھائی دے:

ماتم میں آ رہے ہیں یہ ساماں کیے ہوئے
داغِ جگر کو شمعِ شبستاں کیے ہوئے
برطانیہ تو آج گلے مل کے ہم سے رو

سامانِ بحر ریزیِ طوفاں کیے ہوئے[8]

نظم ترکیب بند تھی جس میں دس بند تھے اور ہر ایک میں گیارہ اشعار۔ ہر بند میں یکساں تعدادِ اشعار نے نظم کی ظاہری صورت میں ایک شان پیدا کر دی۔ یہ نسخہ اقبال نے بعد میں اپنی مشہور ترین نظموں میں شان وشکوہ پیدا کرنے کے لیے کئی دفعہ استعمال کیا۔[9]

ملکہ وکٹوریہ کا انتقال عید کے دن ہوا چنانچہ اقبال نے ہلالِ عید سے خطاب کر کے ایک طرف اُسے وہ خاص تعلق یاد دلایا جو اُسے اُن کی قوم کے ساتھ تھا مثلاً مسلمانوں کا قومی نشان تھا۔ دوسری طرف موجودہ صورتحال کی مناسبت سے خوشی کے چاند سے غم کی بات کہہ دی اور اُس کی خنجر جیسی شکل پر خاص توجہ دی۔ یہ اقبال کی بعد کی شاعری کے مستقل موضوعات ہیں جن کی ابتدا اسی نظم میں ہوتی ہے:

ایمن تھے غم سے ہم مگر اے خنجرِ ستم
کرنے تھے ذبح طائرِ بامِ حرم تجھے

عید کو غم کا موقع سمجھنے کی ظاہری وجہ یہ تھی کہ ملکہ وکٹوریہ کی وفات ہوئی تھی مگر اس پردے میں مسلمانوں کی موجودہ پستی کا غم بھی سمٹ گیا۔ انگریز ملکہ کے سوگ کے کچھ استعارے نظم سے الگ کر لیے جائیں تو خود مسلمانوں کی حکومت جانے کا ماتم بن جاتے ہیں اور اقبال کے اولین سامع یہ بات محسوس کیے بغیر نہ رہے ہوں گے:

پژمردہ ہو گیا گُلِ بستانِ افسری
خوں رو رہی ہے باغِ جہاں میں بہار آج

ملکہ کی تعریف میں لفاظی کم تھی اور حقیقتاً اُس زمانے میں ملکہ وکٹوریہ کے بارے میں جو خیالات عام طور پر ظاہر کیے جاتے تھے اُنہیں زیادہ استعمال کیا جس کی وجہ سے یہ نظم وکٹورین عہد کی ایک تاثراتی دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ اقبال کی نظر صرف ہندوستان ہی پر نہیں بلکہ انگلستان پر بھی تھی اور اُن کی آگہی حیرت انگیز ہے۔ مثلاً چار برس پہلے گولڈن

جوبلی پر ملکہ کی سواری لندن سے گزری تو عمارتوں پر آویزاں بینروں میں سب سے بڑے پر لکھا تھا:۱

Our Hearts Thy Throne! The Queen of Earthly Queens

اقبال نے یہی بات اپنی نظم میں بیان کر دی تھی:

تُو جس کی تخت گاہ تھی اے تختگاہِ دل!
رخصت ہوئی جہان سے وہ تاجدار آج

اِس کے علاوہ:

اے بحر! حکمراں جو زمینوں کی تھی گئی
آغوشِ موج جس کے سفینوں کی تھی گئی

ایک اچھے حکمراں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اقبال نے وہ بنیادی خصوصیات گنوا دیں جو اُن کے خیال میں اور شبلی نعمانی کے حساب سے مسلمان بادشاہوں میں ہوا کرتی تھیں:

فرماں نہ ہو دِلوں پہ تو شانِ شہی نہیں
سونے کا تاج کوئی نشانِ شہی نہیں

تعزیت کے موقع پر ان خصوصیات کو اعزازی طور پر ملکہ وکٹوریہ سے منسوب کر دینے سے ظاہر تھا کہ تعزیت کرنے والی قوم خود بھی آدابِ جہانبانی سے ناواقف نہیں ہے:

شاہی یہ ہے کہ اور کا غم چشمِ تر میں ہو
شاہنشہی پہ شانِ غریبی نظر میں ہو

یہ کہنا مشکل ہے کہ اقبال ملکہ وکٹوریہ میں یہ تمام خوبیاں موجود رہی تھیں مگر اقبال کے اپنے تخیل کی ایک گرہ ضرور کھل رہی تھی۔ فقر اور شاہی کے امتزاج کی پہلی جھلک یہیں دکھائی دیتی ہے۔

اِس سے پہلے اقبال عام طور پر کشمیر کو جنت اور گلشن کہا کرتے تھے۔ اِس نظم میں پہلی

بار ہندوستان کے لیے باغ کا لفظ ملتا ہے۔ یہ بھی ایک مستقل موضوع بن گیا جسے بعد میں اقبال نے مشہور اشعار میں استعمال کیا۔ اِس کے علاوہ نظم میں شان وشکوہ کے ساتھ ساتھ دیگر شعری محاسن بھی موجود تھے۔ چونکہ یہ کسی ذاتی دوست کا مرثیہ نہیں بلکہ ایک قوم کی طرف سے رسمی تعزیت نامہ تھا لہٰذا پرتکلف خیال آفرینی کا موقع بھی تھا جسے خوب استعمال کیا۔

اشکِ خوں

(آخری بند)

پیغامِ خانہ سوزیِ دل بار بار دے
فرصت نہ دو گھڑی نفسِ شعلہ بار دے

زورِ جنوں میں جائے جو دشتِ عدم کو دل
پہلے قدم پہ جامۂ ہستی اُتار دے

پھونکا ہے غم کی آگ نے جانِ نزار کو
ہم کو تسلّیاں دلِ آشفتہ کار دے

جس کا دِلوں پہ راج ہو مرتا نہیں کبھی
صدیاں ہزار گردشِ دوراں گزار دے

رہتا ہے دل میں صورتِ حرفِ نگیں وہ نام
شہرت جسے جہان میں پروردگار دے

وکٹوریہ نہ مُرد کہ نامِ نکو گذاشت
ہے زندگی یہی، جسے پروردگار دے

اے غم کشانِ دُودۂ شاہی خدا تمھیں
اِس دردِ جاں گزا میں شکیب و قرار دے

رفتار اُس کے نقشِ قدم پر کرے نصیب

یہ مہرِ مادری کی تمھیں یادگار دے
اے باغِ ہند! تیرا خیاباں بجائے گل
موتی مثالِ دامنِ ابرِ بہار دے
پژمردہ کر گئی ہے جو بادِ خزاں تجھے
صد نوبہارِ ناز تجھے روزگار دے
مرحوم کے نصیب ثوابِ جزیل ہو
ہاتھوں میں اپنے دامنِ صبرِ جمیل ہو"

ماتمی جلسہ ۲۳ یا ۲۴ جنوری کو ہوا۔ خیال ہے کہ اقبال نے پوری دس بند کی نظم اس موقع تک تیار کر لی تھی اور بہت پسند کی گئی۔ لاہور میں مطبع خادم التعلیم سے بھی شائع ہوئی اور مطبع مفیدِ عام سے بھی جس کے سرورق پر درج تھا، 'اشکِ خوں یعنی ترکیب بند جو حضور ملکۂ معظّمہ مرحومہ کے انتقال پر ملال پر مسلمانانِ لاہور کے ایک ماتمی جلسہ میں پڑھا گیا از خاکسار اقبال'۔[14] انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا جس کے بارے میں خیال ہے کہ اقبال نے خود ہی کیا تھا۔

۷

اگلے ہی مہینے انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ہونے والا تھا۔ اقبال نے جو نظم لکھی اُس کا عنوان تھا 'دردِ دل یا ایک یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے'۔ پچھلی نظم 'اشکِ خوں' کی طرح یہ بھی ترکیب بند تھی اور ہر بند میں اشعار کی تعداد برابر تھی۔ کل پندرہ بند تھے اور ہر بند میں دس اشعار تھے۔

پچھلی نظم کی طرح اس میں بھی ہلالِ عید کو مخاطب کر کے خوشی کی بجائے غم کی باتیں کہی گئی تھیں۔ ملکہ وکٹوریہ کی وفات نے برطانوی ہند کو سرکاری طور پر یتیم کر دیا تھا مگر نظم میں جو بچہ خطاب کر رہا تھا وہ سچ مچ یتیم تھا۔ یہ موضوع اُس برس کے جلسے کے لیے بڑا

مناسب تھا۔

یتیم کے غم کو بیان کرنے میں ایسے اشعار بھی کہے گئے تھے جو بیساختگی اور جذبات کے خلوص کی وجہ سے یتیم کے علاوہ کسی بھی شخص کے جذبات کی آئینہ داری کر سکتے تھے مثلاً:

کیا بتاؤں تجھے کہ کیا ہوں میں
تجھ کو حسرت سے دیکھتا ہوں میں

پھر جہاں یتیم بچے نے خاص طور پر اپنی کیفیت بیان کی تھی وہاں وہ صرف بیچارگی کی تصویر نہیں رہتا تھا جسے چند سکے خیرات دے کر نظروں کے سامنے سے ہٹا دیا جائے بلکہ اُس کے غم ایسے تھے جو اُسے ایک شخصیت عطا کرتے تھے اور سننے والا اُس کے کرب کے ساتھ اُس کی معصومیت کو محسوس کر کے اُس کے جذبات میں حصہ دار بن جاتا تھا:

کھیل میں آ گئی جو چوٹ کبھی
کس کی آنکھوں سے اب چھپائیں
گے؟
کوئی ناغہ جو ہو گیا تو کسے
ساتھ مکتب میں لے کے جائیں گے؟

'نالۂ یتیم' کی طرح یہ نظم بھی نعتیہ پہلو لیے ہوئے تھی۔ تیرہویں بند میں بچہ اپنے تصور میں داستانِ عرب سن کر بیخود ہو جاتا ہے۔ اس سے اگلے دونوں بند قوم کے ساتھ عشق، محبت اور رازداری کے رشتے کی تصویر کھینچتے تھے۔ قوم اور بیخودی کے تصورات کا عشقِ رسولؐ کے ذریعے امتزاج ہی بعد میں اقبال کی فکر کی اَساس بنا۔ یہ اُس کی پہلی واضح جھلک تھی۔

دردِ دل

یعنی یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے

(بند ۳، ۱۴، ۱۵)

طعن دیتا ہے کس بلا کے مجھے
آسماں بن گیا ستا کے مجھے
ہائے بیخود کیا تصور نے
داستانِ عرب سنا کے مجھے
ہے تصدّق مری یتیمی پر
کوئی نقشہ دکھا دکھا کے مجھے
چاہیے اے خیال! پاسِ ادب
تُو کہاں لے گیا اُڑا کے مجھے!
ہائے اے آتشِ فراقِ پدر!
خاک کر دے جلا جلا کے مجھے
اے یتیمی! فتادگی بن کر
چھوڑنا خاک میں ملا کے مجھے
لبِ اظہار وا ہوا نہ کبھی
غم نے دیکھا ہے آزما کے مجھے
پردہ رکھ لے شکستہ پائی کا
کارواں لے چلے اُٹھا کے مجھے
زندگی کیا اسی کو کہتے ہیں
کہ مزے مل گئے فنا کے مجھے

عرش ہلتا ہے جب یہ روتے ہیں
کیا یتیموں کے اشک ہوتے ہیں!

کیا ہنسی ضبط کی اُڑاتے ہیں

اشک آ آ کے چھیڑ جاتے ہیں
اک بہانہ ہلالِ عید کا ہے
قوم کو حالِ دل سناتے ہیں
کس مزے کی ہے داستاں اپنی
قوم سنتی ہے ہم سناتے ہیں
دیکھ اے زندگی! مرے آنسو
یہ ترے نقش کو مٹاتے ہیں
ہاں بتا اے فلک! کہ طفلی میں
درد کو کس طرح چھپاتے ہیں؟
خاک راہِ فنا میں اُڑتی ہے
منہ کفن میں چھپائے جاتے ہیں
وہ بھی ہوتے ہیں اے خدا! کوئی
جو مصیبت کو بھول جاتے ہیں
اس طرح کی ہے داستاں اپنی
ہے عیاں جس قدر چھپاتے ہیں
ہم نہ بولیں تو خامشی کہہ دے
یہ قیامت کے دُکھ اٹھاتے ہیں
آبرو بڑھ گئی خموشی کی
یہ زباں بن گئی یتیمی کی
رنگِ گلشن جو ہو خزاں کے لیے
قہر ہوتا ہے باغباں کے لیے
چاہیے پاس برق کا اے دل!

ہو خسِ خشک آشیاں کے لیے

اُڑ کے آتا ہے رنگِ عارضِ زرد
کس مصیبت کی داستاں کے لیے!

حال دل کا سنا دیا سارا
کچھ بھی رکھا نہ رازداں کے لیے

ہے اقامت طلب جدار مری
قوم ہو خضر اِس مکاں کے لیے

ہاتھ اے قومِ مہرباں! تیرا
ابر ہے کس کے گلستاں کے لیے؟

حال اپنا اگر تجھے نہ کہیں
اور رکھیں اِسے کہاں کے لیے!

صورتِ شمعِ خانۂ مفلس
خامشی ہے مری زباں کے لیے

اب مگر ضبط کا نہیں یارا
سب ترسنے لگے فغاں کے لیے

دردمندوں کی دادخواہ ہے قوم
بے کسوں کی امیدگاہ ہے قوم[13]

فروری میں انجمن حمایت اسلام کے ۱۶ویں سالانہ اجلاس میں ڈپٹی نذیر احمد نے طنزیہ نظم پڑھی جس میں اُن مولویوں کا مذاق اُڑایا گیا تھا جو مذہبی خدمت کے جوش میں بیکار ہو کر معاشرے پر بوجھ بن جاتے تھے۔[14]

۲۴ تاریخ کو اقبال نے 'دردِ دل یعنی یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے' سنائی۔ پچھلے برس کی طرح اس دفعہ بھی کاپیاں چھپوا کر ساتھ لائے تھے۔ بعض کاپیاں چار چار روپے کی

بکیں۔

٨

مُنشی فوق نے ہفتہ وار اخبار نکالنے کی ٹھانی۔ پنجۂ فولاد نام تجویز ہوا اور مرزا داغ سے قطعۂ تاریخ لکھوایا گیا۔ اقبال نے بھی چوبیس اشعار کا تعارف لکھا جس میں اخبار کے مستقل کالموں بزمِ فوق، ضامنِ صحت، تجارت، مذاقِ سخن، مشاہیر، لطائف، سیٹلمنٹ آفس کا ذکر کرنے اور اخبار کا سالانہ چندہ ''تین رائج سکے قیمت سال کی'' بتانے کے بعد یہ بھی بتایا تھا کہ ''اِس بانکے پرچے کا مدیر'' کون ہے:

نام ہے اُس کا محمد دین فوق
عمر چھوٹی ہے مگر ہُشیار ہے[15]

اُس زمانے میں فوق غزلوں کے گلدستے بہارِ گلشن کے نام سے شائع کرتے تھے۔ اُسی برس یہ جمع ہو کر گلشنِ نوبہار کے نام سے شائع ہوئے جس میں اقبال کے بارے میں ایک سوانحی نوٹ بھی شامل تھا:

[اقبال]

شیخ محمد اقبال (ایم اے) تخلص اقبال، وطن سیالکوٹ۔ ابھی بالکل نوجوان ہیں۔ عمر چھبیس سال کے قریب ہے۔ عربی، فارسی، انگریزی میں مکمل استعداد رکھتے ہیں۔ حضور ملکہ معظمہ کے انتقالِ پرملال پر آپ نے جو دل گداز نظم ''اشکِ خونیں'' لکھی گورنمنٹ پنجاب نے اپنے صَرف سے اس کی کئی ہزار کاپیاں مختلف زبانوں میں چھپوائیں۔ فصیح الملک حضرت داغ سے اصطلاح لیتے ہیں۔ انگریزی خیالات کو اُردو شاعری میں بڑی خوبی سے ظاہر کرتے ہیں۔ آج کل قائم مقام پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور ہیں۔[16]

٩

کئی لوگ 'ہمالہ' کو اشاعت کے لیے حاصل کرنا چاہتے تھے مگر اقبال کے خیال میں نظم اصلاح طلب تھی۔[17] ممکن ہے کہ 'اشکِ خوں' اور 'دردِ دل' میں ساخت کی جو پختگی دریافت کر چکے تھے اُس کے مقابلے میں 'ہمالہ' کی بندش ڈھیلی نظر آتی ہو۔

۱۰

بیسویں صدی کا آغاز ہندوستان میں پرنٹنگ پریس کی مقبولیت کے آغاز کا زمانہ تھا۔ آئے دن کوئی نیا اخبار یا رسالہ وجود میں آتا اور کچھ عرصہ جاری رہ کر اپنے بانی کے شوق کی طرح ختم ہوتا رہتا تھا۔

شیخ عبدالقادر اُن دنوں بلند پایہ انگریزی اخبار آبزرور کے چیف ایڈیٹر تھے۔ بازارِ حکیماں کے مشاعروں اور لٹریری سوسائٹی کی محفلوں میں اقبال کے ساتھ ساتھ ہوا کرتے تھے مگر خود شاعری نہیں کرتے تھے۔ ۱۹۰۱ء کی پہلی سہ ماہی میں انہیں بھی ادبی رسالہ نکالنے کا خیال آیا۔ رسالے کا نام تجویز ہوا مخزن۔ اقبال نے بھی نظم دینے کا وعدہ کیا مگر اپنی مشہور کاہلی کے باعث ٹالتے رہے یہاں تک کہ آخر ایک دن عبدالقادر نے 'ہمالہ' کا مسودہ اُٹھا لیا اور اقبال کے احتجاج کے باوجود کہ نظم ابھی قابلِ اصلاح ہے اُسے لے جا کر کاتب کے حوالے کر دیا۔[18]

مخزن اپریل کے وسط میں شائع ہوا۔ سرورق پر ہندوستان کا نقشہ تھا جس میں تین مختلف نشانات سے ان مقامات کی شناخت کی گئی تھی جنہیں اُردو کا گہوارہ بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ رسالے کا بنیادی مقصد "آسان اور تفریحی مطالعے کا کافی سامان" فراہم کرنا تھا جس کے پس منظر کے متعلق شیخ عبدالقادر نے لکھا تھا، "بناوٹ کو اپنی قدامت پر ناز ہے اور ہو سکتا ہے۔ اس کو اپنے دلداروں کی تعداد کا گھمنڈ ہے اور بجا ہے۔ مگر سادگی کو اپنی سچائی پر بھروسہ ہے اور درست ہے۔ اور سب سے بڑی تسلی اسے یہ ہے کہ زمانہ کی رفتار اُس کے موافق ہے۔ یہ نیا مذاق ملک میں بہت کچھ تہذیب

الاخلاق کے نامور ایڈیٹر اور اُس کے ہمراہیوں اور حسن کے فاضل مضمون نگاروں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔اور گو یہ دونوں بیش بہار سالے اب موجود نہیں۔مگر ان کے قیمتی مضامین موجود ہیں۔اور ملک کے لٹریچر پر ان کا اثر موجود ہے۔اور یادگار رہیگا۔مگر یہ ظاہر ہے کہ ملکی لٹریچر ابھی اس قسم کی خدمات سے مستغنی نہیں۔جو ان رسالوں نے کیں تھیں۔اور کسی قدر ضروریات اور حالات بھی بدل گئے ہیں۔اور متقاضی ہیں۔کہ کوئی علمی رسالہ مناسب حالاتِ وقت نکلے۔ہم میں اور ان بزرگواروں میں جنہوں نے اِس سنگلاخ زمین میں سفر مینا کا کام کیا کوئی نسبت نہیں۔ہم ان کے خوان کے زلّہ ربا ہیں۔ مگر چونکہ انکی سرتوڑ محنتوں سے اب راستہ بھی آسان ہوگیا ہے۔ہم بھی اس طریق میں رہروی کا عزم کرسکتے ہیں۔''

'ہمالہ' صفحہ ۳۵-۳۳ پر شائع ہوئی تھی۔اس سے پہلے نوٹ میں شیخ عبدالقادر نے لکھا تھا، ''شیخ محمد اقبال صاحب۔اقبال۔ایم۔اے قائم مقام پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور۔ جو علومِ مغربی و مشرقی دونو میں صاحبِ کمال ہیں۔انگریزی خیالات کو شاعری کا لباس پہنا کر ملک الشعرائے انگلستان ورڈس ورتھ کے رنگ میں کوہِ ہمالہ کو یوں خطاب کرتے ہیں۔''

اگلے ماہ اقبال کی ایک اور نظم 'گلِ رنگیں' شائع ہوئی جس میں ادب کا وہ رُومانوی نقطۂ نظر پیش کیا گیا تھا جو اُس زمانے میں اقبال کا مسلک بھی تھا اور مخزن کے نئے والے ادیبوں سجاد حیدر یلدرم، ابوالکلام آزاد، خوشی محمد ناظرؔ، مہدی افادی، حسن نظامی اور حسرتؔ موہانی وغیرہ کا بھی:

کام مجھ کو دیدۂ حکمت کے اُلجھاؤوں سے کیا
دِیدۂ بُلبل سے مَیں کرتا ہُوں نظّارہ ترا

عبدالقادر حیدرآباد دکن گئے تو داغؔ کو اس بات پر فخر کرتے سنا کہ اقبال کبھی اُن سے اِصلاح لے چکے ہیں۔[۱۹]

۱۱

اقبال کی مشکل پسندی پر اعتراض بھی ہوئے جن سے وہ اتنے بددل ہوئے کہ بعض بے تکلف دوستوں سے کہہ دیا کہ آیندہ شعر نہ کہیں گے۔ اُنھوں نے سمجھایا کہ جتنے اشعار پر تنقید ہو رہی ہے اُس سے زیادہ اشعار کی تعریف بھی ہو رہی ہے۔ اقبال کا شعر گوئی ترک کرنا ملک میں ادب کے لیے نقصان دہ ہوگا۔

اسی زمانے میں دُور دُور سے داد ملنے لگی یہاں تک کہ مولانا شبلی نعمانی نے کہہ دیا، ''جب آزاد اور حالی کی کرسیاں خالی ہوں گی تو لوگ آپ کو ڈھونڈھیں گے۔'' تفصیل معلوم نہیں کہ یہ بات مولانا شبلی نے کس موقع پر کہی مگر بہرحال اس قسم کی باتوں نے دوبارہ اقبال کی ہمت بندھا دی۔[۲۰]

۱۲

یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اُس زمانے میں جب بازارِ حسن میں بڑے شاعروں کا کلام گایا جاتا تھا ۱۹۰۱ء کے عرصے تک اقبال کی غزلیں بھی طوائفوں میں مقبول ہو چکی ہوں گی۔ اقبال گانا سننے تو پہلے ہی جایا کرتے تھے مگر اب ممکن ہے بعض گانے والیاں خود اُن کی تشریف آوری کو بھی اہمیت دیتی ہوں۔ بہرحال حقیقت ہے کہ جوانی کے ایک دور میں اُنھیں بازارِ حسن کے معاملات میں سند مانا جاتا تھا اور بے تکلف دوست اِن معاملات میں اُن سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

''جس زمانے میں مَیں زندہ تھا،'' اقبال لکھتے ہیں۔ ''یا یوں کہیے کہ زندہ دل تھا تو تجربے نے یہ اُصول سکھایا کہ جس معشوق سے زیادہ محبت ہو اُس سے اصولاً زیادہ بے اعتنائی کرنی چاہیے... یار لوگوں نے فرمائش کی... کہ ہر اُصول پر ایک مفصل رسالہ لکھنا چاہیے کہ تماش بینوں کے لیے رہنمائی کا کام دے۔ سو بندے نے ایک رسالہ موسوم بہ اَجرُ السُّکُوت تحریر کیا... جس میں سکوت کے ایسے ایسے دلائل پیش کیے... کہ فریدالدین عطار بھی اگر اِس رِسالے کو پڑھتے تو اپنے فضائل خاموشی کو فراموش کر

جاتے۔وہ سینہ بہ سینہ شائع ہوتا تھا۔''۲۱

غزل

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہُوئے عار کیا تھی

تامل تو تھا اُن کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

کھنچے خود بخود جانبِ طور مُوسیٰ
کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی

نہ چھوڑا کبھی بے وفائی نے تم کو
مِری طرح یہ بھی وفادار کیا تھی؟

لیا مغفرت نے تڑپ کر بغل میں
کرامت تھی شرمِ گنہ گار کیا تھی!

کہیں ذِکر رہتا ہے اقبالؔ! تیرا
فُسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

یہ غزل جس کے سترہ اشعار دستیاب ہیں نہیں معلوم کب کی ہے مگر مخزن کے جون کے شمارے میں اس کے چھ اشعار 'کچکول' کے حصے میں ص ۴۷ پر شائع ہوئے۔ انتخاب کرنے والے کا نام درج نہیں تھا۔۲۲

اگلی غزل کے کم از کم سولہ اشعار ہوئے مگر اقبال نے صرف پانچ منتخب کر کے مخزن میں دیے جو مخزن جولائی ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئے:

نرالے ہیں انداز دُنیا سے اپنے
کہ تقلید کو خودکشی جانتے ہیں[۲۳]

۱۴

انسان میں حقیقت کا عرفان حاصل کرنے کی صلاحیت ہے اس لیے جذبات و معقولات کی پریشانی جمعیت کا سامان بھی بن سکتی ہے:

ہو گئی شرحِ رموزِ اتحادِ حسن و عشق
تیری یکتائی ہی آخر میری یکتائی ہوئی[۲۴]

یہ خیال غزلوں میں آتا رہتا تھا مگر نظم میں تفصیل کا موقع ملا۔ پھول اس کی واضح علامت تھا اور یہ بات 'گلِ رنگیں' میں بیان ہوئی جو مخزن میں مئی میں شائع ہوئی۔ مسدس تھی اور چھ بند تھے۔[۲۵]

کائنات ایک بہت بڑی علامت تھی جسے کھولنا شاعر کا کام تھا۔ اقبال یہ کام کر رہے تھے۔

عہدِ طفلی

تھے دیارِ نَو زمین و آسماں میرے لیے
وُسعتِ آغوشِ مادَر اِک جہاں میرے لیے
تھی ہر اِک جنبش نشانِ لطفِ جاں میرے لیے
خالی از مفہوم خود میری زباں میرے لیے
درد اِس عالم میں جب کوئی رُلاتا تھا مجھے
شورشِ زنجیرِ دَر میں لطف آتا تھا مجھے

مخزن، جولائی ۱۹۰۱ء

نظم میں پانچ بند تھے اور بظاہر اس کی ہیئت سے بھی اقبال مطمئن نہیں تھے۔[۲۱]

۱۵

نری شہرت زندہ رہنے کے لیے کافی نہ تھی۔ جولائی میں ایک دفعہ پھر اورینٹل کالج منتقل ہوئے جس کی تنخواہ وہی بہتر روپے چودہ آنے تھی مگر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کا امتحان کوئی دو مہینے بعد ہونے والا تھا اور اُمید تھی کہ جس ذہانت نے شہرت بخشی ہے وہی باقی مسائل بھی حل کر دے گی۔

۱۶

معلوم ہوتا ہے کہ پوری سنجیدگی کے ساتھ امتحان کی تیاری کر رہے تھے کیونکہ اگست کے مخزن میں اُن کی کوئی نظم شائع نہیں ہوئی۔ مگر وہ ذہن جس کے متعدد خانوں میں بیک وقت کئی موضوعات چلتے تھے امتحان کی فکر کے ساتھ ساتھ اپنے ادبی نصب العین پر غور کر رہا تھا۔

اگست کے قریب وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ شاعری کا مقام معاشرے میں وہی ہے جو ہمالیہ کی خاموش فضاؤں میں اس کے دامن میں بہتے ہوئے جھرنے کا ہے۔[۲۲] شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ ان تصورات کو آواز کا جادو عطا کر دے جن تک دوسرے لوگوں کی پہنچ نہیں ہوتی۔

قریب کے زمانے میں شاعری کے اس نصب العین کی مثال مغرب میں گوئٹے اور مشرق میں مرزا غالب تھے۔ ایک عرصے سے اقبال کی تقریباً ہر لمبی نظم میں کوئی نہ کوئی ٹکڑا یا مصرعہ غالبؔ سے ماخوذ چلا آ رہا تھا مگر اُن کی غالب پسندی یہیں تک محدود نہیں تھی۔ آم کھانا، مولویوں کو تنگ کرنا، ہندوؤں سے دوستی کرنا، اپنی بے نمازی کی تشہیر کرنا اور کبھی کبھی تھوڑا سا کفر بکنا، غالب کی یہ تمام عادتیں اُن میں موجود تھیں۔ شراب نوشی کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن اگر بعض لوگوں کا یہ خیال درست ہے کہ جوانی

میں چھ کے بعد میں ترک کر دی تھی تو پھر ہو سکتا ہے کہ اُس چھٹنے کی وجہ بھی غالب کی پیروی ہو۔ عبدالقادر تو یہاں تک کہنے پر مجبور ہوئے، "اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسداللہ خان غالبؔ (کی روح) نے دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔"[۲۸]

غالب پر نظم لکھنے بیٹھے تو مسدس میں بھی نظم کی ساخت میں ویسا ہی شکوہ آ گیا جیسا ترکیب بند میں پیدا کر چکے تھے۔ پانچ بند، ہر بند میں چھ مصرعے، اقبال نظم کی صورت سے کافی مطمئن معلوم ہوتے تھے:

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تصور کی رسائی تا کجا[۲۹]

۱۷

اقبال عام طور پر فرمائش پر شعر نہ کہ سکتے تھے مگر کبھی کبھی فرمائش پوری بھی کر دیتے تھے۔ ایسی ہی کسی فرمائش پر آٹھ دس منٹ میں ایک چھوٹی سی نظم کہہ دی:

ہم نچوڑیں گے دامن

سراپا ہوا مثلِ آغوشِ دریا
نہانے کو اُترا جو وہ رشکِ گلشن
پئے دید کھولیں حبابوں نے آنکھیں
اُٹھائی نظارے کو موجوں نے گردن
اسیرِ خمِ زلف کیونکر نہ ہو خضر
یہ قامت، یہ عارض، یہ سینہ، یہ جوبن
اُدھر سر حبابوں نے ساحل سے پٹکے
نہا کر جو نکلا وہ دریا سے پُرفن

ہوئی خوں فشاں چشمِ گرداب ایسی
کہ دریا ہوا غیرتِ صحنِ گلشن
جو دستِ حنائی سے دامن نچوڑا
کہا مَیں نے "اے روکشِ شمعِ روشن!
کہیں آگ سے بھی ٹپکتا ہے پانی؟
بجا ہے جو کہیے تجھے سامری فن
مِری چشمِ گریاں کی تجھ کو قسم ہے
صنم! چھوڑ دے، ہم نچوڑیں گے دامن"

کشمیری گزٹ، ستمبر ۱۹۰۱ء[۳۰]

'مرزا غالب' بھی ستمبر میں مخزن میں شائع ہوئی۔

۱۸

پیرزادہ عارف صاحب کی مثنوی عقدِ گوہر پچھلے برس شائع نہ ہو سکی تھی۔ اقبال نے تین نئے قطعاتِ تاریخ اُردو میں لکھ کر دیے۔ ایک سے ۱۹۰۱ء اور باقی دونوں سے ۱۳۱۸ھ برآمد ہوتا ہے۔

اِس برس کتاب چھپ گئی۔ دیگر قطعات تاریخ کے ساتھ اقبال کے تمام چھ قطعات شامل تھے:

رُوحِ فردوس میں رُومی کی دُعا دیتی ہے
آپ نے خوب کِیا، خوب کہا، خوب لکھا[۳۱]

۱۹

ستمبر میں کالج کی تعطیلات تھیں یا اقبال خود ہی چھٹیاں لے کر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے امتحان کی تیاری کرنے سیالکوٹ چلے گئے۔

کالج کے دوست فضل حسین بیرسٹر بن چکے تھے اور کسی مقدمے کے سلسلے میں سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ نیرنگ جو پچھلے سال انبالے میں وکالت شروع کر چکے تھے اقبال سے ملنے پہنچ گئے۔ ان دونوں کی موجودگی نے اقبال کو اور زیادہ احساس دلایا ہوگا کہ اپنی تمام تر ذہانت کے باوجود وہ عملی زندگی میں سست قدم ہوئے جا رہے ہیں اور اب بہت جلد انہیں اپنی ترقی کے لیے کوئی بڑا قدم اٹھانا چاہیے۔ اسسٹنٹ کمشنری کا امتحان ایک ایسا بڑا قدم ہو سکتا تھا۔

سیالکوٹ میں پھر کالج کے دنوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ اقبال نے آفتاب اور اعجاز کو بلایا اور نیرنگ سے تعارف کرواتے ہوئے آفتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''ایہہ آفتاب وانگوں سحر خیز اے!'' نیرنگ کو اُس روز یقین آیا کہ اقبال واقعی صاحب اولاد ہیں۔ انہوں نے آفتاب سے کہا، ''بھئی یہ تمہارا باپ ایسا ہی گپی ہے...''

ایک روز اقبال اور فضل حسین ایک گلاس میں کوئی سرخ رنگ کی چیز پی رہے تھے۔ نیرنگ کو دیکھ کر انہیں بھی دعوت دی۔ یہ بڑی دیر تک بچتے رہے۔ آخر وہ دونوں ہنس پڑے اور بتایا کہ شراب نہیں بلکہ ایریٹڈ واٹر میں سرخ رنگ کا شربت ملا ہوا ہے۔[۳۲]

۲۰

ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے امتحانات شاید ستمبر میں منعقد ہوئے۔ امتحان سے ایک روز قبل اُمیدواروں کا طبی معائنہ ہوا۔ میں اقبال کی دائیں آنکھ میں بینائی نہ ہونے کا معاملہ سامنے آیا اور طبی بنیادوں پر نا اہل قرار پائے۔[۳۳]

پیسہ اخبار نے احتجاجی نوٹ لکھا کہ اقبال کی صحت تو قابلِ رشک ہے۔ بین السطور میں شکایت ظاہر ہو رہی تھی کہ مسلمان اُمیدوار کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ فوق نے کشمیری گزٹ کے اکتوبر کے شمارے میں ''مسلمان اُمیدوار'' کے حوالے سے سرخی باندھی اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ اُمیدوار کا طبی امتحان کم از کم اتنا عرصہ قبل

ہوا کرے جب اُمیدواروں نے امتحان کی تیاری شروع نہ کی ہو۔[۲۴]

اِس ناکامی کے بعد ہی اسٹراٹن صاحب نے اقبال کو مشورہ دیا ہوگا کہ امریکہ یا کینڈا کے کسی ادارے سے کوئی اعلیٰ ڈگری حاصل کریں۔[۲۵] اقبال نے سفر کے لیے پیسے بچانے شروع کردیے۔

۲۱

سوامی بیرونِ ملک تبلیغ کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ اُنہوں نے اقبال سے کہا ہوگا، ''ویدانت کی رُوح بس اتنی سی بات میں ہے کہ کسی مصیبت کو اپنے اُوپر طاری نہ ہونے دو۔ اپنے میں خدا کی موجودگی کے احساس سے ہمیشہ خوش اور پرسکون رہو!''[۲۶]

۲۲

میاں شاہ دین ہمایوں کشمیر گئے ہوئے تھے۔ اکتوبر کے مخزن میں اُن کی نظم شائع ہوئی جس کا موضوع اُن کی اکثر نظموں کی طرح کشمیر تھا:

اعجاز دیکھ تو یہی یاں کیا سماں ہے آج
نیرنگ آسمان و زمیں کا نیا ہے آج
اقبالؔ تیری سحربیانی کہاں ہے آج
ناظرؔ کمانِ فکر سے مار ایک دو خدنگ

۲۳

غزل

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لیے
بجلیاں بیتاب ہوں جن کو جلانے کے لیے
اِس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کا گیت

آہ یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لیے
قصہ خواں نے کیوں سُنا دی داستاں مجھ کو مری
رہ گیا تھا مَیں ہی کیا اپنے فسانے کے لیے؟
پاس تھا ناکامیٔ صیّاد کا اے ہم صفیر!
ورنہ مَیں اور اُڑ کے آتا ایک دانے کے لیے
ترک کر دی تھی غزل خوانی مگر اقبالؔ نے
یہ غزل لکھی ہمایوںؔ کو سُنانے کے لیے

مخزن، نومبر ۱۹۰۱ء[۳۷]

پوری غزل پر طبیعت کی بیزاری اور افسردگی کا رنگ نمایاں ہے جسے اسسٹنٹ کمشنری کے امتحان میں ناکامی کا اثر سمجھا جا سکتا ہے۔ آخری مصرع سے ذہن غالب کی طرف جاتا ہے:

مجھ کو غالبؔ یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیدادگرِ رنج فزا اور سہی

نومبر میں 'ابرِ کہسار' مخزن میں شائع ہوئی جو ایک طرح سے 'ہمالہ' کے تسلسل کی نظم تھی۔ مسدس کے دس بند تھے۔[۳۸]

۴۴

اُسی برس حالیؔ نے سرسید کی سوانح حیاتِ جاوید شائع کروائی۔ اِس کے آخر میں مولوی میر حسن اور اقبال کی نکالی ہوئی سرسید کی وفات کی تاریخیں خاص طور پر درج تھیں مگر ان دونوں کے نام نہیں لکھے گئے تھے۔ میر حسن نے حالیؔ کو لکھ دیا کہ براہِ کرم آیندہ ایڈیشن میں نام بھی شامل کیے جائیں۔[۳۹]

دسمبر میں مخزن میں انوکھے لب و لہجہ کی غزل شائع ہوئی جس نے ایک نئے شاعر کو

اچانک مشہور کردیا۔ شاعر کا نام حسرت موہانی اور غزل کا مطلع تھا:

بھلاتا لاکھ ہُوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی! ترکِ اُلفت پہ وہ کیونکر یاد آتے ہیں

۲۵

اُس سال کسی وقت اقبال کو بچوں کی نفسیات سے دلچسپی پیدا ہوئی جس کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ورڈز ورتھ سے اقبال کو دلچسپی تھی اور ورڈز ورتھ نے بچپن کو اہمیت دی ہے۔ چنانچہ اقبال کی ایک نظم ''عہدِ طفلی'' بھی مخزن (جولائی ۱۹۰۱ء) میں شائع ہوئی تھی۔

۱۹۰۱ء یا ۱۹۰۲ء میں محکمہ تعلیم پنجاب کی جانب سے اُردو کی پانچویں کتاب کا نیا ایڈیشن تیار ہوا تو اورینٹل کالج سے وابستگی، آرنلڈ کی سفارش یا خود اُن کی ذاتی شہرت کی وجہ سے اُن کی دو نظمیں شامل کی گئیں۔ یہ 'ایک مکڑا اور مکھی' اور 'ہمدردی' تھیں۔[۴۰]

۱۹۰۱ء ہی میں کسی وقت اقبال نے بچوں کی نفسیات پر مغربی ماہرین تعلیم کی تحریریں پڑھیں اور اپنی معلومات کو مخزن کے حصہ نثر کے لیے قلم بند کیا۔ اُنہوں نے لکھا، ''تمام قومی عروج کی جڑ بچوں کی تعلیم ہے۔ اگر طریق تعلیم علمی اُصولوں پر مبنی ہو تو تھوڑے عرصہ میں تمام تمدنی شکایات کافور ہو جائیں''۔

اقبال نے اپنے مضمون میں گیارہ اُمور کی فہرست بنائی تھی جو ''عالم طفلی کے ساتھ مختص ہیں'':

۱۔ بچوں میں اضطراری حرکت کا میلان ہوتا ہے۔
۲۔ اس عمر میں کسی شے پر مسلسل توجہ نہیں ہو سکتی۔
۳۔ بچوں کو اشیا کو غور سے دیکھنے اور بالخصوص ان کے چھونے میں لطف آتا ہے۔
۴۔ بچے کی توجہ صورت سے زیادہ رنگ کی طرف جاتی ہے۔
۵۔ بچے میں بڑوں کی مدد کرنے کا مادہ خصوصیت سے زیادہ ہوتا ہے۔

۶۔ قوت متخیلہ یا واہمہ بھی بچوں میں بڑی نمایاں ہوتی ہے۔کہانی میں وہ اسی لیے دلچسپی لیتے ہیں۔

۷۔ بچے میں ہمدردی کی علامات بھی ظاہر ہوتی ہیں۔کسی کو ہنستا دیکھے تو خود بھی ہنستا ہے۔ماں باپ غمگین نظر آئیں تو خود بھی ویسی ہی صورت بنالیتا ہے۔

۸۔ الفاظ یاد رکھنے کے لیے بچہ کا حافظہ حیرت ناک ہے۔

۹۔اشیا میں فرق کرنے کی قوت کمزور ہوتی ہے۔

۱۰۔ قوائے عقلیہ مثلاً تصدیق definition اور استدلال کمزور ہوتے ہیں۔ یہ تجربے اور علم کے ساتھ بڑھتے ہیں...بچے سے ایسی فہمید کی توقع نہ رکھو جو ابھی تجربے اور علم سے بڑھنی ہے۔ایک برس کے بچے کو کیا علم کہ ''حب وطن'' کس جانور کا نام ہے۔ ہمارے بعض معلم بچہ کے ہاتھوں میں ایسی ابتدائی کتابیں رکھ دیتے ہیں جن کا پہلا باب مثلاً خدا کی صفات سے شروع ہوتا ہے۔مگرانہیں یہ معلوم نہیں کہ خدا ایک ایسا مجرد تصور ہے جو قوائے عقلیہ کی حدِ کمال پر پہنچنے اور بہت سا علم حاصل کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔اور صفاتِ شے کا اُس شے سے علیحدہ تصور کرنا ایک ایسا فعل ہے جو بچے سے کسی صورت میں ممکن ہی نہیں ہے۔لہذا اس قسم کا علم دینا ممکن ہے کہ بعض وجوہ سے اچھا ہو مگر علمی اصولوں کی رُو سے بچے کے حافظہ پر ایک بے جا اور غیر مفید بوجھ ڈالنے سے زیادہ نہیں۔

۱۱۔ اخلاقی محرکات سے بچہ یا تو متاثر ہی نہیں ہوتا یا اگر ہوتا ہے تو بہت کم۔اخلاقی ذمہ داری کا احساس اعلیٰ درجہ کی تعلیم اور تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔[۴]

مضمون کا پُر اُمید لب ولہجہ قابل وغور ہے گویا اقبال بچےکونہایت مفید قوتوں کا مجموعہ تصور کرتے ہیں کہ ذرا سی احتیاط ان قوتوں کوانسانیت کی بھلائی پر گامزن کرسکتی ہے۔ اس کے علاوہ اُن کا یہ حسنِ ظن بھی خوب ہے کہ ''تمام قومی عروج کی جڑ'' کوئی ایک چیز ہوسکتی ہے جس پر توجہ کرنے سے ''تھوڑے ہی عرصہ میں تمام تمدنی شکایات کا

نور ہو جائیں''۔ ایسی تراکیب اُن کے ذہن کے کسی گوشے میں چھپے اس خیال کی نشان دہی کرتی ہیں کہ پوری دینا کا ایک دل کش خواب کی طرح حسین ہو جانا ممکن تھا۔

۲۶

مخزن کے جنوری ۱۹۰۲ء کے شمارے میں ص ۴۷-۴۵ پر 'کلامِ آزادؔ' کے عنوان سے مولانا محمد حسین آزاد کی چار غزلیں شائع ہوئیں۔ پہلے کی لکھی ہوئی ہوں گی:

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوار خاک ہیں، بے اختیار بیٹھے ہیں

۲۷

کوئی پارسی جمشید جی تھا جسے عرفِ عام میں جمسیٹ جی کہتے تھے۔ غالباً لاہور ہی میں اُس کا نیلام گھر تھا۔[۴۲]

۲۸

میاں شاہ دین کی لٹریری سوسائٹی اور عبدالقادر کا مخزن اقبال کی نظموں کو ایک وسیع دائرے میں لے آئے تھے۔ لکھنؤ والے بھی توجہ دینے لگے۔ وہاں کے رسالے خدنگِ نظر کی فرمایش پر اقبال ایک نظم لکھنے بیٹھے۔

وہ حیاتِ جاوداں کے طلب گار تھے مگر روشنی کے سمندر میں پروانے کا بیخود ہو کر فنا ہو جانا ایک ایسی علامت تھی جس کی گہرائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ زندگی کی روحانی اساس کے لیے کسی نہ کسی قسم کی فنا کے مرحلے سے گزرنا ضروری تھا۔ اس تجربے کو اقبال کے اپنے جذبے کی سچائی کے مطابق بیان کرنے کے لیے جس اسلوب کی ضرورت تھی وہ دریافت نہ ہوا تھا اِس لیے اُنہوں نے شمع ہی سے پوچھ لیا کہ پروانہ اُس سے پیار کیوں کرتا ہے:

آزارِ موت میں اسے آرامِ جاں ہے کیا؟
شعلے میں تیرے زندگی جاوداں ہے کیا؟

نظم کا عنوان 'شمع و پروانہ' تھا۔ مثنوی کی ہیئت میں بارہ اشعار تھے۔[۴۳]

۲۵

'بچوں کی تعلیم و تربیت' مخزن (جنوری ۱۹۰۲ء) میں شائع ہوا۔ اُسی ماہ خدنگِ نظر لکھنؤ میں 'شمع و پروانہ' بھی چھپی جس سے پہلے ادارتی نوٹ میں تھا، ''اس نمبر میں ہم شمع و پروانہ کے عنوان سے مسٹر محمد اقبال ایم اے، پروفیسر گورنمنٹ کالج کی ایک نو تصنیف نظم شائع کرتے ہیں۔ جو پروفیسر صاحب نے ہمارے اصرار پر نہایت ہی عجلت میں تصنیف فرمائی ہے تاہم ان اشعار سے اُن کے فن و زباں دانی کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔''

۲۶

'خفتگانِ خاک سے استفسار' میں مرنے والوں سے عدم کی کیفیت پوچھی گئی تھی۔ خاص بات یہ تھی کہ اس میں اگلی دنیا کا خوف نہیں بلکہ اُس کے بارے میں تجسس نمایاں تھے:

تم بتا دو راز جو اِس گنبدِ گرداں میں ہے
موت اِک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے

یہ چالیس اشعار کی ترکیب بند تھی۔ اِس میں دو بند تھے۔[۴۴]

موت سے خوف نہ کھانا اُس عقیدے کی وجہ سے رہا ہوگا جسے اسلام کہتے تھے اور سرسید کے مطابق جس کی سچائی کو آنکھیں کھول کر دیکھا جا سکتا تھا۔ تاریخ کی کتنی ہی قیامتوں میں اسلام دوبارہ زندہ ہو کر اُٹھا تھا۔ میر حسن ملازمت کرنے نکلے تھے تو عیسائی مشنریوں کے اسکول کے سوا کہیں جگہ نہ ملی تھی مگر آج مسلمانوں کے اپنے کالج علی گڑھ،

لاہور اور نجانے کہاں کہاں موجود تھے۔ یہ سب اُس بوڑھے کی بیخودی کا نتیجہ تھا جس نے مولوی میر حسن سے کہا تھا کہ مسلمان قوم کے لیے دُعا مانگیں جس کا کوئی آسرا دکھائی نہیں دیتا۔ آج وہ قوم پھر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل تھی۔

اقبال کے شعور میں یہ بات روشن ہو رہی تھی کہ فرد اور قوم ایک دوسرے کے آئینہ دار ہیں۔ اگر تاریخ نے شہادت دی ہے کہ اسلام ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے تو یہ مسلمان کی حیاتِ جاوداں کا ثبوت بھی ہے۔ انجمن حمایتِ اسلام کے آیندہ جلسے کے لیے جو نظم لکھی اُس کا عنوان تھا، 'اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے۔' یہ ترکیب بند تھی جس میں نو بند تھے جس طرح کشمیر کے لیے لکھے ہوئے قطعات بھی نو تھے۔ 'اشکِ خوں' کی طرح اس کے ہر بند میں بھی گیارہ اشعار تھے۔ ہر بند کا ٹیپ کا شعر فارسی میں تھا اور آخری بند پورا فارسی میں تھا۔[۴۵]

پہلی بار یہ احساس شدت کے ساتھ دکھائی دیا کہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اُس کے لیے الفاظ کافی نہیں ہیں، قصہء مطلب طویل اور دفترِ تقریر تنگ ہے، ''خود بخود کوئی سمجھ جائے کہ کیا کہنے کو ہیں''! نظم میں اسلامیہ کالج مسلمانوں سے خطاب کر رہا تھا گویا تعمیر معمار سے اور آئینہ سکندر سے خطاب کر رہا تھا مگر کون کس کا رہینِ منت ہے، کالج مسلمانوں نے بنایا ہے یا مسلمان اور کالج دونوں اسلام کی اُس باطنی زندگی کے تابع ہیں جو ابھی تک تاریخ کے پردوں میں پنہاں تھی مگر اب علم کے آئینے میں ظاہر ہونے کے لیے بیتاب ہے؟ الفاظ میں واضح کرنا محال تھا۔ نظم کی ساخت پر غور کر کے ہی جواب سمجھا جا سکتا تھا۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ حکمت مومن کی گم شدہ میراث ہے جہاں سے بھی ملے اُسے حاصل کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اپنے آخری نبی ہونے کا اعلان کر کے ہر طرح کے پروہتی نظام کی بنیاد ختم کر دی اور عقل و شعور کے دروازے کھول دیے تھے۔

مسلمان قوم کی جمعیت کا راز یہی تھا کہ جس طرح خدا کی ذات میں کسی کو شریک نہیں

کیا جاسکتا اُسی طرح اسلامی قومیت میں کسی کو شریک کرنا بھی جائز نہ تھا۔ پہلے گناہ کا نام شرک اور دُوسرے کا منافقت تھا۔

نظم کا آخری بند جو فارسی میں نعتیہ تھا اُس میں مسلمان قومیت کی یہی رمز بیان ہوئی اور اسلامیہ کالج نے رسولِ اکرمؐ سے مسلمانوں کے لیے دُعا فرمانے کی درخواست کرتے ہوئے کہا کہ آپؐ کے بعد کسی اور کی نبوت کسی بھی مفہوم میں تسلیم کرنا شرک کے مترادف ہے کیونکہ آپؐ دنیا کی محفل میں عرفان کی شمع کی روشنی عام کر گئے ہیں:

اے کہ بعد از تُو نبوت شُد بہ ہر مفہوم شرک
بزم را روشن زِ نورِ شمعِ عرفاں کردہٗ

خضر کے پاس باطن کا علم تھا اور قید خانے میں خدا نے یوسف کو خوابوں کی تعبیر کا علم دے دیا تھا۔ مسلمان قوم بھی یوسف کی طرح قید خانے میں تھی اور حسد کرنے والے بہت تھے مگر کیا یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ علم اور آزادی کا وہ خواب جو نئے زمانے کے فرعونوں نے بیان کیا تھا اُس کی تعبیر اسی غریب الوطن کے پاس ہو؟

غالبؔ نے صریرِ خامہ کو نوائے سروش یعنی غیب سے مضامین لانے والے فرشتے کے پروں کی آواز کہا تھا۔ اقبال صریرِ خامہ کے لیے ایک نئی اصطلاح وضع کر رہے تھے جسے اُن کی آیندہ شاعری میں بار بار آنا تھا:

ہے سُوئے منزل رواں ہونے کو اپنا کارواں
ہم صریرِ خامہ کو بانگِ درا کہنے کو ہیں

نوائے سروش نے منزل کا پتہ دیا تھا۔ بانگِ درا منزل کی طرف بڑھنے کا اعلان کرنے والی تھی۔[۱۴]

اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے

بند ۳

میں صدف تم ابرِ نیساں میں گلستاں تم بہار
مزرعِ نوخیز میں، تم ابرِ دریابار ہو

میں نتیجہ اک حدیثِ اُمّیِ یثرب کا ہُوں
تم اُسی اُمّی کی اُمت کے علم بردار ہو

اِک مہِ نَو آسمانِ علم و حکمت پر ہُوں میں
تم بھی ایک فوجِ ہلالی کے سپہ سالار ہو

نام لیوا ایک دیارِ علم و حکمت کا ہُوں میں
اور تم اگلے زمانوں کے وہی انصار ہو

یاں کبھی بادِ خزاں کا رنگ جم سکتا نہیں
میں مسلمانوں کا گلشن تم مِری دیوار ہو

تم اگر چاہو تو اِس گلشن کے ایسے بھاگ ہوں
ہر کلی گل ہو کے اِس کی زینتِ دستار ہو

رہنے والے انتخابِ ہفت کشور کے ہو تم
کیوں نہ اِس گلشن کی نکہت رُوکشِ تاتار ہو

میری دیواروں کو چھُو جائے جو اِکسیرِ عطا
خاک بھی میری مثالِ گوہرِ شہوار ہو

دیکھ اے ذوقِ خریداری! یہ موقع ہے کہیں
حسنِ یوسف سے نہ خالی مصر کا بازار ہو

یوسفِ علم اتی و نجابِ کنعانِ من است
از دمیدِ صبحِ حکمت چاک دامانِ من است

بند۴

IqbalCyberLibrary.net All rights reserved

مجھ میں وہ جادو ہے روحوں کو بنا سکتا ہوں میں
قوم کے بگڑے ہوؤں کو پھر بنا سکتا ہوں میں
عید ہوں میں اے نگاہِ چشمِ نظارہ! تری
شاہدِ مقصود کا پردہ اُٹھا سکتا ہوں میں
طیرِ حکمت باغِ دنیا میں ہوں اے صیاد میں
دام تُو سونے کا بنوا لے تو آ سکتا ہوں میں
طوسی و رازی و سینا و غزالی و ظہیر
آہ وہ دل کش مرقع پھر دکھا سکتا ہوں میں
آئیں اُڑ اُڑ کر پتنگے مصر و روم و شام سے
شمع اِک پنجاب میں ایسی جلا سکتا ہوں میں
آزما کر تم ذرا دیکھو مرے اعجاز کو
ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ دِکھا سکتا ہوں میں
گوش بر آواز تھا مغرب کبھی جس کے لیے
وہ صدا پھر اِس زمانے کو سُنا سکتا ہوں میں
ناز تھا جس پر کبھی غرناطہ و بغداد کو
پھر وہی محفل زمانے کو دِکھا سکتا ہوں میں
گھر کسی کا جن کی ضَو سے غیرتِ مشرق بنے
اِس انوکھی شان کے موتی لٹا سکتا ہوں میں
کارواں سمجھے اگر خضرِ رہِ ہمت مجھے
منزلِ مقصود کا رستہ دِکھا سکتا ہوں میں

از خُمِ حکمت بروں کردم شرابِ ناب را
ہا مبارک سرزمینِ خطّۂ پنجاب را

بندے

ہاں رگِ ہمت کو اپنی جوش میں لائے کوئی
عشقِ اِخواں کا اثر دنیا کو دکھلائے کوئی

جوشِ ہمدردی میں پنہاں دولتِ ایماں ہے بس
نقشہٗ خیرالقرون آنکھوں کو دکھلائے کوئی

ہے پریشاں بادِ ناکامی سے گیسوئے مراد
شانۂ دستِ عطا سے اس کو سلجھائے کوئی

بہرِ استقبال استادہ ہے ہر گل کی کلی
اِس چمن میں صورتِ بادِ صبا آئے کوئی

یہ گل و گلزار صدقہ اُمّیِ یثرب کا ہے
دیکھنا اے باغباں! غنچہ نہ مرجھائے کوئی

مدّعا کو یہ سکھایا شورشِ فریاد نے
خودبخود میری طرح منہ سے نکل آئے کوئی

کہہ گئی ذوقِ کرم کو شوخیِ حسنِ طلب
ہاتھ سے عاشق کا دل بن کر نکل جائے کوئی

اِک چھٹا دریا رواں ہونے کو ہے پنجاب میں
ابر کی صورت اُٹھے، اُٹھ کر برس جائے کوئی

تاک میں بیٹھی ہوئی ہے شوخیِ دستِ طلب
دیکھیے اِس بزم سے بچ کر کہاں جائے کوئی

فکرِ دیں کے ساتھ رکھنا فکرِ دنیا بھی ضرور
ہیں بہت دشمن کہیں دھوکا نہ کھا جائے کوئی

خویش را مسلم ہمی گویند و با ما کار نیست

رشتۂ تسبیحِ شاں جز رشتۂ زُنار نیست

ساتویں بند میں مسلم قومیت کے لیے ’’عشقِ اخواں‘‘ یعنی بھائیوں کی محبت، لفظ ’’برادری‘‘ کا شاعرانہ ترجمہ تھا کیونکہ برادری کو انگریزی لفظ کمیونٹی کا مترادف سمجھا جاتا تھا۔ یہ باغ نبیؐ کی امانت ہے لہٰذا اِس کا کوئی پھول مرجھانے نہ پائے، یہ وہی نصیحت تھی جو شیخ نور محمد نے اقبال کو کی تھی جب کالج کے زمانے میں اُنہوں نے ایک سائل کر جھڑکنے کی غلطی کی تھی۔

نظم میں خاص طور پر پنجاب کے مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا تھا۔ نصب العین آفاقی تھا مگر عملی اقدام کے لیے زمین کے کسی خطے پر مضبوطی سے پاؤں جما کر کھڑا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔

۳۰

مرزا غلام احمد نے حکم دیا کہ کوئی احمدی کسی غیر احمدی کے جنازے میں شریک نہ ہو۔ اِس مسئلے نے اُن خاندانوں میں کشمکش پیدا کر دی جن کے بعض افراد احمدی اور بعض غیر احمدی تھے۔ اُنہی میں میر حسام الدین کا خاندان بھی تھا۔ اُن کے بیٹے میر حامد شاہ احمدیت کے پر جوش مبلغ تھے مگر اپنے والد کے چچا زاد بھائی میر حسن سے محبت بھی کرتے تھے۔ ایک دن مسجد میں بیٹھے تھے کہ کسی نے پوچھ لیا، ’’کیا اپنے چچا کے جنازے میں بھی نہیں جاؤ گے؟‘‘ جذبات سے مغلوب ہو کر ہاتھ اُٹھائے اور کہا، ’’خدا مجھے اُن سے پہلے اُٹھا لے!‘‘[۴۷]

۳۱

شیخ نور محمد کی لڑکی طالع بی ۱۹۰۲ء میں فوت ہوئیں۔[۴۸]

معلوم ہوتا ہے کہ اقبال بہن کے جنازے میں شریک ہونے سیالکوٹ آئے تو میر

حامد شاہ نے اُنہیں بھی بیعت کی دعوت دی۔[49]

۳۲

'خفتگانِ خاک سے استفسار' فروری میں مخزن میں شائع ہوئی۔[50]

اُس ماہ انجمن حمایت اسلام کا ستر ہواں سالانہ اجلاس منعقد ہونے والا تھا۔ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر (یعنی گورنر یا عوام کی زبان میں لاٹ صاحب) سر ولیم میکورتھ ینگ تشریف لا رہے تھے۔ ڈائرکٹر تعلیم ولیم بل بھی آنے والے تھے۔ اقبال کو قصیدہ کہنا تھا۔[51]

۳۳

ادبی روایت میں قصیدے کا مقصد حقیقت نگاری نہیں تھا۔ یہ شاعر کے ایمان دھرم کا نہیں بلکہ اُس کے تخیل کا امتحان ہوا کرتا تھا مگر شہنشاہ اکبر کے زمانے میں عرفی شیرازی نے غضب کیا تھا کہ اکثر قصیدوں میں بادشاہ یا امیر ساتھ ساتھ اپنی تعریف کا پہلو بھی لے آیا تھا۔ اُس کا مزاج کچھ ایسا ہی تھا اور اُس کا وہ شعر اقبال کے دل و دماغ پر نقش تھا جس میں کہا گیا تھا کہ خدا کی رحمت سے بعید نہیں کہ وہ عمل کے بغیر جنت دے دے مگر میری خودداری سے بعید ہے کہ میں ایسی جنت قبول بھی کر لوں![52]

اقبال نے لاٹ صاحب اور ڈائرکٹر تعلیم کی مدح کے لیے ذوق کے مشہور قصیدے، ''زہے نشاطِ فراواں اگر کیجیے اِسے تحریر'' کی زمین منتخب کی مگر واضح کیا کہ مہمانوں کا خیر مقدم کرنے والی قوم وہ ہے جس نے اپنی مدد آپ کے تحت ایسا شاندار کالج بنایا ہے۔ دل کی ولایت تلواروں سے نہیں بلکہ نگاہ سے تسخیر ہوتی ہے اور دُنیا میں جو تبدیلیاں آ رہی ہیں اُن کی وجہ سے بعض پرانے تصورات کو بدلنے کی ضرورت ہے مثلاً اِطاعت کا مقصد حکمرانوں کی خوشنودی نہیں بلکہ یہ اپنی چھپی ہوئی قوتوں کو مجتمع کرنے کا نسخہ ہے:

جو بزم اپنی ہے طاعت کے رنگ میں رنگیں

تو درس گاہ رموزِ وفا کی ہے تفسیر
اِسی اصول کو ہم کیمیا سمجھتے ہیں
نہیں ہے غیرِ اطاعت جہان میں اِکسیر

اِطاعت اور خودداری کا باطنی تعلق سرسید کی تحریک کے اُن رموز میں سے تھا جنہیں صرف اقبال ہی پوری طرح سمجھے تھے۔ قصیدے کا نام 'خیر مقدم' تھا اور اس میں بائیس اشعار تھے۔

قصیدے کی زمین ذوقؔ سے ضرور لی گئی تھی مگر بعض لحاظ سے اِس میں عرفی کا اثر جھلکتا تھا۔ وہ قصیدہ کہتے ہوئے اپنی خودداری کا اندازہ بھی کروا دیتا تھا اور یہاں شاعر نے اپنی قوم کی خودداری کا احساس دلوایا تھا:

مدد جہان میں کرتے ہیں آپ ہم اپنی
غریب دل کے ہیں لیکن مزاج کے ہیں امیر

عرفی کو بھی قصیدے میں سورج کی علامت سے معانی آفرینی پیدا کرنا مرغوب تھا اور اقبال نے بھی ڈائرکٹر تعلیم کو سورج سے بڑھ کر قرار دیا گیا تھا مگر سب سے بڑھ کر عرفی پن یہ تھا کہ بڑی صفائی سے پورے قصیدے کی تان اپنے نام پر لا کر توڑی تھی:

بڑھے جہان میں اقبال اِن مشیروں کا
کہ اِن کی ذات سراپا ہے عدل کی تصویر

اُنہی دِنوں ٹکسالی دروازے میں کسی دینی مدرسے کا طالب علم کوئی بوسیدہ کتاب دِکھا کر اپنی مذہبی تعلیم کے لیے خیرات مانگ رہا تھا جب بھاٹی دروازے کی جانب سے شلوار قمیض اور کوٹ میں ملبوس ایک صحت مند راہگیر کو آتے دیکھ کر اُس کی طرف بڑھا مگر اُس کی بدقسمتی سے یہ اقبال تھے۔ اُنہوں نے وہیں کھڑے کھڑے ایک تقریر کر دی جس کا خلاصہ تھا کہ اُنہیں ایسے مذہب سے کوئی سروکار نہیں جو دُوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا کر جینا سکھائے۔[۵۳]

ایک اور شام دہلی دروازے کی طرف جاتے ہوئے خود ہی کسی مولانا سے اُلجھ پڑے جو انگریزی کے خلاف وعظ کر رہے تھے۔ شاید ایک آدھ چلتا ہوا فقرہ بھی گُس دیا جس کی وجہ سے اُن کے منہ سے جھاگ بہنے لگا اور یہ کافر قرار پائے۔ چنانچہ دونوں واقعات ڈپٹی نذیر احمد کی پچھلے برس والی نظم کے قافیے میں لکھ ڈالے اور عنوان 'دین و دنیا' رکھا۔ شعر کی پختگی کے اعتبار سے اِس میں دِل کا غبار نکالنے کے سوا کچھ نہ تھا اور معیار پست تھا:[۵۴]

اِن سے پوچھو، ہند ہی کیا رہ گیا ہے آپ کو
اور بھی تو دیس ہیں آخر جہاں آرام ہے
باندھیے بستر کہ اِن وعظوں کی خاطر سامنے
انڈیمن ہے، چین ہے، جاپان ہے، آسام ہے

دراصل ایک گہرے خیال کا تعاقب شروع کر رکھا تھا یعنی دین و دنیا الگ نہیں اور اُن کا باہمی تعلق اسرار سے خالی نہیں ہے۔ مشرق رُوح کے نام پر دُنیا کو نظر انداز کرتا تھا اور مغرب میں دُنیا کی خاطر رُوح غیر ہوئی جا رہی تھی، "ایسی دنیا ہو تو نورالدین گنگا رام ہے۔" چنانچہ جن خیالات کا اظہار اقبال کرنا چاہتے تھے ان کا نمونہ مشرق میں تھا نہ مغرب میں بلکہ انہیں خود دریافت کرنا تھا جو ایک دن کا کام نہ تھا۔

منشی محبوب عالم نے نظم دیکھی تو چھاپنے سے معذرت کر لی۔ 'نالۂ یتیم' سے اب تک پہلا موقعہ تھا کہ انجمن کے اجلاس کے لیے اقبال کی نظم پیسہ اخبار کے مطبع سے نہ چھپے۔ آخر صدیقی پریس کے محی الدین نے چھاپی جو اقبال کے کالج کے زمانے کے دوست اور دینی کتابوں کے ناشر تھے۔ اب ایک شعر منشی محبوب عالم کی ہجو کا بھی شامل تھا:

آج کل لوگوں میں ہے انکار کی عادت بہت
نام محبوبانِ عالم کا یونہی بدنام ہے

درجن بھر اشعار محی الدین کی تعریف میں پریس میں بیٹھے بیٹھے سپردِ قلم ہوئے ہوں

گے۔وہ بھی شامل ہوئے۔۵۵

۴۴

انجمن حمایتِ اسلام کا سترہواں سالانہ اجلاس جمعہ ۲۱ فروری کو شروع ہوا۔ اُس روز دو نشستیں ہوئیں۔

اگلے روز دن کے جلسے کی صدارات خان بہادر علی خاں ریٹائرڈ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر نے کی جبکہ لفٹنٹ گورنر اور ڈائرکٹر تعلیم مہمانانِ خصوصی تھے۔ اقبال نے قصیدہ پڑھا۔

رات کو پانچویں نشست میں 'دین و دنیا' اپنے مخصوص ترنم میں سنائی۔ پرانے خیال کے لوگ ناراض ہو گئے۔

اگلے روز اقبال نے کسی نہ کسی طرح اُن کی بدگمانی دُور کر دی۔ اس روز نشست کی صدارت نظام الدین سب جج روالپنڈی کر رہے تھے۔ اقبال نے 'اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے' سنائی تو کاپیاں ہاتھوں ہاتھ بکیں اور قیمت دس روپے تک پہنچی۔ آخر میں جنابِ صدر نے کہا، ''شیخ صاحب کی تعریف جس قدر کی جائے کم ہے۔ آپ پنجاب کے ملک الشعرا ہیں۔''

اگلے روز انجمن کی روداد میں 'دین و دنیا' کے بارے میں لکھا گیا، ''اِس نظم سے بعض صاحبوں کو محض اُن کی اپنی خوش فہمی کی وجہ سے کچھ بدگمانی اور ناراضی سی پیدا ہوئی حالانکہ اِس نظم میں چند واقعات کا ذکر ہے جو شیخ صاحب کو پیش آئے۔ تاہم شیخ صاحب نے نہایت دُور اندیشی اور دانائی سے اِس بدگمانی کو دُوسرے دن رفع کر دیا جس سے سب صاحب خوش ہو گئے۔''۵۶

۴۵

پنجاب کا ملک الشعرا کہلانا خوب تھا جب پہلے ہی اہلِ زبان کی طرف سے طعنے مل

رہے تھے!

نہ یہ دلّی کی اُردو ہے نہ یہ پورب کی بولی ہے
زباں میری ہے اے اقبالؔ! بولی دردمنوں کی[58]

۳۶

'دین و دنیا' سے زِک اُٹھانے والوں میں صرف وہی نہ تھے جن پر اقبال نے چوٹ کی تھی۔ موچی دروازے میں اقبال کے دوست حکیم غلام نبی طبابت کرتے تھے۔ لوگوں نے سمجھا کہ ایک شعر میں اُن پر بھی طنز ہُوا ہے۔ اقبال کو تردید کرنی پڑی۔[59]

۳۷

شہیدِ جستجو ہے فکرِ انساں بزمِ ہستی میں
یہ کس اُلجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے کی باتیں ہیں؟

اِس غزل کے آٹھ شعر دستیاب ہیں۔[60]

۳۸

خدنگِ نظر لکھنؤ والوں کو اقبال کی قدر ہوئی یا شیخ عبدالقادر کو خود ہی خیال آیا بہرحال وہ مضمون لکھا جا رہا تھا جو اقبال کے بارے میں سوانحی اور تنقیدی تحریروں کے ختم نہ ہونے والے سلسلے میں فوقؔ کے تعارفی نوٹ کو چھوڑ کر پہلی تحریر تھی۔ شیخ عبدالقادر کے نزدیک اقبال کی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے فلسفہ، ویدانت اور مشرق و مغرب کی کئی زبانوں اور اُن کے ادب سے براہِ راست استفادہ کیا تھا جس کا اثر اُن کی شاعری میں محسوس کیا جا سکتا تھا۔

اقبال کے شجرۂ نسب کے بارے میں شیخ عبدالقادر کی معلومات وہی ہوں گی جو انہیں اقبال اور فوق نے فراہم کی ہوں گی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت خود اقبال کے گھر

والوں کے پاس دُرست معلومات نہ تھیں مثلاً شیخ عبدالقادر کو بتایا گیا کہ اقبال کے خاندان میں جس بزرگ نے اسلام قبول کیا اُن کے پوتے کسی سید کو پنجاب کی سیر کروانے پنجاب آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے جبکہ شیخ نور محمد کے والد جو اپنے بھائیوں کے ساتھ پہلے پہلے پنجاب میں آباد ہوئے وہ بابا لول حج کے پوتے نہ تھے بلکہ کئی پشت بعد آئے تھے۔ اُن کے پنجاب آنے کا سیدھا سادا سبب جو بتایا جا رہا تھا وہ کہانی بھی اقبال کے خاندان میں رائج رہی ہوگی۔

ابتدائی زمانے کا وہ ''دوست'' جس کی وفات نے اقبال کی شاعری میں درد و گداز پیدا کر دیا تھا عبدالقادر اُس کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور جانتے تھے اور ڈھکے چھپے الفاظ میں لکھ رہے تھے۔ یہ بھی لکھ رہے تھے کہ شادی کے معاملے میں اقبال زیادہ خوش قسمت ثابت نہیں ہوئے۔ اقبال کی اجازت کے بغیر ایک دوست ایسی بات شائع نہیں کروا سکتا تھا لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تک ازدواجی الجھنیں اتنی بڑھ چکی تھیں کہ اُنہوں نے رسالے میں تذکرہ کرنے کی اجازت دے دی:

کب ہنسا تھا جو یہ کہتے ہو کہ رونا ہوگا
ہو رہے گا مری قسمت میں جو ہونا ہوگا[۱]

غزل

دِل کی بستی عجیب بستی ہے
لُوٹنے والے کو ترستی ہے
ہو قناعت جو زندگی کا اُصول
تنگ دستی فراخ دستی ہے!
تابِ اظہارِ عشق نے لے لی

گفتگو کو زباں ترستی ہے
دیکھیے کیا سلوک ہو اقبالؔ
مجرمِ جرمِ بت پرستی ہے

مخزن، مارچ ۱۹۰۲ء

اِس غزل کے نو شعر دستیاب ہیں۔[۱۲] دوسرے شعر سے ذہن سالکؔ کے ایک شعر کی طرف جاتا ہے جو اُن دنوں بہت مشہور تھا:

تنگ دستی اگر نہ ہو سالکؔ
تندرستی ہزار نعمت ہے

۱۹ مارچ کو پنجۂ فولاد میں 'زبانِ حال' کے عنوان سے 'اسلامیہ کالج کا خطاب مسلمانوں سے' شائع ہوئی۔[۱۳]

۴۰

اقبال گورنمنٹ کالج میں اِس دفعہ بھی مستقل نہ ہو سکے۔ اسسٹنٹ پروفیسری مارچ میں ختم ہوئی اور واپس اورینٹل کالج آنا پڑا جہاں اسٹراٹن صاحب کالج میں نئی روح پھونکنے کے لیے دن رات ایک کیے ہوئے تھے۔

۴۱

نشے میں مست سمجھتا ہے مجھ کو کیوں واعظ
وہ وعظ اپنا کہے جائے ہوشیار ہوں میں
تڑپ کے شانِ کریمی نے لے لیا بوسہ
کہا جو سر کو جھکا کے "گناہ گار ہوں میں"

اِس غزل کے دس اشعار دستیاب ہیں۔[۱۴]

۴۲

نواب حبیب الرحمٰن شروانی اُس برس انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں شریک ہوئے۔ بھیکم پور کے روٴسا میں سے تھے۔ شبلی کی المامون پر تنقید سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا تھا اور پھر ندوۃ العلماٗ کے جلسوں میں ''علمائے سلف'' اور ''نابینا علماٗ'' وغیرہ مقالوں سے انہوں نے اپنی مستقل حیثیت قائم کرلی۔ ان کا ذاتی کتب خانہ مخطوطات اور مطبوعہ کتب کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔

انہیں اشعار سنانے میں اقبال کو خاص لطف آنے لگا۔ یہ شیخ عبدالقادر کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے لہٰذا جب تک لاہور میں رہے شعر و سخن کی محفلیں جمتی رہیں۔[۱۵]

۴۳

۳۱ مارچ کو کالج کی سالانہ رپوٹ میں درج کیا گیا کہ اقبال نے واکر اور سٹبز کی کتابوں کے تراجم مکمل کر لیے ہیں اور اب علم الاقتصاد پر نئی کتاب لکھ رہے ہیں۔ اپنی کتاب!

ان کے عہدے کی معیاد ختم ہو چکی تھی چنانچہ انہوں نے توسیعِ میعاد کے لیے درخواست گزاری۔ کالج کے افسران اُن کی خدمات کو قیمتی سمجھتے تھے لہٰذا امید تھی کہ شاید مزید دو سال کی توسیع مل جائے گی اور اس کے بعد یا اسی دوران محکمہٴ تعلیم میں کوئی اچھی ملازمت بھی۔[۱۶]

۴۴

پچیس برس کی عمر میں ایک مکمل علمی تصنیف کا مالک بننا بڑا خوبصورت خیال تھا۔ خاص طور پر اُس صورت میں جبکہ تین مقالے اس سے پہلے ہی میزان میں داخل ہو چکے ہوں۔

علم الاقتصاد پر اپنی کتاب کے لیے اُنہوں نے واکر کی پولیٹیکل اکانومی کو سامنے

رکھتے ہوئے بعض دوسری تصانیف سے بھی استفادہ کیا تھا مثلاً مارشل کی پرنسپلز آف اکنامکس۔ اقبال کے سابقہ اُستاد لالہ جیا رام اور ہم جماعت فضل حسین نے اُنہیں ''نہ صرف اپنے بیش قیمت کتب خانوں کی کتابیں ہی عنایت فرمائیں بلکہ بعض مسائل کے متعلق نہایت قابل قدر مشورے بھی دیئے۔'' اس کتاب کی زبان وہی اُردو تھی جو اُس عہد میں ایک ادبی زبان سے علمی زبان بننے کے عمل میں تھی۔ اور کتاب کی زبان پر اقبال اتنی ہی محنت کر رہے تھے جتنی اپنی غزلوں کی زبان پر کیا کرتے تھے۔ اُردو کو سنوارنے کا جذبہ جو اُس دور میں عام تھا اس نثر پارے کی تخلیق مین وہ بھی کسی نہ کسی حد تک کارفرما رہا ہوگا۔ ''میں اہلِ زبان نہیں ہوں،'' اقبال نے لکھا۔ ''جہاں تک مجھ سے ممکن ہوا ہے میں نے اقتصادی اصولوں کے حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزی علمی کتابوں میں عام ہے۔''[۱۷]

زبان میں اُنہوں نے جو تجربات کیے اُن میں یہ تجربہ بھی شامل تھا کہ جس طرح انگریزی میں فعل labour فاعل یعنی labourer کے معانی میں استعمال ہوتا تھا انہوں نے اُردو میں لفظ ''محنت'' محنت کش کے معانی میں استعمال کیا، ''جہاں کئی فارسی محاورات کے لفظی تراجم اُردو زبان میں مستعمل ہیں اگر اِس لطیف محاورۂ انگریزی کا ترجمہ بھی مستعمل کرلیا جائے تو کیا حرج ہے!''

اصطلاحات کا معاملہ ٹیڑھا تھا۔ اقبال نے بعض اصطلاحات خود وضع کیں اور بعض مصر کے عربی اخباروں سے حاصل کیں۔

علم الاقتصاد

دیباچہ (اقتباس)

کیا ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہوجائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا

دردناک نظارہ ہمیشہ کے لیے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے؟ اِس سوال کا جواب دینا علمِ اقتصاد کا کام نہیں۔ کیونکہ کسی حد تک اس کے جواب کا انحصار انسانی فطرت کی اخلاقی قابلیتوں پر ہوتا ہے۔ جن کو معلوم کرنے لیے اس علم کے ماہرین کوئی خاص ذریعہ اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتے۔ مگر چونکہ اس جواب کا انحصار زیادہ تر اُن واقعات اور نتائج پر بھی ہے جو علم الاقتصاد کے دائرۂ تحقیق میں داخل ہیں اس واسطے یہ علم انسان کے لیے انتہا درجے کی دلچسپی رکھتا ہے اور اس کا مطالعہ تقریباً تقریباً ضروریاتِ زندگی میں سے ہے۔[۱۸]

۴۵

ڈاکٹر وانٹ برجنٹ صاحب نے، جنھیں مشرقی زبانوں کے ساتھ خاص دلچسپی تھی، انگریزی زبان میں ایک مختصر مضمون اُردو پر لکھا تھا۔ کسی موقعے پر اُنھوں نے اقبال کو اس کی کاپی تحفۃً پیش کی۔[۱۹] اس مضمون کے مطابق اُنیسویں صدی میں اُردو نثر کی ترقی کے تین بڑے قومی سبب ہوئے۔ پہلا چھاپہ خانہ کا عام ہونا۔ دوم، انگریزی میں تعلیم (جس کا آغاز ۱۸۳۲ء میں ہوا تھا) جس کے بارے میں برجنٹ صاحب کا خیال تھا کہ ہندوستان کی کوئی زبان اِس مغربی اثر سے اِس قدر متاثر نہیں ہوئی جس قدر اُردو ہوئی تھی۔ تیسرا اہم سبب فارسی کے بجائے اُردو کا درباری زبان قرار دیا جانا تھا۔ ''اِس واقعہ کے اثر نے پٹنہ اور پشاور کے درمیانی ممالک کو اُردو کے زیرِ نگین کر دیا ہے اور چونکہ دہلی اور آگرہ کو اب دارالخلافہ ہونے کا شرف نہیں رہا اس واسطے (اُردو) کی ادبی تحریکات کے مرکز لاہور اور الہ آباد قرار پا گئے ہیں۔''

عبدالقادر نے اقبال سے درخواست کی کہ اس مضمون کو مخزن کے لیے ترجمہ کر دیں۔

۴۶

ہم اپنی دردمندی کا فسانہ
سنا کرتے ہیں اپنے رازداں سے"

اقبال کے بارے میں شیخ عبدالقادر کا مضمون خدنگِ نظر (لکھنؤ) کے مئی کے شمارے میں شائع ہوا۔

اقبال

چند سال پہلے لاہور میں ایک بزمِ مشاعرہ قائم تھی اور پنجاب کے اکثر نامور شعرا اس میں غزلیں کہہ کر لاتے تھے اور دادِ سخن پاتے تھے۔ کچھ کہنہ مشق حضرات بھی تھے جو دہلی یا لکھنؤ سے تعلق رکھتے تھے یا اساتذہ دہلی سے مستفید ہو چکے تھے۔ کچھ نوآموز تھے جوان حضرات میں سے کسی نہ کسی کے معترف تھے۔ مشاعرہ کیا تھا سخن وروں کا ایک خاصہ دنگل تھا۔ پہلے تلامذہ غزلیں پڑھتے تھے اور ایک دوسرے کے استادوں پر کوئی چوٹ کر جاتے تھے اور اپنے اپنے استاد کو بڑھا جاتے تھے۔ پھر استادوں کی نوبت آتی تھی۔ وہ بھی حریفوں کو پہچانتے تھے اور باہمی اشارے کنایہ سے رک نہ سکتے تھے۔ یہ دل لگی شاعری کو تو ڈبو رہی تھی مگر مشاعرہ کے باعثِ فروغ تھی۔ تماشائی جوق در جوق آتے تھے اور گھنٹوں یہ تماشا دیکھتے رہتے تھے۔ اس گروہ میں کبھی کبھی ایک کثیر تعداد سرکاری کالجوں کے طلبہ کی آ جاتی تھی۔ ان میں سے اکثر انگریزی تعلیم کی وجہ سے ایشیائی شاعری کے مذاق سے ناآشنا ہوتے تھے مگر تقضائے سن تھا کہ ایسے مشغلے کو دلچسپ سمجھیں۔ آتے تھے اور اپنے اپنے دوستوں کو بلا لاتے تھے۔ ایک دن مقابلہ سخن گستری حدِ جدال پر پہنچنے کو تھا کہ اچانک طلبہ کے گروہ میں سے ایک نوجوان اٹھا۔ عمر بیس سے کچھ متجاوز ہو گی۔ رواجِ وقت کے مطابق داڑھی چٹ، مونچھیں بڑھائی ہوئی، لباس نئے اور پرانے فیشن کے بین بین۔ سیدھا اُس کرسی کی طرف بڑھا جس پر بیٹھ کر شعرا غزل خوانی کرتے تھے اور بیٹھتے ہی مطلع پڑھا:

تم آزماؤ ہاں کو زباں سے نکال کے
یہ صدقے ہو گی میرے سوالِ وصال کے

مطلع کا پڑھنا تھا کہ کئی سخن آشنا کان متکلم کی طرف لگ گئے اور کئی آنکھیں اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ مشاعرہ میں یہ رسم تھی کہ دبیرِ مجلس ہر سخن ور کی تعریف کر کے اُس سے حاضرین کی شناسائی کرا دیتا تھا مگر اس نوجوان منچلے شاعر سے خود دبیرِ مجلس ناواقف تھا۔ ایک طرف سے آواز آئی کہ پہلے حضرت کی تعریف تو فرمائیے۔ نوجوان شاعر نے کہا، ''لیجیے میں خود عرض کیے دیتا ہوں کہ میں کون ہوں۔ خاکسار کو اقبال کہتے ہیں اور یہی میرا تخلص ہے۔ سیالکوٹ کا رہنے والا ہوں اور یہاں کے سرکاری کالج میں بی اے کی جماعت میں پڑھتا ہوں۔ حضرت داغ سے تلمذ کا فخر حاصل ہے۔ یہاں کے کسی بزرگ سے نہ خصوصیت ہے نہ خصومت۔ چند شعر لکھ کر لایا ہوں، اگر اجازت ہو تو پڑھ سناؤں۔'' مختلف آوازیں آئیں کہ فرمائیے۔ اور ہمارے نوجوان شاعر نے غزل کے باقی شعر پڑھنے شروع کیے۔ قریب قریب ہر شعر پر بیساختہ داد ملی یہاں تک کہ اس شعر پر پہنچا:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

مرزا ارشد گورگانی دہلوی تشریف رکھتے تھے۔ بے اختیار واہ واہ کہہ اٹھے اور بولے، ''میاں اقبال اس عمر میں اور یہ شعر!'' اور واقعی اس رنگ کی کہنے والے کی عمر اور وضع سے توقع نہیں ہوسکتی تھی۔ غرض اس طرح غزل ختم ہوئی اور مقطع میں شاعر نے دہلوی اور لکھنوی پارٹی کے جھگڑے پر اپنے خیال کا اظہار نہایت خوبی سے کر دیا اور اس میں شک نہیں کہ اس جھگڑے کے متعلق اہلِ پنجاب کا جو دونوں مقامات کے اصحابِ فن کے خرمن کے خوشہ چیں ہیں یہی مسلک ہونا چاہیے۔ مقطع یہ تھا:

اقبالؔ لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

یہ پہلا موقع تھا کہ لاہور کے سخن دانوں کو اس ابھرتے ہوئے شاعر سے شناسائی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد کبھی کبھی مشاعرہ ہوتا رہا اور سخن فہم حضرات اقبال کی غزلوں پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے رہے لیکن کچھ تو رفتہ رفتہ مشاعرے کی گرم بازاری نہ رہی کچھ امتحانات وغیرہ نے کالجوں کے طلبہ کو مصروف کر دیا اور کچھ عرصے کے لیے اقبال کی طباعی کا چرچا گورنمنٹ کالج لاہور کے طلبہ اور ان کے ملنے والوں تک محدود ہو گیا۔ پہلا عام جلسہ جس میں دوستوں کے اصرار نے اقبال کو پبلک کے روبرو کھینچ بلایا انجمن حمایت اسلام کا عظیم الشان جلسہ بابت ۱۸۹۹ء تھا جہاں اُس نے ''نالۂ یتیم'' کے عنوان سے ایک دل گداز نظم پڑھی۔ یہ نظم ایسی مقبول ہوئی کہ جلسے میں بار بار اس کے پڑھنے کی فرمائش ہوتی تھی اور اس پر یتیم خانے کے لیے چندے کی بارش ہو رہی تھی۔ اِس نظم نے اُس شہرت کی بنیاد رکھی جو اب اطرافِ ہند کو گھیرتی جا رہی ہے۔ اِس سے قبل خود کارکنانِ انجمن کو اُن کے نام اور جوہر سے یہاں تک ناواقفیت تھی کہ انہوں نے یہ دیکھ کر کہ شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے پاس کر چکے ہیں یہ قیاس کر لیا کہ وہ نظم انگریزی فرمائیں گے اور پروگرام میں اُن کے نام کے مقابل نظم انگریزی چھاپ دیا۔ اُن کے احباب کو یہ کیفیت دیکھ کر ہنسی آئی مگر انہوں نے کہا کہ خیر لوگ خود ہی دیکھ لیں گے کہ کم ازکم اِس شخص کی حالت میں انگریزی خوانی مذاقِ زبان اور علومِ مشرقیہ کے پڑھنے میں سدِ راہ نہیں بنی، اور ایسا ہوتا بھی کیوں! کیونکہ اس کی انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کی علومِ مشرقیہ کی تعلیم میں بھی پوری کوشش کی گئی تھی اور وہ ان چند آدمیوں میں ہیں جو اعلا درجے کی انگریزی دانی کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی سے بھی اچھی واقفیت رکھتے ہیں اور مزید لطف یہ ہے کہ سنسکرت سے بھی نا آشنا نہیں۔

'نالۂ یتیم' کے پڑھے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حاضرین جلسہ جس میں پنجاب اور

ہندوستان کے اکثر اضلاع سے لوگ آئے ہوئے جمع تھے، اپنے اپنے ہاں اس نظم کے اثر کو لے گئے اور اُس دن سے آج تک نہ صرف انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے کے پروگرام میں نظمِ اقبال ایک جزوِ ضروری بن گئی ہے بلکہ لاہور میں کوئی اور بھی عظیم الشان جلسہ بغیر نظمِ اقبال کے مکمل نہیں ہوتا۔ اپریل ۱۹۰۱ء سے رسالہ مخزن کے اجرا نے اقبال سے اخبار بین دنیا کو شناسا کر دیا ہے اور جو کلام اُن کا اس رسالے میں شائع ہوا ہے وہ قوتِ بیان اور جوشِ سخن کے ساتھ اعلیٰ درجے کی علمی معلومات کا ثبوت دے رہا ہے اور صاف بتا رہا ہے کہ کہنے والا انگریزی عربی اور فارسی علمِ ادب پر اچھا عبور رکھنے کے علاوہ سنسکرت اور بھاشا کے علمِ ادب کے بھی قدر دانوں میں ہے اور اپنے کلام کو ایسا گلدستہ بنا دیا ہے جس میں مختلف گلشنوں کے پھول ترتیب سے جمع کیے ہوتے ہیں۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ ایسا پختہ اور وسیع مذاق پچیس چھبیس سال کی عمر میں کیونکر پیدا ہو گیا ضرورت ہے کہ شیخ محمد اقبال کی ابتدائی عمر اور تعلیم و تربیت پر مختصر اً نظر ڈالی جائے۔

ہمارے خیال میں اس میں وراثت کو بھی دخل ہے اور تربیت کو بھی۔ شیخ صاحب کاشمیری الاصل ہیں اور انہیں کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق ہے جس کی ایک شاخ اب تک وطنِ اصلی میں موجود ہے۔ خاندان کی وہ شاخ جس میں شیخ صاحب ہیں دوسو سال ہوئے مسلمان ہو گئی۔ گوت ان کی ''سپرو'' ہے اور ان کے بزرگوں کا اسلام پر ایمان لانا ایک ولی کے ساتھ عقیدت کی وجہ سے ہوا۔ جو بزرگ اول میں مسلمان ہوئے اُن کے پوتے پنجاب میں آ کر آباد ہوئے اور اس نقل مکان کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ خاندانِ سادات کے ایک بزرگ کے بیٹے کو پنجاب کی سیر کرانے کی تقریب سے یہاں آئے اور آخر یہیں کے ہو رہے:

غربت کے مشغلوں نے وطن کو بھلا دیا
خانہ خراب خاطرِ الفت شعار کا

اِس حکایت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اہل اللہ سے ارادت اور مشائخ اور اولیاً کی

نسبت حسنِ عقیدت اس خاندان کی طبیعتوں کا جزو ہو چکے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ شیخ محمد اقبال کے والد اگرچہ اُمّی ہیں تصوف کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور صوفیا کے اکثر حالات پر حاوی ہیں اور اُن کے اقوال انہیں یاد ہیں۔ یہ موروثی مذاق ہمارے نوجوان شاعر میں بھی موجود ہے اور اُس کی شاعری کا ضروری جزو بن گیا ہے۔

شیخ محمد اقبال کے زمانہ تعلیم میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں جو خصوصیت سے قابلِ ذکر ہو۔ اکثر مسلمان بچوں کی طرح کچھ دنوں مکتب کی ہوا کھائی۔ پھر مدرسے میں داخل ہوئے، انگریزی شروع کی پھر کالج کے مدارج میں پہنچے اور زینہ بزینہ چڑھتے گئے۔ ہاں مدرسے میں پڑھنے اور سیالکوٹ کالج میں ایف اے کے درجے میں تعلیم پانے کے متعلق یہ جتانا ضروری ہے کہ وہاں ایک استادِ مشفق کی توجہ خاص نے ان کی طبیعت اور مذاق کے بنانے میں معتد بہ حصہ لیا۔ سیالکوٹ کے اسکاچ مشن کالج کو حسنِ اتفاق سے زبانِ عربی اور فارسی کی تدریس کے لیے ایک ایسے بزرگ دستیاب ہو گئے ہیں جن کی ذات نہ صرف اس تعلیم گاہ اور شہر سیالکوٹ کے لیے بلکہ پنجاب بھر کے لیے مغتنمات سے ہے۔ نامِ نامی ان کا مولینا سید میر حسن صاحب ہے اور اعلا درجے کے بامذاق اصحاب میں ہیں۔ علم اور اہلِ علم کے شیدائی، ذوقِ کلام کے فدائی اور جویا۔ مولوی سید میر حسن اب تک ایسے طالب علم ہیں کہ جو ملے، جہاں ملے، جس سے ملے اور جب ملے، حاصل کرتے جاتے ہیں اور چھوڑتے نہیں۔ اس بات کا نتیجہ یہ ہے کہ جس شخص کو اُن کی صحبت سے فیض پہنچا ہے وہ کچھ بن کے نکلا ہے۔ متعدد ہندو نوجوان ان کے شاگردوں میں ایسے ہیں جو اُردو فارسی تو خیر معمولی بات ہے، عربی زبان میں اعلا درجے کا مذاق لے کر نکلے ہیں اور یونیورسٹی کے امتحانوں میں مسلمانوں سے بڑھ کر نمبر پا گئے ہیں۔ مولوی صاحب کی یہ عادت ہے کہ اگر کسی شاگرد کو ہونہار دیکھیں تو اُسے معمولی درسِ تعلیم تک محدود نہیں رہنے دیتے بلکہ خارج از وقتِ مدرسہ اُسے بعض دلچسپ اور مفید کتابوں پر عبور کرا دیتے ہیں۔ پس جب سید میر حسن جیسے استاد کو اقبال سا شاگرد مل

گیا تو انہوں نے کوئی دقیقہ اُن جوہروں کو چلا دینے میں جو قدرت نے طبیعت میں امانت رکھے تھے اُٹھا نہیں رکھا۔ سید صاحب کا خاصہ تھا کہ باوجود خود ذوقِ شعر میں سرشار ہونے کے اکثر طلبہ کو شاعری سے روکتے تھے مگر اقبال کی طبیعت کا اندازہ اُنہوں نے شروع ہی سے کر لیا تھا اور اُس کے ذوقِ شعر کی قدرتی چیکے چیکے دیکھتے گئے اور اُس کے گھٹانے کی کوشش نہیں کی۔ شعر کا شوق تو اقبال نے بچپن سے پایا تھا۔ اس کے والد کی زبانی ایک دوست کو معلوم ہوا ہے کہ بچپن میں جو پیسے جیب خرچ کے لیے گھر سے ملتے تھے اُن کے منظوم قصے خرید لاتا تھا اور زبانی یاد کر لیتا تھا مگر سید میر حسن صاحب کے فیضانِ صحبت کے زمانے میں اس شوق کو بیحد ترقی ہوئی۔ سید صاحب کو بے شمار اچھے اچھے شعر اساتذہ کے زبانی یاد ہیں۔ جو شعر وہ پڑھتے اقبال اُسے لکھ لیتا اور یاد کر لیتا۔ دیوانِ غالب سبقاً اُن سے پڑھا اور ''ناصر علی ہندی'' کے دلآویز فارسی شعر بھی اُسی زمانے میں نظر سے گزرے۔

امتحان انٹرنس پاس کرنے کے بعد اقبال نے جناب نواب فصیح الملک نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی اُستاد حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ سے بذریعہ خط و کتابت تلمذ کی ٹھہرائی اور کچھ عرصے تک غزل میں اُن سے اصلاح لیتے رہے۔ جب سے نئے رنگ میں مخمس اور مسدس اور ترجیع بند لکھنے شروع کیے ہیں اُس وقت سے خود اپنی اصلاح کرنے لگے ہیں۔ گو طبیعت کی روانی بسا اوقات نہایت عجلت میں شعر زبان سے نکلواتی ہے اور کبھی اپنے شوق اور کبھی احباب کی فرمائش سے وہ قلم بند بھی ہو جاتے ہیں مگر اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ مہینوں کھٹائی میں پڑے رہتے ہیں۔ جب ذرا فرصت ملی انہیں پڑھا اور جہاں کوئی لفظ کھٹکا تھوڑی اصلاح کر دی، پھر پڑھا اور پھر کہیں کچھ کر دیا۔ کبھی بہت ضرورت محسوس ہوئی تو کسی بامذاق دوست کے سامنے پڑھ کر اُس کی تنقید سن لی اور اگر کچھ کام کی بات تنقید میں مل گئی تو اُس سے فائدہ اُٹھا لیا۔

جس سال حضرت داغ سے اصلاح لینے کا سلسلہ شروع ہوا اُسی سال اقبال کی زندگی

میں ایک اور واقعہ پیش آیا جسے ہمارے اہلِ ملک عموماً معمولی سمجھتے ہیں مگر جس کا ہر شخص کی زندگی پر عظیم الشان اثر پڑتا ہے یعنی اُن کی شادی ہو گئی۔ پنجاب کے ایک معزز خاندان میں اُنھیں نسبتِ فرزندی حاصل ہوئی۔ گو بظاہر یہ تعلق بہمہ وجوہ جانبین کے لیے مفید اور مناسب تھا مگر چونکہ یہاں رشتہ داریاں نوعمر لڑکوں کی استرضا کے بغیر ہی کر دی جاتی ہیں اس لیے شیخ محمد اقبال باعتبار شادی بہت خوش قسمت ثابت نہ ہوئے اور اس واقعے نے طبیعت کی بشاشی اور شگفتگی کو اُداسی سے بدل دیا۔ اُنھیں ایام میں ایک پیارے دوست کے انتقال نے غم کی آگ پر اور تیل ڈال دیا اور طبیعت کا رنج اشعار سے ٹپکنے لگا اور اُس درد نے شاعری کا وہ حصہ عطا کر کے جسے گداز کہتے ہیں اقبال کو پورا شاعر بنا دیا۔ ہندوستان میں شاعری کی ستۂ ضروریہ میں لاگ یا لگاؤ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ حالی جیسے متین شاعر نے اِسے ''چیز وہ مضمون بجھانے والی'' لکھا ہے اور دیگر اساتذہ نے بھی کسی نہ کسی رنگ میں کسی نہ کسی کے ساتھ لگاؤ پیدا کیا ہے اور اس سے کلام میں واقفیت اور جوش کی چاشنی پیدا کی ہے جس کے بغیر کلام پھیکا رہ جاتا ہے۔ ہمارے اقبال بھی اس سے خالی نہ رہے۔ کسی کی شوخی کے قائل ہوئے اور کلام میں رندانہ رنگ کی جھلکیاں نظر آنے لگیں اور بہت سے معاملے کے اشعار نکلنے لگے۔ یہ رنگ اب تک باقی ہے مگر فلسفہ کا رنگ اس پر غالب آ جاتا ہے۔ طبیعت فلسفیانہ پائی تھی اس لیے بی اے کے امتحان میں فلسفہ کا مضمون لے کر پاس ہوئے۔ بعد میں ایم اے میں بھی فلسفہ پڑھنے کا شوق ہوا اور اِس شوق کا زیادہ تر باعث یہ تھا کہ اس زمانے میں مسٹر ٹی ڈبلیو آرنلڈ صاحب جو علی گڑھ کالج کے مشہور پروفیسر تھے گورنمنٹ کالج لاہور میں چلے آئے۔ فلسفہ دانی میں اُن کی شہرت عالمگیر ہے محتاجِ بیان نہیں اور اس شہرت نے اقبال کو بے اختیار اپنی طرف کھینچا مگر قابلِ ذکر یہ امر ہے کہ شاگرد کی طبیعت یہاں بھی شفقتِ استاد کے لیے اچھا خاصہ مقناطیس ثابت ہوئی۔

جادو عجب نگاہِ خریدار دل میں تھا

بکتا ہے ساتھ بیچنے والا بھی مال کے

خود آرنلڈ صاحب بھی اقبال کی تیز فہمی اور اُس کے فلسفیانہ دماغ کے معترف ہو گئے۔ اُنھوں نے اسے شاگردی کے مرتبت سے رفتہ رفتہ دوستی کے اعزاز تک پہنچا دیا ہے اور اقبال کے بہترین دوستوں اور عنایت فرماؤں میں ہیں۔ وہ ایک دفعہ فرماتے تھے کہ ایسا شاگرد اُستاد کو محقق بنا دیتا ہے اور محقق کو محقق تر۔ کئی مسئلے دورانِ تعلیم میں ایسے آئے جن کی تحقیقاتِ مزید کی غرض سے آرنلڈ صاحب بہادر کو یورپ کے نامور فلسفہ دانوں سے خط و کتابت کرنی پڑی اور یہ خط و کتابت استاد شاگرد دونوں کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ فلسفے کے شوق کا یہ بھی نتیجہ ہوا کہ اقبال کچھ دنوں ہندو فلسفے کے مطالعے میں مستغرق رہا اور اُس نے ایک دوست کو بتایا کہ اس فلسفے کے مطالعے سے طبیعت میں ایک قسم کا سکون محسوس ہونے لگا اور شانتی کے معنی سمجھ میں آ گئے اور اسی سبب سے اب مذہب میں تعصب کی گنجایش نہیں رہی اور سب مذاہب کی دل سے تعظیم کرتے ہیں اور اُن کو بھلا جانتے ہیں مگر یہ بھلا جاننا اپنے مذہب کے عشق کے منافی نہیں گو میدانِ عمل میں ابھی صفِ عشاقِ مذہب میں نہیں آ سکتے۔

ایم اے پاس ہونے کے بعد شیخ محمد اقبال اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ و فلسفہ و سیاستِ مدن کے مضامین پر لکچر دینے کے لیے مقرر کر دیے گئے۔ اس عہدے کی میعاد دو سال ہوتی ہے۔ اب وہ دو سال ختم ہو چکے ہیں مگر افسرانِ کالج ان کی خدمات کو ایسا قیمتی سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے توسیعِ میعاد کے لیے سفارش کی ہے اور اُنھیں غالباً اور دو سال کے لیے وہاں رہنا ہوگا۔ اس کے بعد یا اسی اثنا میں اغلب ہے کہ انھیں صیغۂ تعلیم میں کوئی معقول ملازمت مل جائے کیونکہ اکثر عہدہ دارانِ تعلیم کی رائے ان کی نسبت اچھی ہے اور وہ اُن سے تعلیمی خدمت لینے کے خواہشمند ہیں۔ آج کل علمی مشاغل میں انہماک ہے۔ نثر میں مضمون سیاستِ مدن پر ایک بیش بہا اور جامع کتاب زیرِ تصنیف ہے اور نظم میں عموماً انگریزی شعرا کی طرز پر معنی خیز نظمیں لکھتے ہیں جن میں سے اکثر

بذریعہ مخزن اشاعت پا چکی ہیں۔فرمائشی کلام سے بہت گھبراتے ہیں اور کم ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ محض فرمائش سے شعر کہہ دیں اور حقیقت یہی ہے کہ شعر وہ چیز نہیں کہ کسی کے اصرار سے ہو جائے، یہ تو طبیعت کا ایک بے اختیار جوش ہے اور دل کا ابال ہے اور پورا لطف اسی میں ہے کہ بیساختہ زبان پر جاری ہو۔

اقبال کے حالاتِ زندگی کے اِس مختصر خاکے کو ختم کرنے سے پہلے شاید بے جا نہ ہوگا کہ اُس کے کلام پر نگاہ ڈالی جائے۔اقبال کا کلام ابھی کمیت میں اکثر مشہور شعرا کے برابر نہیں پہنچا مگر کیفیت میں اندازِ خاص رکھتا ہے۔اول تو بھرتی کے اشعار اس کے کلام میں کم پائے جائیں گے۔بقول داغ، ع اُس کے ہر شعر میں ترکیب نئی بات نئی نظر آتی ہے۔غزل کے اکثر اشعار واقفیت کا رنگ لیے ہوتے ہیں اور تصنع ان میں بہت کم نظر آتا ہے مگر طبیعت اپنے جوہرِ اصلی مسلسل نظموں میں دکھاتی ہے گو اُن میں بعض بند مشکل پسندی کے نمونے ہیں۔کئی سخن فہم حضرات نے اِس مشکل پسندی پر اعتراض کیا ہے اور ایک حد تک یہ اعتراض بجا بھی تھا مگر اس کا اثر اقبال کی طبیعت پر ابتدا میں اچھا نہیں پڑا۔بجائے اس کی اصلاح کی فکر کے اس کا قصد ہوا کہ شعر گوئی ترک کر دے۔چنانچہ ایک دو بے تکلف دوستوں کے روبرو اِس خیال کا اظہار بھی کر دیا مگر اُنہوں نے سمجھایا کہ اگر کہیں ایک شعر ایسا نکلتا ہے جس پر کوئی درست اعتراض وارد ہو سکے تو دس ایسے نکلتے ہیں جن کی خوبی کو سب مانتے ہیں اور ترکِ شعر گوئی ملک کی شاعری کو ضرر رساں ہو گا اور اُسی زمانے میں دُور دُور سے دادیں آنے لگیں۔منجملہ دیگر اصحاب کے مولینا شبلی نعمانی جیسے نکتہ رس مشہور عالم نے بدین الفاظ داد دی کہ "جب آزاد اور حالی کی کرسیاں خالی ہوں گی تو لوگ آپ کو ڈھونڈیں گے۔" اِن باتوں نے اقبال کی ہمت پھر بندھا دی۔اعتراض کا ایک حصہ جو اختیاری تھا رفع ہو جاتا ہے اور اب پہلے سے زیادہ ایسے اشعار اقبال کے قلم سے نکلتے ہیں جو زور کے ساتھ ساتھ سادگی اور سلاست کی خوبیوں سے بھی آراستہ ہوتے ہیں مگر اعتراض کا ایک حصہ غیر اختیاری تھا اور وہ رفع نہیں ہوا اور

نہیں ہوسکتا۔ اُردو زبان ابھی بمقابلہ انگریزی کے ابتدائی حالات میں ہے۔ انگریزی شاعری میں خصوصاً فلسفہ میں اکثر خیالات ایسے ہیں جو موجودہ اُردو الفاظ اور سیدھی سادھی ترکیبوں [...؟] کی ضرورت ہے یا ذرا پیچیدہ ترکیبوں کی اس لیے ع: اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے، ایک طرف تو شاعر اپنے سامعین کی طرف جھکے اور ان کی سطح پر اترنے کی کوشش کرے اور اس سے زیادہ سامعین اپنے مذاق کو بڑھائیں اور معلومات کو وسیع کریں۔ اس کی بلند پروازی کا تتبع کریں۔ اصل اندازہ تو کسی کے کلام کا اُس کے بعد کی نسلیں لگاتی ہیں اور اس لیے اس کے معاصرین کے لیے موقع صحیح اندازے کا نہیں ہوسکتا مگر اتنا کہنے میں ہمیں تامل نہیں کہ جو کچھ اقبال نے اب تک لکھا ہے وہ اس اعتبار سے کہ ایک نوجوان انگریزی خوان کا کلام ہے جس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ علومِ انگریزی کی تحصیل میں صرف کیا ہے اور جسے اہلِ زبان ہونے کا دعویٰ نہیں، نہایت بے بہا ہے اور اس حصۂ ملک کے لیے جسے اب وہ اپنا وطن کہتا ہے مایۂ فخر و ناز ہے۔''۴۶

۴۷

اقبال نے احمدیت کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیا۔ 'خطِ منظوم (پیغامِ بیعت کے جواب میں)' اکتالیس شعر کا قطعہ تھا جس میں احمدیت کا نام لیے بغیر اشارہ کیا گیا تھا کہ اس کی وجہ سے مسلم قومیت میں دراڑ پیدا ہو سکتی تھی:

بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
ایسے مذہب کو کیا سراہوں میں
بت پرستی تو ایک مذہب ہے
کفر غفلت کو جانتا ہوں میں
مرگِ اغیار پر خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہوں میں

''بھائیوں میں بگاڑ'' کا اشارہ بظاہر مرزا غلام احمد کے اِس حکم کی طرف اشارہ تھا کہ کوئی احمدی کسی غیر احمدی کے جنازے میں شریک نہ ہو مگر بھائی کون تھے؟ ظاہر ہے کہ بھائیوں سے مراد قوم تھی کیونکہ پچھلی نظم کے ساتویں بند میں اسلامیہ کالج نے خطاب کرتے ہوئے مسلم قومیت کے لیے ''عشقِ اِخواں'' یعنی بھائیوں کی محبت کی اصطلاح استعمال کی تھی۔

جس غفلت کو یہاں کفر کہا گیا وہ دین و دنیا کو الگ کر کے قوم کے معاملے میں دھوکہ کھا جانا ہی ہو سکتی تھی جس کا ذکر پچھلی نظم کے اُسی بند میں ہوا تھا۔ مسلم قومیت کا یہ تصور سرسید کے اُس نکتے کی بازگشت تھا جو اُنہوں نے مرزا غلام احمد کے بارے میں میر حسن کو اپنے خط میں لکھا تھا۔ میر حامد شاہ نے دعوتِ بیعت میں عقلی دلائل پیش کیے ہوں گے کیونکہ اقبال نے اب عشقِ رسول کو اپنی دلیل بنایا:

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا
بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں

دل کے جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ اصل بات حقیقت کو سمجھنے کے بعد اُس کا براہِ راست مشاہدہ کرنا ہے یعنی وہی جو رومی نے کہا تھا کہ انسان صرف ذوقِ دید کا نام ہے۔ یہ تنہا عقل کے بس کا کام نہیں کیونکہ وہ زمان و مکاں سے وابستہ ہے جبکہ دِل اِس قید سے آزاد ہے۔ یہ مکالمہ سنوانے کے بعد شاعر نے کہا:

ہائے یہ دل ہو میرے پہلو میں
تُو یہ سمجھے کہ دہریا ہُوں میں
اہلِ دل کو بگاڑ سے مطلب؟
سب بزرگوں کی خاکِ پا ہُوں میں
فیض اقبال ہے اُسی دَر کا
بندۂ شاہِ لافتیٰ ہُوں میں[۴۲]

یہی وسعتِ نظری اور طوفانِ نور میں غرق ہونے کی تمنا اُنہی دنوں ایک اور نظم میں بیان ہوئی جو مسدس کی صورت میں تھی اور اُس میں نو بند تھے۔ اس کا عنوان 'آفتابِ سحر' تھا۔[43]

مئی میں 'خطِ منظوم' مخزن میں اور 'آفتابِ سحر' خدنگِ نظر میں شائع ہوئی۔

۴۸

جنوبی ہند میں انقلابی رہنما بال گنگا دھر تلک نے شیواجی کے تہوار منانے شروع کیے تھے جن پر مسلمانوں کو محسوس ہوتا تھا جیسے اُن کی تاریخ کا مضحکہ اُڑایا جا رہا ہے۔ انتہا پسندوں کا موقف یہ نظر آتا تھا کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنے کا کوئی حق نہیں جب تک وہ اسلام ترک نہ کر دیں۔

'صدائے درد' میں شاعر نے اپنے تصور میں گنگا کے کنارے کھڑے ہو کر یہی درد بیان کیا:

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی
کُچھ اِسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی
رُوح کا جوبن نکھرتا ہے اِسی تدبیر سے
آدمی سونے کا بن جاتا ہے اِس اکسیر سے
رنگِ قومیّت مگر اِس سے بدل سکتا نہیں
خونِ آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں
وصلِ محبوبِ ازل کی ہیں یہ تدبیریں سبھی
اِک بیاضِ نظمِ ہستی کی ہیں تفسیریں سبھی
ایک ہی مَے سے اگر ہر چشمِ دل مخمور ہے
یہ عداوت کیوں ہماری بزم کا دستور ہے؟[44]

یہ نظم مخزن میں جون میں شائع ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ایک غزل بھی جس کے گیارہ شعر دستیاب ہیں:

عشق وہ چیز ہے کہ جس میں قرار
چاہیے بے قرار ہونے کو[۵۹]

۴۹

اسٹراٹن صاحب کی صحت کو ہندوستان کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ وہ بیمار رہنے لگے تھے۔ جون کے آخر تک اُن کی طبیعت کافی خراب ہوگئی۔

۵۰

بارہ مولہ کشمیر کے رئیس عبدالصمد ککڑو فارسی میں شعر کہتے تھے۔ مقبل تخلص تھا۔ اقبال سے مراسم تھے۔

غالباً جون میں عبدالصمد کا جوان بیٹا خواجہ غلام حسن انتقال کر گیا۔ یہ غم سے اتنے نڈھال ہوئے کہ فرزند کا مرثیہ کہنے کی تاب نہ رہی۔ اقبال نے ان کی طرف سے مرثیہ لکھا:

اندھیرا صمد کا مکاں ہو گیا
وہ خورشیدِ روشن نہاں ہو گیا

سولہ (۱۶) اشعار کا یہ مرثیہ جولائی کے مخزن میں 'ماتم پسر' کے عنوان سے شائع ہوا۔[۶۰]

'خطِ منظوم' جو پچھلے ماہ مخزن میں شائع ہوئی تھی ۱۴ جولائی کو ہفت روزہ پنجہ ء فولاد میں بھی چھپ گئی۔[۶۱]

۵۱

جولائی کے وسط میں اسٹراٹن صاحب آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے کالج سے چھٹی لے کر وادیٔ کشمیر روانہ ہو گئے۔ وہاں ان کی تکالیف میں کوہستانی بخار کا اضافہ ہو گیا۔ اگست کے خاتمے تک یہ خبر لاہور پہنچ چکی تھی کہ اسٹراٹن صاحب کشمیر میں انتقال کر گئے ہیں۔[۴۸] اقبال نے اُن کی نوجوان بیوہ کے نام تعزیت نامہ لکھا:

"...I believe it is through Dr. Straten's influence that some people here are thinking of joining American universities, and I am one of them."

۵۲

لٹریری سوسائٹی یا انجمن اتحاد مدت ہوئی خواب و خیال ہو چکی تھی۔ ایک دن احمد حسین خاں کو اسے دوبارہ زندہ کرنے کا خیال آیا۔[۴۹] غالباً ۱۳ جون کو اعلان کیا کہ اگلی شام انجمن اتحاد کا مشاعرہ ہے۔ اس عجلت میں بڑے شعرا وقت نہ نکال سکے مگر لوگ خاصی بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔ زور کی آندھی چلی اور بارش ہوئی جس کی وجہ سے مشاعرہ دو دن بعد تک ملتوی کرنا پڑا۔

۱۶ جون کی شام بقول پنجۂ فولاد "صرف دو تین لڑکوں نے ہی مصرع طرح پر معمولی غزلیں پڑھیں"، مگر جیسا کہ اُس دور کا مزاج بن چکا تھا بزم میں دو سنجیدہ مضامین بھی پڑھے گئے۔ ایک مضمون تو احمد حسین کا اپنا ہی تھا۔ دوسرا مولوی ممتاز علی کا لیکچر تھا۔ دونوں کا موضوع 'تہذیبِ نسواں' تھا اور کسی منشی حامد حسین کی نظم بھی شاید اسی پر تھی۔

۱۸ جون کو پنجۂ فولاد کے شمارے میں ایک مضمون مشاعرے کے بارے میں بھی تھا۔ لکھنے والے کا نام درج نہیں تھا مگر اس میں تین باتیں ایسی ہیں جس کی وجہ سے اس پر اقبال کی تحریر کا شبہ ہوتا ہے۔

اوّل، احمد حسین کی تعریف کے ساتھ ساتھ بڑی شائستگی سے اُن پر چوٹ کی گئی

ہے ''جن کی ان تھک ہمت'' کے باعث انجمن اتحاد دفعتاً پھر کتمِ وجود میں آ گئی ... دفعتاً کا لفظ میں نے اِس لیے لکھا ہے کہ تاریخِ مشاعرہ سے دو دِن بھی پہلے نوٹس شائع نہیں کیا گیا۔'' اقبال اور احمد حسین خاں عام طور پر حریف سمجھے جاتے تھے۔

دوم، مضمون کے آخر میں تجویز پیش کی گئی تھی، ''میرے خیال میں اگر مشہور علم دوست پروفیسر آرنلڈ کو اس لٹریری سوسائٹی کا لائف پریذیڈنٹ قرار دیا جائے تو یہ اَنسب ہوگا۔ عجب نہیں اگر مسٹر آرنلڈ ہی ڈاکٹر لائٹنر ثانی بن کر اس لٹریری سوسائٹی کو مرحوم انجمن پنجاب سے بھی زیادہ بارونق کر دیں۔''

سوم، اس تحریر میں تہذیبِ نسواں کے متعلق ملے جلے جذبات تھے۔ احمد حسین خاں اور حامد حسین کی نگارشات کی تعریف تھی، ممتاز علی صاحب کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی گئی اور آخر میں کہا گیا، ''یہ کسی قدر نامناسب بات معلوم ہوتی ہے کہ مشاعرہ ہو سوسائٹی کا اور تمام وقت ایک ہی مضمون (موضوع) پر صرف کیا جائے۔''

تہذیبِ نسواں کے معاملے میں اقبال کی رائے اُلجھی ہوئی تھی۔ وہ عورتوں کے بعض حقوق کے حامی تھے جو اُن کے خیال میں اسلام نے عورتوں کو عطا کیے تھے مگر عورتوں کی تعلیم اور معاشرتی اصلاح کے لیے جو عام تحریکیں شروع ہوئی تھیں اُن سے بیزار تھے۔ پنجاب میں سب سے سرگرم تحریک کے مبلغ مولوی ممتاز علی تھے جو کسی زمانے میں علی گڑھ میں بھی رہ چکے تھے اور ان کی کتاب حقوقِ نسواں کے مسودے کو سر سید احمد خاں نے اِن کے سامنے پرزے پرزے کر کے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا تھا۔ یہ اب لاہور سے رسالہ تہذیب نسواں عورتوں کے لیے اور پھول بچوں کے لیے شائع کرتے تھے۔ اقبال ان کا ادب کرتے اور انہیں اپنا بزرگ مانتے تھے جس کی ایک وجہ شاید یہ ہو کہ مولوی ممتاز علی کی بیگم اُنہی شفیع احمد صاحب کی بیٹی تھیں جو غدر کے بعد سیالکوٹ آئے تھے اور جن کی مدد سے مولوی میر حسن نے اپنی اُردو صاف کی تھی مگر اس قریبی تعلق کے باوجود اقبال کے لیے ممتاز علی کی تحریک سے ہمدردی محسوس کرنا ممکن

نہ تھا۔

بہت دنوں پہلے سرسید نے جو بات مولوی ممتاز علی سے کہی تھی وہ اُس زمانے کے اکثر مسلمان مردوں کے احساسات کی ترجمانی کرتی تھی۔ مولوی صاحب کی کتاب کے پرزے کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا، 'ممتاز علی! ہماری حکومت چھن گئی۔ ہماری تہذیب مٹ گئی۔ اب کیا ہماری عورتیں بھی ہمارے قبضے سے نکل جائیں گی؟''[۸۰]

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

باب ۸

سورج کے سامنے

۱۹۰۲ء

۱

برہمن کی تنگ نظری کے خلاف ایسے مسلمان کے احتجاج کی صورت کیا ہوتی جس کی اپنی رگوں میں برہمن خون تھا اور جو ہندو کو مشرک نہیں سمجھتا تھا؟

اقبال نے رِگ وید کے گایتری منتر کا ترجمہ کیا جس کے لیے غالباً دی سسٹم آف انڈین فلاسفی میں میکس مولر کی شرح بھی اُن کے مطالعے سے گزری۔[۱]

طوفانِ نور کے سامنے بیخود ہو کر جل مرنے کے استعارے اپنی انتہا کو پہنچ گئے۔

آفتاب

ذیل کے اشعار رگ وید کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں جس کو گایتری کہتے ہیں۔ یہ دعا اعترافِ عبودیت کی صورت میں گویا اُن تاثرات کا اظہار ہے جنہوں نے نظامِ عالم کے حیرت ناک مظاہر کے مشاہدہ سے اوّل اوّل انسانِ ضعیف البنیان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا۔ اِس قسم کی قدیم تحریروں کا مطالعہ علمِ ملل و النحل کے عالموں کے لیے انتہا درجہ کا ضروری ہے کیونکہ ان سے انسان کے روحانی نمو کے ابتدائی مراحل کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وہ دعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک پائی جاتی ہے اور جس کو برہمن اِس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت اور کسی کے سامنے اس کو پڑھتا تک نہیں۔ جو لوگ محققین السنۂ شرقیہ کی تصانیف سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ سر ولیم جونس مرحوم کو اِس دعا کے معلوم کرنے میں کس قدر تکلیف اور محنت برداشت کرنی پڑی

تھی۔ مغربی زبانوں میں اِس کے بہت سے ترجمے کیے گئے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ زبانِ سنسکرت کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنۂ حال میں وضاحت کے ساتھ اِس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔ اِس مقام پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل سنسکرت میں لفظ "سوتر" استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے اُردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث ہم نے لفظ آفتاب رکھا ہے لیکن اصل میں اِس لفظ سے مراد اُس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب کسبِ ضیا کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نے اور نیز صوفیاء نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے "اللہ نور السمٰوات و الارض" اور شیخ محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں، "اللہ تعالیٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں لیکن وہ خود نظر نہیں آتا۔" علیٰ ہذا القیاس۔ افلاطونِ الٰہی کے مصری پیرووں اور ایران کے قدیم اہبیاً کا بھی یہی مذہب تھا۔

ترجمہ کی مشکلات سے ہر شخص واقف ہے لیکن اِس خاص صورت میں دِقت اور بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ اصل آواز کی موسیقیت اور وہ طمانیت آمیز اثر جو اِن کے پڑھنے سے دل پر ہوتا ہے اُردو زبان میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ گایتری کے مصنف نے ملک الشعرا ٹینی سن کی طرح اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن میں حروف علّت اور صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک ایسی لطیف موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا غیر زبان میں منتقل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ اِس مجبوری کی وجہ سے میں نے اپنے ترجمے کی بنیاد اس سوکت (گفتارِ زیبا) پر رکھی ہے جس کو سوریا نرائن اُپنشد میں گایتری مذکورہ کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ سنسکرت داں اصحاب اِس پر وہی رائے قائم کریں گے جو بیپ مَین نے پوپ کا ترجمۂ ہومر پڑھ کر قائم کی تھی یعنی شعر تو خاصے ہیں لیکن یہ گایتری نہیں ہے۔

محمد اقبال

اے آفتاب! روح و روانِ جہاں ہے تُو
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تُو
باعث ہے تُو وجود و عدم کی نمُود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بُود کا
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے
ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے
تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے، خرد ہے، روحِ رواں ہے، شعور ہے
اے آفتاب! ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تُو
یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تُو
تیرا کمال ہستیِ ہر جاندار میں
تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تُو
زائیدگانِ نور کا ہے تاج دار تُو
نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری
آزادِ قیدِ اوّل و آخر ضیا تری

مخزن، اگست ۱۹۰۲

حاشیے میں زائیدگانِ نور کی تشریح میں درج تھا، ”یعنی دیوتے۔ سنسکرت میں لفظ دیوتا

کے معنی زائیدۂ نور کے ہیں یعنی ایسی ہستی جس کی پیدائش نور سے ہوئی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو دیوتاؤں کو دیگر مخلوقات کی طرح مخلوق تصور کرتے تھے۔ ازلی نہیں سمجھتے تھے۔ غالباً ان کا مفہوم وہی ہوگا جس کو ہم لفظِ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ فرشتوں کا وجود بھی نوری تسلیم کیا گیا ہے اگرچہ ان کو مخلوق مانا گیا ہے۔ پس ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گردانا میرے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اقبال‘‘[۲]

۲

ستمبر کے مخزن میں وائٹ برجنٹ صاحب کے مضمون کا اقبال کا ترجمہ ’اُردو زبان‘ کے نام سے شائع ہوا۔[۳] ادارتی نوٹ میں لکھا تھا، ’’اِس مضمون کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اُردو زبان کے بانکپن نے مغربی فضا کو بھی اپنا گرویدہ کرلیا ہے۔‘‘

گرامی کی بیگم اقبال بیگم ترکؔ صاحبہ کا نعتیہ کلام بھی شائع ہوا جو گرامی کے ذریعے مخزن کو ارسال کیا گیا تھا:

سرخرو عرصہ محشر میں کیا ہے اے ترکؔ
امتی کہ کے رسولِ عربی نے مجھ کو

۳

کھولی ہیں ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہگذر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ

اِس غزل کے چار اشعار دستیاب ہیں۔[۴]

۴

خواجہ مسیح پال سیالکوٹ کے ایک مقامی عیسائی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ عمر ۱۸ برس تھی۔ امینؔ اور حزیںؔ کے تخلص کے ساتھ شاعری کرتے تھے۔ اُن کی ایک غزل ’پیامِ

یار' (لکھنؤ) میں چھپی۔ اصلاح لینے کا خیال آیا تو اقبال سے ملے اور اصلاح لینے کا خیال ظاہر کیا۔

''شاعری خداداد چیز ہے،'' اقبال نے جواب دیا۔ ''اگر شعر گوئی کا جذبہ سچا ہے تو مشقِ سخن کیے جایئے اور اساتذہ کا کلام ضرور پڑھیے تاکہ کان بحروں سے واقف ہو جائیں اور زبان میں کوئی سقم نہ رہ جائے۔''[5]

سچی بات یہ ہے کہ اقبال کو شاعری میں شاگرد پالنے کے تصور ہی سے وحشت ہوتی تھی۔

۵

میں مشتِ خاک، مجھ میں گوہر نہاں ہے کیا؟
حیرت ہے مجھ کو یارب! ظلمت میں نور کیوں ہے؟

اِس غزل نما حمد کے چھ شعر دستیاب ہیں۔[1]

۶

منشی سراج الدین نے کشمیر سے چار انگوٹھیاں بھیجیں۔ کشمیر ریذیڈنسی میں میر منشی تھے اور اقبال کے خاص دوست۔ اِنہوں نے ۲۳ اشعار کا دوغزلہ لکھا، 'شکریۂ انگشتری' جس میں غالب کی 'چکنی ڈلی' والے اشعار کی جھلک موجود تھی۔ درمیان میں قافیے بدل کر اُردو سے فارسی میں آ گئے: ہند سے جاتی ہے سُوئے اصفہاں انگشتری!

''ڈیر سراج،'' خط میں لکھا۔ ''دو تین روز سے طبیعت بسبب دورۂ درد کے علیل ہے۔ یہ چند اشعار قلم برداشتہ آپ کے شکریے میں ارسال کرتا ہوں۔ میرا ارمغاں یہی ہے۔ اسی کو قبول کر کے مشکور کیجیے۔ چاہیں تو پیشانی پر چند سطور اُردو میں لکھ کر مخزن میں بھیج دیجیے۔''

سراج نے اشعار مخزن کو نہیں بھجوائے بلکہ اُنہیں اقبال ہی کی تحریر میں خط سمیت

اپنی بیاض میں محفوظ کرلیا۔ [۶]

۷

اکتوبر میں اقبال کو دوبارہ گورنمنٹ کالج میں قائم مقام اسسٹنٹ پروفیسر ہونے کا موقع ملا۔ اِس دفعہ اُن کا تقرر شعبۂ فلسفہ کی بجائے انگریزی میں ہوا تھا۔

آرنلڈ اُن دنوں اورینٹل کالج کے قائم مقام پرنسپل تھے کیونکہ مسٹر اسٹراٹن کے بعد سے یہ آسامی خالی تھی۔

۸

کبھی شمع سے پوچھا تھا کہ پروانہ اُس سے پیار کیوں کرتا ہے۔ رُوح کے اپنے حقیقی وطن سے دُور ہو کر سوداگر کے طوطے کی طرح جسم کے پنجرے میں قید ہونے کے استعارے اکٹھے ہوئے تو شمع کو خبر دی کہ جواب مل گیا ہے اور یہ جواب وہی ہے جو منصور حلاج کی زبان سے بھی ادا ہُوا تھا۔ اُنہوں نے کہا تھا ''انا الحق'' جس کا مطلب خواہ کچھ بھی رہا ہو مگر بعض لوگ سمجھے کہ منصور کہتے ہیں، ''میں خدا ہوں!'' منصور کو سُولی پر چڑھا دیا گیا۔

اِس قصے سے عبرت حاصل کر کے اقبال نے اپنے دل کا مطلب استعاروں میں چھپایا جو نظم 'شمع' میں اکٹھے ہو گئے اور نظم مخزن کے حوالے کر دی گئی۔ [۸]

۹

سیموئیل روجرز نے سولہ سطروں کی مختصر سی انگریزی نظم 'اے وِش' میں پہاڑوں کے دامن میں جھونپڑا بنانا چاہا تھا۔ اقبال کا تخیل مہمیز ہُوا تو اُنہوں نے تیس اشعار کی نظم میں اِس خیال کو خاصی ترقی دی۔ نظم کا نام 'ایک آرزو' رکھا۔ یہ بھی مخزن کے حوالے ہوئی۔ [۹]

خدا جانے کیا ہو گیا ہندیوں کو
کہ اِس دیس میں راج ہے دشمنی کا[۹]

اقبال جس مبالغے سے حضرت علیؓ کی تعریف کرتے تھے ویسے ہی جوش کے ساتھ حضرت عمرؓ کی عظمت بیان کر سکتے تھے مگر سیالکوٹ کے مولوی عبدالکریم کی طرف سے ایک نئی تکرار کا آغاز ہوا تو عشق رسولؐ میں ڈوبی ہوئی غزل وجود میں آ گئی۔[۱۰]

باطن کی آنکھ کھلنے کے لیے ظاہر کی آنکھ بند ہونا لازمی ہے۔موت رُوح کو اگلی دنیا دیکھنے کے قابل بناتی ہے مگر کیا یہ بھی ممکن ہے کہ جیتے جی وہ جلوہ دکھائی دے جائے جس کے لیے قیامت کا انتظار کیا جاتا ہے؟ سوال معنی خیز تھا۔

غزل

عاشقِ دیدارِ محشر کا تمنّائی ہُوا
وہ سمجھتے ہیں کہ جرمِ ناشکیبائی ہُوا

میری بینائی ہی شائد مانعِ دیدار تھی
بند جب آنکھیں ہوئیں تیرا تماشائی ہوا

تجھ میں کیا اے عشق! وہ اندازِ معشوقانہ تھا
حسن خود 'لولاک' کہہ کر تیرا شیدائی ہُوا

دیکھ ناداں! امتیازِ شمع و پروانہ نہ کر
حسن بن کر عشق اپنا آپ سودائی ہوا

بُغضِ اصحابِ ثلاثہ سے نہیں اقبالؔ کو
دِق مگر اِک خارجی سے آ کے مَولائی ہُوا

یہ غزل بھی مخزن کے حوالے ہوئی۔اس کے ۹ شعر دستیاب ہیں۔[۱۱]

دسمبر کا مخزن دربار نمبر تھا۔ ''آج جب سب رعایائے ہندوستان ایک عظیم الشان شاہنشاہ کی تاج پوشی کی مبارک رسم منا رہے ہیں،'' شیخ عبدالقادر نے مرزا محمد سعید دہلوی کے مضمون 'ابوظفر بہادر شاہ' کے تعارفی نوٹ میں لکھا۔ ''ایشیائی خیالات کے موافق معلوم ہوتا ہے کہ 'دی گریٹ مغل' کے آخری یادگار کی بےنشان اور دُور از وطن قبر پر بھی اُس کو بھلائی کے ساتھ یاد کرنے سے دو پھول چڑھا دیے جائیں۔''

ص ۷۹–۷۸ پر 'شمع' اور 'ایک آرزو' اکٹھی شائع ہوئیں۔ پہلی نظم کے شروع میں شیخ عبدالقادر کا نوٹ تھا، ''کلامِ اقبالؔ اوراقِ مخزن میں ویسے تو مقبول ثابت ہو چکا ہے۔ اور لوگ اُس سے ایسے آشنا ہو گئے ہیں۔ کہ تمہید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ مگر اس دفعہ حسنِ اتفاق سے ہمیں اُن کی دو ایسی نظمیں دستیاب ہوئی ہیں۔ جو الفاظ طرزِ ادا اور بندش میں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ایک تو فارسی الفاظ سے لدی ہوئی۔ نوائے اضافات کا بوجھ سر پر اٹھائے ہوئے غالبؔ مرحوم کے انداز کا نمونہ۔ آہستگی اور وقار سے چلتی نظر آتی ہے۔ اور دوسری سبکروی میں برق۔ سادہ الفاظ کا جامہ پہنے۔ اضافتوں کے زیور سے خالی۔ اپنی سادگی پر ناز کرتی ہوئی دل میں بیٹھتی جاتی ہے۔ ایک کے خیالات پیچیدہ اور دقیق کے اخذ کرنے کے لیے ذہن کو فکر سے دست و گریبان ہونا پڑتا ہے اور معانی ذہن میں آ آ کر دامن چھڑائے لئے جاتے ہیں۔ اور پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ہیا درید گرایں جا بود زباندانے۔ غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد۔ اور دوسری کی سیدھی سادی آرزوؤں کی تصویریں ہیں کہ دل پر نقش ہوئی جاتی ہیں۔ ایک فلسفیت اور تصوف کے سمندر میں غوطہ زن ہے تو دوسری تصور کے پر لگائے کوہ و بیابان۔ باغ و راغ کی سیر میں مصروف ہے۔ اور جو کچھ دیکھتی ہے۔ اس پر مصوری کا افسوں پڑھ رہی ہے۔ ہم ان دونوں کو اس لیے یکجا چھاپتے ہیں۔ کہ مصنف کے دونو رنگوں کا اندازہ ہو جائے۔ جب کئی لوگوں نے اقبالؔ کی مشکل پسندی کی شکایت کی۔ تو ہم نے اس اظہارِ

رائے کو اُن تک پہنچا دیا۔ جو جواب انہوں نے دیا وہ یہی تھا کہ جہاں خیالات دقیق اور مشکل ہوں گے وہاں زبان کا آسان ہونا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ اِسی بنا پر وہ مرزا کی دشوار پسندی کو نہ صرف معذوری بلکہ ضرورت قرار دیتے ہیں اور یہی برہان اپنے مرغوب انداز کے حق میں رکھتے ہیں۔ انہوں نے دوسری نظم میں یہ دکھا دیا ہے۔ کہ آسان نویسی میں بھی بند نہیں۔ گو جن مسائل کا ہجوم اُن کے دل کے گرد رہتا ہے وہ ہمیشہ آسان الفاظ کے لباس میں جلوہ گر نہیں ہو سکتے:۔''

۱۲

سر سید کی دُور اندیش نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ آزادی کی آخری جنگ کا فیصلہ صرف ہتھیاروں سے نہیں ہوگا۔ آج بھی کوئی اُن کے مزار کی تختی کو دل کی آنکھوں سے پڑھتا تو قوم کے مستقبل کے اشارے وہاں نظر آجاتے۔

سیّد کی لوحِ تُربت

اے کہ زائر بن کے میری قبر پر آیا ہے تُو
اے کہ مستانہ مئے حسنِ عقیدت کا ہے تُو
اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر
اے کہ تیری رُوح کا طائر قفس میں ہے اسیر
اِس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ
شہر جو اُجڑا ہوا تھا اُس کی آبادی تو دیکھ
بسکہ ہے بادِ صبا یاں کی اخوت آفریں
یہ وہ گلشن ہے جہاں سبزہ بھی بیگانہ نہیں
فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی
صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی

یہ وہ نظارہ ہے یاں ہر گل سراپا دیدہ ہے
اپنے گلشن کی زمیں میں باغباں خوابیدہ ہے

سنگِ تُربت ہے مرا گرویدۂ تقریر دیکھ
چشمِ باطن سے ذرا اِس لوح کی تحریر دیکھ

مدّعا تیرا اگر دُنیا میں ہے تعلیمِ دیں
ترکِ دُنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دُکھ جائے تری تقریر سے

دیکھ اپنوں میں نہ پیدا ہو کہیں بیگانگی
چل نہ جائے تیرے گلشن میں ہوا پیکار کی

دِین کے پردے میں تُو دُنیا کا سودائی نہ ہو
آڑ میں مذہب کی شوقِ عزّت افزائی نہ ہو

گالیاں دینا کسی کو دِین کی خدمت نہیں
یہ تعصّب کوئی مفتاحِ درِ جنّت نہیں

راہ بر کو قافلے کے ساتھ چلنا چاہیے
کیا چلے گا کارواں جب رہ نما پیچھے رہے

ہو شرابِ حبِّ قومی میں اگر سرشار تُو
ہو نہ اپنی عزّت افزائی کی تجھ کو آرزو

قافلہ جب تک پہنچ جائے نہ منزل کے قریں
رہ نما ہوتے ہیں جو رستے میں دم لیتے نہیں

کیا مزا رکھتی ہے ابنائے وطن کی فکر بھی
اِس میں کچھ ہوتی نہیں اپنے کفن کی فکر بھی
دیکھ آوازِ ملامت سے نہ گھبرانا ذرا
عشق کے شعلے کو بھڑکاتی ہے یہ بن کر ہوا
وہ شجر ہے عشقِ اخواں زندگی ہے جس کا پھل
قوم کے عاشق کو چھو سکتا نہیں دستِ اجل
عالمِ عقبیٰ میں ہے سب سے بڑی عزت یہی
عشقِ اخواں میں اگر مطعون ہو جائے کہیں
عشق ہر صورت میں تسکینِ دلِ ناشاد ہے
پر کہیں نالہ، کہیں شیون، کہیں فریاد ہے
خودبخود منہ سے نکل جاتی ہے ایسی نَے ہے یہ
شیشۂ دل سے اُچھل جاتی ہے ایسی مَے ہے یہ
چُوں زینائے محبت خوردہ بودم بادۂ
تا ثریا رفت ایں قومِ بخاک اُفتادۂ
تُو اگر کوئی مدبّر ہے تو سُن میری صدا
ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا
عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے
اپنے حق کے مانگنے میں رکھ ادب مدِّ نظر
چاہیے سائل کو آدابِ طلب مدِّ نظر
معنیِ رمزِ اطاعت کی نہ ہو جس کو خبر
چاہیے دُنیا کو اُس ناداں کی صحبت سے حذر

آب چوں در روغن افتد نالہ خیزد از چراغ
صحبتِ ناجنس باشد باعثِ آزارہا

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم
شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم
پاک رکھ اپنی زباں تلمیذِ رحمانی ہے تُو
ہو نہ جائے، دیکھنا! تیری صدا بے آبرو
چاہیے ہو باعثِ آرامِ جاں شاعر کی لے
لاج اِس جزوِ نبوت کی ترے ہاتھوں میں ہے
دیکھ اے جادوبیاں! تُو نے اگر پروا نہ کی
آبرو گِر جائے گی اِس گوہرِ یک دانہ کی

از شرابِ حبِّ ہم جنسانِ خود مستانہ باش
شعلۂ شمعِ وطن را صورتِ پروانہ باش[۱۴]

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

باب ۹

امیر کا صنم خانہ

۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۴ء

پہلا حصہ

۱

لاہور کے بالا خانوں میں کہیں ایک مغنیہ رہتی تھیں جن کا نام امیر تھا۔ عمر اکیس برس اور طوائفوں کے ایک نامور خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ بے حد ذہین اور حاضر جواب تھیں۔ اُس زمانے کے رواج کے مطابق اچھی تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ حافظ کی غزلیں خوب گاتی تھیں اور خود بھی شاعرہ تھیں۔

اقبال نے محسوس کیا کہ وہ امیر بیگم کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔

دل می رود ز دستم صاحبدلاں خدارا
دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

حافظ

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں کوئی ایسی دشواری ضرور آن پڑی کہ انہیں حوصلہ افزا جواب نہ ملا۔ اگر یہ ۱۹۰۳ء کے شروع کی بات ہے تو اُن دنوں وہ مڈل کے پرچوں کے ممتحن تھے اور ذہن اس طرح اُلجھا ہُوا تھا کہ شعر کہنے کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی تھی۔

۲

فوق کو پیغام ملا کہ انہیں اقبال نے بلایا ہے۔ ''میں دوڑا دوڑا اُن کے پاس گیا تو اقبال کو کسی قدر فکر مند پایا،''فوق بیان کرتے ہیں۔[۲] ''میں نے فکر مندی کی وجہ پوچھی تو بولے کہ ہیرا منڈی کی مغنیہ جس کے پر سوز گانے سن کر میں بے حد لطف اندوز ہوا آج کل التفات نہیں کر رہی ہے۔ اب اس کا دماغ ٹھیک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم اُس کی ہجو لکھو جو اُس کو کسی طرح سے بھیج دی جائے گی۔ میں تم کو یہ زحمت اس لیے دے رہا ہوں کہ خود ہجو نہیں لکھتا۔''

فوق مان گئے۔

۳

معلوم ہوتا ہے کہ امیر بیگم نے اقبال کو بتا دیا کہ وہ خود بھی اُن سے متاثر ہیں۔ صرف امیر بیگم کی والدہ اقبال کو پسند نہیں کرتیں جس کی وجہ یہ ہو سکتی تھی اقبال دُوسرے تماش بینوں کی طرح ڈھیروں روپے نہیں لٹا سکتے تھے۔

غزل

چاہیں اگر تو اپنا کرشمہ دکھائیں ہم
بن کر خیالِ غیر ترے دل میں آئیں ہم

اچھی کہی شکایتِ جور و جفا کی بھی
اِتنی سی بات کے لیے محشر میں جائیں ہم

اے صدمۂ فراق نہ کر ہم سے چھیڑ چھاڑ
تُو کس کا ناز ہے کہ تُجھے بھی اُٹھائیں ہم؟

پوچھیں گے آج سرمۂ دنبالہ دار سے
کس طرح سے کسی کی نظر میں سمائیں ہم

ہر چیز منع تو ہے ہمیں اے طبیبِ عشق!

لیکن بڑھے جو ضعف تو غش بھی نہ کھائیں ہم؟

غزل کے کم سے کم آٹھ شعر ہوئے جن کی ترتیب معلوم نہیں مگر یہ پانچ شعر مخزن میں دینے کے لیے منتخب کیے۔ جو رہ گئے وہ یہ تھے:

دشمن شبِ فراق میں ہے اپنا آپ ہی
آ جائے موت اپنی تو گنگا نہائیں ہم
ڈرتے تھے جس کے واسطے وہ بات اب کہاں؟
تُو ایک اب کہے تو تُجھے سو سُنائیں ہم
اقبالؔ شعر کے لیے فرصت ضرور ہے
اِس فکرِ امتحاں میں غزل کیا سُنائیں ہم[۳]

۴

''اچھی ہجو لکھنے میں دو تین دن صرف ہو گئے لیکن ہجو مکمل ہو گئی،'' فوق بیان کرتے ہیں۔ ''میں اقبال کے پاس گیا تو وہاں یہ دیکھ کر کچھ مایوس سا ہو گیا کہ اُنہوں نے اس بات کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ آخر میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور میں نے عرض کی کہ میں ہجو لکھ کر لایا ہُوں۔ اقبال نے ایک پُر لطف تبسّم کر کے فرمایا، 'اب اس کی ضرورت نہیں۔ اُس کا دماغ ٹھیک ہو گیا ہے!'''[۴]

۵

جنوری کے مخزن میں 'سید کی لوحِ تربت' شائع ہوئی۔ ''چاہیں اگر تو اپنا کرشمہ دکھائیں ہم'' والی غزل بھی شامل تھی۔ نظم کی تمہید میں درج تھا، ''تخیل کے کانوں نے سرسید مرحوم کی قبر سے وہ صدائے پر درد سنی ہے۔ جسکی ایسے دل سے جو مرحوم کے پہلو میں تھا توقع ہو سکتی تھی۔ خوبی یہ ہے کہ سرسید زندگی میں کئی حیثیتوں کا جامع تھا۔ اسی طرح اُس کی لوحِ تربت سے وہ کلماتِ نصیحت شیخ محمد اقبال کی طبعِ رسا نے اخذ کئے ہیں

جو زندگی کے مختلف مشاغل کے جامع ہیں۔اور جن سے ہر طبقہ کے لوگ مستفید ہو سکتے ہیں۔اس زمانہ میں جب دہلی میں محمڈن کانفرنس کے جلسے زور شور سے ہوئے ہیں، ان کا شائع ہونا ایک لطفِ مزید رکھتا ہے:-''

اُسی ماہ شبلی نعمانی انجمن حمایت اسلام کے کسی جلسے میں لیکچر دینے لاہور آئے۔ موضوع 'اسلام' تھا۔ اُنہوں نے مذہب اور انسانی فطرت کے ربط کے علاوہ دِین اور دُنیا کے باہمی تعلق پر زور دیا۔

خیال ہے کہ اس موقعے پر اقبال نے علم الاقتصاد کا مسودہ زبان کی اصلاح کے لیے انہیں پیش کیا ہوگا۔

۶

انجمن کا اٹھارہواں سالانہ اجلاس چند ہفتوں میں ہونے والا تھا۔ اقبال محسوس کر رہے تھے کہ نظم پیش نہیں کر سکتے۔امتحانات کا عذر کیا۔'نالہ یتیم' کے بعد پہلی بار انجمن کا سالانہ اجلاس اُن کی نظم کے بغیر ہونے والا تھا۔

۷

مخزن اور پنجۂ فولاد کے بعد 'خطِ منظوم' ہفتہ وار الحکم (قادیان) کے ۱۰-۱۷-۲۴ فروری کے نمبر میں شائع ہوگئی (۳) جس کے بعد میر حامد شاہ نے دھواں دھار جوابی نظم بھی الحکم میں چھپوائی جس میں بات یہاں تک پہنچی کہ:

میرا پابوس کیوں نہ ہو اقبال
حامدِ نائبِ خدا ہوں میں

۸

سوداگر کا قیدی پرندہ جب آزاد ہو کر وطن روانہ ہونے لگا تو مولانا روم نے اُس کی زبانی سوداگر کو کچھ نصیحتیں کروائیں جنہوں نے سوداگر کے دل پر بڑا اثر کیا لیکن اگر وہ

پرندہ اقبال ہوتے تو اس موقع پر پرواز کرنے سے پہلے کون سا گیت الاپتے؟ ایک غزل اس مضمون کی ہوگئی:

کیا کہوں، اپنے چمن سے مَیں جُدا کیونکر ہوا؟
اور اسیرِ حلقۂ دامِ ہوا کیونکر ہوا؟

اس غزل کے بارہ اشعار دستیاب ہیں۔ فروری میں خدنگِ نظر اور مخزن میں ایک ساتھ شائع ہوئی۔°

۹

بلخ کے مولوی جلال الدین کو مولانا روم بننے کے لیے شمس تبریزی سے اپنی کتابیں جلوانا پڑی تھیں۔ یہ تجربہ عشق کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ اقبال کی زندگی میں اس متصوفانہ عشق کا سانحہ امیر بیگم کی صورت میں رونما ہُوا۔

جنوری میں جو غزل مخزن میں شائع ہوئی تھی اُس میں وصل کی خواہش کا یہ عالم تھا کہ صدمۂ فراق ناگوار معلوم ہو رہا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ بہانہ عقل نے بنایا تھا۔ جس نے رُوح بنائی ہے اُسی نے رُوح کو تڑپنا سکھایا ہے لہٰذا ہجر بھی اُسی کی ادا ہے۔ یہ مجاز سے حقیقت کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔

۱۰

شیریں فرہاد کا قصہ پڑھ کر کسی کو تعجب ہوا کہ ایک انسان کیسے پہاڑ کاٹ کر نہر نکال سکتا ہے۔ اُس نے ایک دانا سے پوچھا تو جواب ملا، ''انسانی شخصیت میں بے پناہ قوتیں موجود ہیں جو عام طور پر زندگی کی مختلف خواہشات میں بکھر جاتی ہیں۔ جب کوئی ایک خواہش باقی آرزوؤں کو ختم کردے تو قوت اکٹھی ہوجاتی ہے۔ پہاڑ اُس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے مگر قوت کا اصل مصرف یہ ہے کہ عشق خود حسن بن جائے۔ فرہاد گنوار سنگتراش تھا اُس نے توانائی پتھر کوٹنے میں صرف کردی۔ اپنے دل کو تراشنے پر توجہ دیتا

تو وہاں محبوب کا جلوہ مل جاتا۔ شیریں کو پرویز کے محل کی بجائے اپنے دل میں تلاش کرو۔''

قریب کے شاعروں میں سے غالبؔ نے بھی یہی خیال ظاہر کیا تھا:

جگر کیا ہم نہیں رکھتے جو کھودیں جا کے معدن کو

اقبال گنوار سنگتراش نہ تھے۔

۱۱

۲۶ فروری کی شام امیر بیگم نے شعر کہنے کی فرمائش کی یا خود اقبال نے اُنہیں سنانے کی خواہش محسوس کی۔

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
غالبؔ

خیالات کا ہجوم ہوگیا۔ ایک نظم ذہن پر اُترنے لگی مگر عورت سے محبت کرنے کی نسبت خدا سے محبت کرنا زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیونکہ قیس کو لوگوں نے مجنوں کہہ کر چھوڑ دیا تھا مگر منصور سولی پر چڑھائے گئے تھے۔ اقبال کو بھی ہونے والی نظم سے خوف محسوس ہوا، ''کوئی وہابی اِس کے بعض اشعار پر کوئی فتویٰ نہ دے دے۔'' چنانچہ تمہید میں پندرہ سولہ اشعار کی غزل کہی جو ممکن ہے ستار کی دُھن پر موزوں کی گئی ہو۔

غزل

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دِل وا کرے کوئی
منصُور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت
اب کیا کسی سے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

ہو دِید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

میں اِنتہائے عشق ہوں تُو انتہائے حسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

اَڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طُور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

ہم جانتے ہیں مُیم کے پردے میں کون ہے
ہاں بھیدیوں سے مُنہ نہ چھپایا کرے کوئی

سو سو اُمید بندھتی ہے اِک اِک نگاہ پر
مُجھ کو نہ ایسے پیار سے دیکھا کرے کوئی

محفل ہو، شُغلِ مے ہو، شبِ ماہتاب ہو
اور مَیں گِروں تو مجھ کو سنبھالا کرے کوئی

اقبالؔ! عشق نے مِرے سب بل دیے نکال
مدّت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

نظم کا آغاز ہوا۔ اشعار اِس رفتار سے نازل ہو رہے تھے کہ خود قلم پکڑنا دُشوار تھا۔''

یہ سمجھ لو کہ ایک ماہی گیر نے مچھلیاں پکڑنے کے لیے جال ڈالا ہے،'' بعد میں اُنہوں نے اپنی اس قسم کی کیفیت کے بارے میں کہا۔ ''مچھلیاں اس کثرت سے جال کی طرف کھنچی آ رہی ہیں کہ ماہی گیر پریشان ہو گیا ہے۔ سوچتا ہے کہ اتنی مچھلیوں میں سے کِسے پکڑوں اور کِسے چھوڑ دوں!..''

امیر بیگم یا کسی اور ہمدرد نے کاغذ قلم سنبھال لیا۔ آمد ہوتی رہی۔

ابرِ گہر بار

یا

فریادِ امت

دِل میں جو کچھ ہے نہ لب پر اُسے لاؤں کیونکر؟
ہو چھپانے کی نہ جو بات، چھپاؤں کیونکر؟
شوقِ نظارہ یہ کہتا ہے قیامت آئے
پھر میں نالوں سے قیامت نہ اُٹھاؤں کیونکر؟
میری ہستی نے رکھا مجھ سے تجھے پوشیدہ
پھر تری راہ میں اُس کو نہ مٹاؤں کیونکر؟
صدمۂ ہجر میں کیا لطف ہے اللہ اللہ!
یہ بھی اِک ناز ہے تیرا نہ اُٹھاؤں کیونکر؟
زندگی تجھ سے ہے اے نارِ محبت میری
اشکِ غم سے ترے شعلوں کو بجھاؤں کیونکر؟
تجھ میں سو نغمے ہیں اے تارِ ربابِ ہستی
زخمۂ عشق سے تجھ کو نہ بجاؤں کیونکر؟
ضبط کی تاب نہ یارائے خموشی مجھ کو
ہائے اس دردِ محبت کو چھپاؤں کیونکر؟

بات ہے راز کی پر منہ سے نکل جائے گی
یہ مئے کہنہ خُمِ دل سے اُچھل جائے گی

آسماں مجھ کو مٹا دے جو فروزاں ہوں میں
صورتِ شمعِ سرِ گورِ غریباں ہوں میں

ہوں وہ بیمار جو ہو فکرِ مداوا مجھ کو
درد چپکے سے یہ کہتا ہے کہ درماں ہوں میں

دیکھنا تُو مری صورت پہ نہ جانا، گُل چیں!
دیکھنے کو صفتِ نو گلِ خنداں ہوں میں

موت سمجھا ہوں مگر زندگیِ فانی کو
نام آ جائے جو اُس کا تو گریزاں ہوں میں

دُور رہتا ہوں کسی بزم سے اور جیتا ہوں
یہ بھی جینا ہے کوئی جس سے پشیماں ہوں میں

کُنجِ عُزلت سے مجھے عشق نے کھینچا آخر
یہ وہی چیز ہے جس چیز پہ نازاں ہوں میں

داغِ دل مہر کی صورت ہے نمایاں لیکن
ہے اُسے شوق ابھی اور نمایاں ہوں میں

ضبط کی جا کے سنا اور کسی کو ناصح!
اشک بڑھ چڑھ کے یہ کہتا ہے کہ طوفاں ہوں میں

ہوں وہ مضمون کہ مشکل ہے سمجھنا میرا
کوئی مائل ہو سمجھنے پہ تو آساں ہوں میں

رِند کہتا ہے ولی مجھ کو، ولی رِند مجھے
سُن کے اِن دونوں کی تقریر کو حیراں ہوں میں

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

کوئی کہتا ہے کہ اقبال ہے صوفی مشرب
کوئی سمجھا ہے کہ شیدائے حسیناں ہوں میں

ہوں عیاں سب پہ مگر پھر بھی ہیں اتنی باتیں
کیا غضب آئے نگاہوں سے جو پنہاں ہوں میں
دیکھ اے چشمِ عدو! مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں میں

مزرعِ سوختۂ عشق ہے حاصل میرا
درد قربان ہوں جس دل پہ ہے وہ دل میرا

قصۂ دار و رسن بازیِ طفلانۂ دل
التجائے ارنی سرخیِ افسانۂ دل
یارب اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہو گی
جادۂ ملکِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل
ابرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب
جل گئی مزرعِ ہستی تو اگا دانۂ دل
حسن کا گنجِ گراں مایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل
عرش کا ہے کبھی کعبے کا ہے دھوکہ اس پر
کس کی منزل ہے الٰہی! مرا کاشانۂ دل
کچھ اسی کو ہے مزہ دہر میں آزادی کا
جو ہوا قیدیِ زنجیرِ پری خانۂ دل
اس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا
دل کسی اور کا دیوانہ، میں دیوانۂ دل
تو سمجھتا نہیں اے زاہدِ ناداں! اس کو
رشکِ صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانۂ دل

ہائے کیا جانیے اس گھر کا مکیں کیسا ہو؟
ہوں جو منصور سے دربانِ درِ خانۂ دل

خاک کے ڈھیر کو اِکسیر بنا دیتی ہے
وہ اثر رکھتی ہے خاکسترِ پروانۂ دل

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

آتی ہے اپنی سمجھ اور پہ مائل ہو کر
آنکھ کھل جاتی ہے انسان کی بے دل ہو کر

لوگ سودا کو یہ کہتے ہیں، برا ہوتا ہے
عقل آئی مجھے پابندِ سلاسل ہو کر

آرزو کا کبھی رونا کبھی اپنا ماتم
اُس سے پوچھے کوئی کیا دل نے لیا دل ہو کر

میری ہستی ہی تو تھی میری نظر کا پردہ
اُٹھ گیا بزم سے میں پردۂ محفل ہو کر

عینِ ہستی ہوا ہستی کا فنا ہو جانا
حق دکھایا مجھے اِس نقطے نے باطل ہو کر

خلق معقول ہے، محسوس ہے خالق اے دل
دیکھ نادان! ذرا آپ سے غافل ہو کر

طور پر تُو نے جو اے دیدۂ موسیٰ! دیکھا
وہی کچھ قیس نے دیکھا پسِ محمل ہو کر

کیا کہوں بیخودیِ شوق میں لذت کیا ہے
تُو نے دیکھا نہیں زاہد! کبھی غافل ہو کر

راہِ الفت میں رواں ہوں کبھی اُفتادہ ہوں
موج ہو کر کبھی خاکِ لبِ ساحل ہو کر

دمِ خنجر میں دمِ ذبح سما جاتا ہوں
جوہرِ آئینۂ خنجرِ قاتل ہو کر

وہ مسافر ہوں چلے جب نہ پتا منزل کا
خود بھی مٹ جاؤں نشانِ رہِ منزل ہو کر

ہے فروغِ دو جہاں داغِ محبت کی ضیا
چاند یہ وہ ہے کہ گھٹتا نہیں کامل ہو کر

دیدۂ شوق کو دیدار نہ ہو، کیا معنی
آئے محفل میں جو دیدار کے قابل ہو کر

عشق کا تیر قیامت تھا الہٰی! توبہ
دل تڑپتا ہے مرا طائرِ بسمل ہو کر

مئے عرفاں سے مرا کاسۂ دل بھر جائے
میں بھی نکلا ہوں تری راہ میں سائل ہو کر

المدد! سیّدِ مکّی مدنی العربی!
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

لاکھ سامان ہے اِک بے سر و ساماں ہونا
مجھ کو جمعیتِ خاطر ہے پریشاں ہونا

تیری اُلفت کی اگر ہو نہ حرارت دل میں
"آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا"

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

دل جو بربادِ محبت ہوا آباد ہوا
سازِ تعمیر تھا اس قصر کو ویراں ہونا
علم و حکمت کے مدینے کی کشش ہے مجھ کو
لطف دے جاتا ہے کیا کیا مجھے ناداں ہونا
کبھی یثرب میں اویسِ قرنی سے چھپنا
کبھی برقِ نگہِ موسیِ عمراں ہونا
قابِ قوسین بھی، دعوئ بھی عبودیت کا
کبھی چلمن کو اٹھانا کبھی پنہاں ہونا
لطف دیتا ہے مجھے مٹ کے تری اُلفت میں
ہمہ تن شوقِ ہوائے عربستاں ہونا
یہی اسلام ہے میرا یہی ایماں میرا
تیرے نظارۂ رُخسار سے حیراں ہونا
خندۂ صبح تمنائے براہیم اتنی
چہرہ پرداز بہ حیرت کدۂ میم اتنی
حشر میں ابر شفاعت کا گہربار آیا
دیکھ اے جنسِ عمل! تیرا خریدار آیا
پیرہن عشق کا جب حسنِ ازل نے پہنا
بن کے یثرب میں وہ آپ اپنا خریدار آیا
میں گیا حشر میں جس دم تو صدا یوں آئی
دیکھنا، دیکھنا، وہ کافرِ دیں دار آیا
لطف آنے کا تو جب ہے کہ کسی پر آئے
ورنہ دل اپنا بھی آنے کو تو سو بار آیا

عشق کی راہ میں اک سیر تھی ہر منزل پہ
نجد کا دشت کہیں مصر کا بازار آیا

میں نے سو گلشنِ جنت کو کیا اُس پہ نثار
دشتِ یثرب میں اگر زیرِ قدم خار آیا

لیں شفاعت نے قیامت میں بلائیں کیا کیا
عرقِ شرم میں ڈوبا جو گنہ گار آیا

وہ مری شرمِ گنہ اور وہ سفارش تیری
ہائے اس پیار پہ کیا کیا نہ مجھے پیار آیا

ہے ترے عشق کا مے خانہ عجب مے خانہ
یعنی ہشیار گیا اور میں سرشار آیا

ما عرفنا نے چھپا رکھی ہے عظمت تیری
قابِ قوسین سے کھلتی ہے حقیقت تیری

لے چلا بحرِ محبت کا تلاطم مجھ کو
کشتیِ نوح ہے ہر موجۂ قلزم مجھ کو

حسن تیرا مری آنکھوں میں سمایا جب سے
تیر لگتی ہے شعاعِ مہ و انجم مجھ کو

تیرے قرباں میں اے ساقیِ مے خانۂ عشق
میں نے اک جام لیا تُو نے دیے خُم مجھ کو

خاک ہو کر یہ ملا اوج تری اُلفت میں
"کہ فرشتوں نے لیا بہرِ تیمم مجھ کو"

گردِ آسا سرِ دامن سے لگا پھرتا ہوں
حشر کے روز بھلا دو نہ کہیں تم مجھ کو

کوئی دیکھے تو ترے عاشقِ شیدا کا مزاج
دُور سے کہتا ہے، چھیڑا نہ کرو تم مجھ کو!
موت آ جائے جو یثرب کے کسی کوچے میں
میں نہ اُٹھوں جو مسیحا بھی کہے قُم مجھ کو
صفتِ نوکِ سرِ خار شبِ فرقت میں
چبھ رہی ہے نگہِ دیدۂ انجم مجھ کو
خوف رہتا ہے یہ ہردم کہ رہِ یثرب سے
طُور کی سمت نہ لے جائے توہّم مجھ کو
تُو نے آنکھوں کے اشارے سے جو تسکیں کر دی
شورِ محشر ہوا گلبانگِ ترنّم مجھ کو
اپنا مطلب مجھے کہنا ہے مگر تیرے حضور
چھوڑ جائے نہ کہیں تابِ تکلّم مجھ کو
ہے ابھی اُمّتِ مرحوم کا رونا باقی
دیکھ اے بیخودیِ شوق! نہ کرگُم مجھ کو

ہمہ حسرت ہوں، سراپا غمِ بربادی ہوں
ستمِ دہر کا مارا ہوا فریادی ہوں

اے کہ تھا نُوح کو طوفاں میں سہارا تیرا
اور براہیم کو آتش میں بھروسا تیرا
اے کہ مشعل تھا ترا ظلمتِ عالم میں وجود
اور نورِ نگہِ عرش تھا سایا تیرا
اے کہ پَرتَو ہے ترے ہاتھ کا، مہتاب کا نور
چاند بھی چاند بنا پا کے اشارہ تیرا

گرچہ پوشیدہ حسن ترا پردوں میں
ہے عیاں معنیِ لولاک سے پایا تیرا
ناز تھا حضرتِ موسیٰ کو یدِ بیضا پر
سو تجلّی کا محل نقشِ کفِ پا تیرا
چشمِ ہستی صفتِ دیدۂ اعمیٰ ہوتی
دیدۂ کُن میں اگر نور نہ ہوتا تیرا
مجھ کو انکار نہیں آمدِ مہدی سے مگر
غیر ممکن ہے کوئی مثل ہو پیدا تیرا

کیا کہوں اُمّتِ مرحوم کی حالت کیا ہے
جس سے برباد ہوئے ہم وہ مصیبت کیا ہے

حال اُمّت کا بُرا ہو کہ بھلا کہتے ہیں
صفتِ آئینہ جو کچھ ہے صفا کہتے ہیں
واعظوں میں یہ تکبّر کہ الٰہی توبہ
اپنی ہر بات کو آوازِ خدا کہتے ہیں
اُن کے ہر کام میں دُنیا طلبی کا سودا
ہاں مگر وعظ میں دُنیا کو برا کہتے ہیں
غیر بھی ہو تو اُسے چاہیے اچھا کہنا
پر غضب ہے کہ یہ اپنوں کو برا کہتے ہیں
فرقہ بندی کی ہوا تیرے گلستاں میں چلی
یہ وہ ناداں ہیں اُسے بادِ صبا کہتے ہیں
شاہدِ قوم ہوا خنجرِ پیکار سے خوں
ہائے غفلت یہ اُسے رنگِ حنا کہتے ہیں

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

آہ جس بات سے ہو فتنۂ محشر پیدا
یہ وہ بندے ہیں اُسے فتنہ رُبا کہتے ہیں

ہو نہ اے قافلہ سالار! یہ اُمت تیری
کارواں ہند میں ہے کوئی لٹا کہتے ہیں

جن کی دیں داری میں ہو آرزوئے زرِ پنہاں
آ کے دھوکے میں اُنھیں راہ نما کہتے ہیں

لاکھ اقوام کو دُنیا میں اُجاڑا اِس نے
یہ تعصب کو مگر گھر کا دِیا کہتے ہیں

خانہ جنگی کو سمجھتے ہیں بنائے ایماں
مرض الموت ہے جو اُس کو دوا کہتے ہیں

یہ نصاریٰ کا خدا اور وہ علی شیعوں کا
ہائے کس ڈھنگ سے اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

مقصدِ لِحمُکَ لِحمی پہ کھلی اِن کی زباں
یہ تو اِک راہ سے تجھ کو بھی بُرا کہتے ہیں

تیرے پیاروں کا جو یہ حال ہو اے شافعِ حشر!
میرے جیسوں کو تو کیا جانیے کیا کہتے ہیں

بغضِ للّٰہ کے پردے میں عداوت ذاتی
دین کی آڑ میں کیا کرتے ہیں کیا کہتے ہیں

جن کا یہ دیں ہو کہ اپنوں سے کریں ترکِ سلام
ایسے بندوں کو یہ بندے "صُلحا" کہتے ہیں

قوم کے عشق میں ہو فکرِ کفن بھی نہ جسے
یہ اُسے بندۂ بے دامِ ہوا کہتے ہیں

IqbalCyberLibrary.net All rights reserved. ©2002-2006

یہ دوا صفحۂ ہستی سے نہ مٹ جانا ہو
درد کے حد سے گزرنے کو دوا کہتے ہیں

وصل ہو لیلیِ مقصود سے کیونکر اپنا
اخترِ سوختۂ قیس ہے اختر اپنا

اُمرا جو ہیں وہ سنتے نہیں اپنا کہنا
سامنے تیرے پڑا ہے مجھے کیا کیا کہنا

ہم جو خاموش تھے اب تک تو ادب مانع تھا
ورنہ آتا تھا ہمیں حرفِ تمنا کہنا

دردمندوں کا کہیں حال چھپا رہتا ہے
اپنی خاموشی بھی تھی ایک طرح کا کہنا

شِکوہ منّت کشِ لب ہے کبھی منّت کشِ چشم
میرا ''کہنا'' جو ہے ''رونا'' تو ہے ''رونا''، ''کہنا''

قوم کو قوم بنا سکتے ہیں دولت والے
یہ اگر راہ پہ آ جائیں تو پھر کیا کہنا

بادۂ عیش میں سرمست رہا کرتے ہیں
یاد فرماں نہ ترا اور نہ خدا کا کہنا

ہم نے سو بار کہا ''قوم کی حالت ہے بری''
پر سمجھتے نہیں یہ لوگ ہمارا کہنا

جو مرے دل میں ہے کہ دوں تو کوئی کہ دے گا
منہ پہ ہوتا نہیں اِن لوگوں کو اچھا، کہنا

ہم کہیں کچھ تو کہے جائیں اِنہیں کیا پروا
''کوئی'' کہ دے تو اثر کرتا ہے کیا کیا ''کہنا''

اِن کی محفل میں ہے کچھ بار اُنہیں لوگوں کو
جن کو آتا ہو سرِ بزم لطیفا کہنا
دیکھتے ہیں یہ غریبوں کو تو برہم ہو کر
فقر تھا فخر ترا شاہِ دوعالم ہو کر

اِس مصیبت میں ہے اِک تُو ہی سہارا اپنا
تنگ آ کر لب فریاد ہوا وَا اپنا
ایسی حالت میں بھی امید نہ ٹوٹی اپنی
نام لیوا ہیں ترے تجھ پہ ہے دعویٰ اپنا
فرقہ بندی سے کیا راہ نماؤں نے خراب
ہائے اِن مالیوں نے باغ اُجاڑا اپنا
ہم تو مٹ جائیں گے معمورۂ ہستی سے مگر
صبر اِن راہ نماؤں پہ پڑے گا اپنا
تیری سرکار میں اپنوں کا گلہ کیا کیجے
ہو ہی جاتا ہے مصیبت میں پرایا، اپنا
دیکھ اے نوح کی کشتی کے بچانے والے
آیا گردابِ حوادث میں سفینا اپنا
ہم نے سو راہ اخوت کی نکالی لیکن
نہ تو اپنا ہوا اپنا نہ پرایا اپنا
اِس مصیبت میں اگر تُو بھی ہماری نہ سنے
اور ہم کس سے کہیں جا کے فسانا اپنا؟
ہاں برس ابرِ کرم! دیر نہیں ہے اچھی
کہ نہ ہونے کے برابر ہوا ہونا اپنا

لطف یہ ہے کہ پھلے قوم کی کھیتی اس سے
ورنہ ہونے کو تو آنسو بھی ہے دریا اپنا
اب جو ہے ابر مصیبت کا دھواں دھار آیا
ڈھونڈتا پھرتا ہے تجھ کو دلِ شیدا اپنا
یوں تو پوشیدہ نہ تھی تجھ سے ہماری حالت
ہم نے گھبرا کے مگر تذکرہ چھیڑا اپنا
زندگی تجھ سے ہے اے فخرِ براہیم! اپنی
کر دُعا حق سے کہ مشکل ہوا جینا اپنا
ایک یہ بزم ہے لے دے کے ہماری باقی
ہے اِنہیں لوگوں کی ہمّت پہ بھروسا اپنا
داستاں درد کی لمبی ہے کہیں کیا تجھ سے
ہے ضعیفوں کو سہارے کی تمنا تجھ سے
قوم کو جس سے شفا ہو وہ دوا کون سی ہے؟
یہ چمن جس سے ہرا ہو وہ صبا کون سی ہے؟
جس کی تاثیر سے ہو عزّتِ دین و دنیا
ہائے اے شافعِ محشر! وہ دوا کون سی ہے؟
جس کے ہر قطرے میں تاثیر ہو یکرنگی کی
ہاں بتا دے وہ مئے ہوش رُبا کون سی ہے؟
قافلہ جس سے رواں ہو سوئے منزل اپنا
ناقہ وہ کیا ہے؟ وہ آوازِ درا کون سی ہے؟
اپنی فریاد میں تاثیر نہیں ہے باقی
جس سے دل قوم کا پگھلے وہ صدا کون سی ہے؟

سب کو دولت کا بھروسا ہے زمانے میں مگر
اپنی امید یہاں تیرے سوا کون سی ہے!
اپنی کھیتی ہے اُجڑ جانے کو اے ابرِ کرم!
تجھ کو جو کھینچ کے لائے وہ ہوا کون سی ہے؟
ہے نہاں جن کی گدائی میں امیری سب کی
آج دنیا میں وہ بزمِ فقرا کون سی ہے؟
تیرے قربان کہ دکھا دی ہے یہ محفل تُو نے
میں نے پُوچھا جو "اخوت کی بنا کون سی ہے؟"
راہ اِس محفلِ رنگیں کی دِکھا دے سب کو
اور اِس بزم کا دیوانہ بنا دے سب کو[۲]

"زاہدِ تنگ نظر" اور "یہ نصاریٰ کا خدا" والے اشعار میں عبدالکریم سیالکوٹی کی طرف اشارہ تھا۔

۱۲

"شعر کہنے کی کیفیت کو... جنسی تحریک سے بھی مماثل قرار دیا جا سکتا ہے،" اقبال کا بیان ہے، "اور حالتِ حمل سے بھی۔ جب تک میں اِس کیفیت کی تکمیل میں اشعار نہیں کہہ لیتا مجھے سکون مہیا نہیں ہوتا اور وہ سکون (جب ملتا ہے) تکان اور ماندگی لیے ہوئے ہوتا ہے۔"[۸]

۱۳

اگلی شام اقبال نے 'ابرِ گہر بار' کتابت کے لیے دے دی۔

۱۴

۲۸فروری کو پنجۂ فولاد میں اقبال کا کھلا خط امیرؔ مینائی کے شاگردوں اور احباب کے نام شائع ہوا۔ اتنے بڑے شاعر کی کوئی سوانح ابھی تک شائع نہ ہوئی تھی لہٰذا وہ خود اِس کام کا عزم کرتے ہوئے اُن کے شاگردوں اور دیگر واقف کاروں سے دریافت کرنا چاہتے تھے:

(۱) حضرت امیرؔ مینائی کی کوئی ایسی بات جس نے اُن کی زندگی یا شاعری پر کوئی خاص اثر کیا ہو۔

(۲) اُن کے زبانی مقولے

(۳) اُن کے بچپن کی بعض باتیں جن سے اُن کی آئندہ عظمت کا پتہ چلتا ہو۔

(۴) اُنہوں نے کس کس مقام کا سفر کیا اور کیوں؟

(۵) کس کس اُستاد سے کیا کیا حاصل کیا؟

(۶) اُن کی عام عادات۔

(۷) چند ایک مشاعروں کی مفصّل کیفیت۔

''یہ جتا دینا ضروری ہے کہ یہ مضمون انگریزی میں لکھا جائے گا اور ولایت کے کسی مشہور اخبار یا رسالے میں چھپوایا جائے گا۔''

۱۵

یکم مارچ کو انجمن کا اجلاس ہوا۔ بعض لوگوں کے لیے یہ بات غیرمتوقع رہی ہو گی کہ اقبال جنہوں نے معذرت کر لی تھی ایک نئی نظم لائے ہیں جس کی کاپیاں بھی ہمراہ ہیں۔ 'ابرِ گہر بار یعنی نعتِ عاشقانۂ جنابِ سرورِ کائنات و فریادِ اُمت بر آستانۂ آں ذاتِ بابرکات۔'

بعض بند غلط ترتیب میں چھپ گئے تھے اور جلدی میں کتابت کی غلطیاں دُور نہیں کی جا سکی تھیں۔ ''طور پر تو نے جو اے دیدۂ موسیٰ دیکھا'' میں غلطی سے ''حضرتِ موسیٰ'' لکھا ہُوا تھا مگر یہ نظم انجمن کے جلسوں میں پڑھی جانے والی پچھلی نظموں سے بھی زیادہ

پسند کی گئی۔

یہ نظم جس نفسیاتی تجربے سے دوچار کرتی تھی وہ اسے ایک منفرد حیثیت دیتا تھا اور یہ اقبال کی اپنی اُفتادِ طبع تھی جس کے تحت وہ نفس کی شدید ترین خواہشات کا رُخ موڑ کر اُن کی قوت کو اپنی مرضی کے موضوع پر شعر کہنے میں صرف کر دیتے تھے۔

۱۶

امیر بیگم محض بہانہ تھیں۔ اقبال جس حسن کی محبت میں گرفتار تھے وہ خود اُنہی میں تھا۔ اس تجربے نے صرف اُنہیں اس کے روبرو کر دیا:

نظر جب سے تیری نظر سے ملی ہے
جسے دیکھتا ہوں وہی خوب رُو ہے
خودی نے عطا کی مجھے خودشناسی
مِرا حسن دائم مِرے رُوبرو ہے
نمایاں ہے کثرت میں وحدت کا جلوہ
جدھر دیکھتا ہُوں وہی رُوبرو ہے'

۱۷

ہندوستان کو غلام بنانے والے انگریز بھی پہلے پہل سوداگر کے رُوپ میں یہاں آئے تھے۔ جس طرح مولانا روم کی حکایت میں پرندہ رُوح اور اُسے قید کرنے والا سوداگر دُنیاوی ہوس تھی اُسی طرح ہندوستان کو غلام بنانے والا مغربی استعمار رُوح پر مادّے کو غالب کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔

اقبال کے پرندے میں کہانی اور روحانیت کے ساتھ ایک تیسری جہت کا اضافہ ہو گیا۔ یہ سیاست تھی اور پہلی دونوں جہتوں سے پوری طرح آہنگ تھی۔ پرندے کو اُنہوں نے طوطے کی بجائے بُلبل بنا دیا۔

نظم ترکیب بند میں تھی اور اس میں اکیس شعر تھے۔ چار بند تھے۔ اقبال نے نظم کا نام 'بلبل کی فریاد' رکھا:

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا[10]

۱۸

تعمیر بت کیے ہوئے کعبے کی راہ میں

اس مصرع پر گرہ نہ لگ سکی مگر اس زمین میں پانچ شعر ہو گئے۔[11]

۱۹

انجمن کے جلسوں کی وجہ سے اقبال کے دوستوں میں جو نئے اضافے ہو رہے تھے اُنہی میں سے غلام قادر گرامی تھے، جالندھر کے لاابالی، مخبوط الحواس اور بلند پایہ فارسی شاعر۔

گرامی غالباً اقبال کی فرمایش پر اس مرتبہ لاہور ہی میں ٹھہر گئے اور اُنہی کے گھر قیام کیا۔ اُن کی بیوی جن کا نام بھی اقبال تھا اور تُرک تخلص کر کے شعر کہتی تھیں شوہر کا انتظار کرتی رہ گئیں اور یہ اقبال کے اشعار کی داد دیتے رہے۔

امیر بیگم بھی ان محفلوں میں شریک ہو جاتی تھیں۔

حشر کو مانتا ہوں دن دیکھے
ہائے ہنگامہ اُس کی محفل کا[12]

اقبال میں چھپا ہوا شاعر جو کبھی فلسفی سے دب جاتا تھا اب غالب ہو گیا۔ وقت کا کوئی لحظہ خالی نہیں جاتا تھا جب اپنے پُرانے خواب کی تعبیر کے لیے متفکر نہ ہوں، ملٹن کی تقلید میں طویل نظم لکھنے کا خواب![13]

۲۰

شاید یہ اقبال کی زندگی کا بہترین مہینہ تھا۔

۱۱ مارچ کو عید تھی۔ بارش ہوئی اور بے فکرے دوست گھر میں جمع ہو گئے۔ شاعری کا دور چلا۔ ایسے میں خیال آیا کہ امیر بیگم کے بغیر عید کیا ہو گی۔ فوراً عبدالقادر یا کسی اور دوست کو اُس کی طرف دوڑایا، اُس پہ بن آئے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے!

انتظار کے عالم میں حبیب الرحمٰن شیروانی کا نام لے کر کاغذ کھینچا اور قلم اٹھا کر خط لکھنے بیٹھ گئے۔ ''آج عید کا دن ہے اور بارش ہو رہی ہے۔ گرامی صاحب تشریف رکھتے ہیں اور شعر و سخن کی محفل گرم ہے۔ شیخ عبدالقادر ابھی اُٹھ کر کسی کام کو گئے ہیں... اور راہِ گھر بار کی اصل علت کی آمد آمد ہے... ملٹن کی تقلید میں کچھ لکھنے کا ارادہ مدّت سے ہے...'' جب لکھنے کو کچھ نہ رہا تو خط میں اپنی نظمیں درج کرنے لگے۔ 'بلبل کی فریاد' درج کی۔

غرض یہ کہ اُن دنوں خوب موج میں تھے۔ ایک دن مشن کالج کے پرنسپل حاکم علی کا نوکر کسی کام سے اُن کے پاس آیا۔ ہوشیار پور کا رہنے والا اور اقبال ہی کے الفاظ میں بالکل ''جانگلو''! اُس کا نام علی بخش تھا۔

نہ جانے اُس کی کیا بات اقبال کو اچھی لگی کہ اُس سے پنجابی میں کہا، ''تم ہمارے پاس اچھے رہو گے۔'' وہ خوش ہوا مگر حاکم علی کی ملازمت چھوڑنے کے لیے کچھ دنوں کی مہلت طلب کر لی۔[۱۴]

۲۱

سیالکوٹ جانا ہوا۔ رئیس آغا باقر کے بیٹے محمد ناصر خاں کے ختنے کی تقریب میں کسی نے امیر مینائی کے دیوان صنم خانۂ عشق میں سے طرح مصرع نکال کر محمد ناصر خاں کا سہرا لکھنے کی فرمائش کی۔ اُنیس اشعار ہو گئے:

گلِ مضموں سے اے اقبال! یہ سہرا ہے ناصر کا
غزل تیری غزل کیا ہے کسی گل چیں کی جھولی ہے[۱۵]

۲۲

اپریل میں ناصر خاں کا سہرا اور ''ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی'' والی غزل مخزن میں شائع ہوئے۔

۲۳

لطف جب آتا ہے اقبال سخن گوئی کا
شعر نکلے صدفِ دل سے گہر کی صورت

کم سے کم سترہ اشعار ہوئے جن میں سے کچھ مخزن میں بھی بھیجے مگر شعر کے موتی بن کر دل کے صدف سے نکلنے کا جو مطلب اقبال کے سامنے ہو سکتا تھا اُس کی بجائے ایک دفعہ پھر داغ کا رنگ چھا گیا تھا۔[۱۶]

۲۰

۱۹ اپریل کو اورینٹل کالج میں نئے پرنسپل صاحب مقرر ہوئے اور آرنلڈ دوبارہ گورنمنٹ کالج کے شعبۂ فلسفہ میں پہنچے۔[۱۷] توقع تھی کہ وہ اقبال کو پھر وہیں بلوا لیں گے۔

۲۴

لاہور میں کوئی نوازش صاحب رہتے تھے۔ اقبال ان کے یہاں گرامی اور کسی بزرگ کے ہمراہ بیٹھے تھے کہ دردِ قولنج کی تکلیف محسوس ہوئی جو انہیں اب کبھی کبھی محسوس ہونے لگی تھی۔ میزبان عجیب ستم ظریف تھا کہ ایک مصرع پڑھا جس کی ردیف 'اہل درد' تھی۔ پھر فرمائش کر دی کہ اِس پر کچھ اشعار کہے جائیں۔ اقبال نے 'اہل درد' کے عنوان سے

اکتیس اشعار کا دوغزلہ کہہ ڈالا:

موجِ خونِ سرمد و تبریزی و منصور سے
کس قدر رنگیں ہے یا رب داستانِ اہلِ درد![18]

۴۵

اقبال کی ایک اور غزل ''تو نہاں مجھ سے میرے داغِ جگر کی صورت'' مخزن کے مئی کے شمارے میں شائع ہوئی۔ یہ غزلیں اُس معیار سے بہت پست ہیں جو وہ اُس وقت تک اپنے لیے بنا چکے تھے۔ 'ہمالہ' اور 'ابرِ گہر بار' کے بعد مخزن میں ایسی چیزوں کی اشاعت گوارا کی تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے اندر کا شاعر اُن دنوں بیتاب تھا۔

ص ۴۷-۴۶ پر کسی شاعر کی نظم شائع ہوئی جو ولیم بارنس کی انگریزی نظم کا ترجمہ تھی۔

ماں کا خواب

جبکہ سوتے تھے گھونسلوں میں طیور
آدمی نشۂ خواب میں مخمور
میں بھی ظاہر میں سو رہی تھی مگر
دل میرا بن رہا تھا بقعۂ نور
دیکھتی کیا ہوں کر رہی ہوں تلاش
اپنے بچے کی آسماں پر دُور
میرا بچہ کبھی جو تھا زندہ
چھوڑ مجھ کو گیا ہے اب مہجور
ہائے میرے نہ یہ ہوئے مقسوم
میرے دل کا سدا وہ رہتا سرور
اس تجسس میں کچھ تشکیل و سلیم

بچے لائن میں کرتے دیکھے عبور
سب کے ہاتھوں میں شمعیں تھیں
روشن

سب کے سب تھے سفید جوں بلور
شکل ہر اک کی صاف آئی نظر
بولنے سے مگر وہ تھے معذور

میرا بچہ بھی اپنی باری میں
گذرا قدرے اُداس میرے حضور
لیک جو شمع اس کے ہاتھ میں تھی
روشنی آہ اُس سے تھی مفرور

مُڑ کے پیچھے یہ بولا بچہ مرا
تاکہ اندیشہ میرا کر دے دُور
''میری امّاں نہ کر تُو نوحہ گری
تیرے اشکوں نے شمع کی کافور''

صدرالدین (ازقصور)

اس نظم کے نیچے ص ۷۴ ہی پر کسی شاعر ریاض کے اشعار کا انتخاب محمد سخاوت حسین کا کیا ہوا چھپا تھا جس کا پہلا شعر تھا:

دل میں چھپ جائے وہ کانٹا چاہیے
دل میں بس جائے وہ صحرا چاہیے

ص ۵۵ پر یہ افسوس ناک نوٹ درج تھا: ''کوئی شخص جو میر مہدی مجروح کے کلام سے آشنا ہے یا جس نے غالب مرحوم کے اِس لائق شاگرد کا نام سنا ہے اس خبر کو بغیر قلق کے نہ سن سکے گا کہ اس مہینے میر مہدی اس جہاں سے اٹھ گئے...''

مــخـزن میں قصور کے کسی صدرالدین کی جو نظم شائع ہوئی تھی اُسی موضوع پر ایک انگریزی نظم پہلے سے موجود تھی:

The Mother's Dream

By William Barnes

I'd a dream to-night
As I fell asleep,
Oh! the touching sight
Makes me still to weep;
Of my little lad,
Gone to leave me sad,
Aye, the child I had,
But was not to keep.
As in heaven high,
I my child did seek,
There, in train, came by
Children fair and meek.
Each in lily white,
With a lamp alight;
Each was clear to sight,
But they did not speak.
Then, a little sad,

Came my child in turn,

But the lamp he had,

Oh! it did not burn;

He, to clear my doubt,

Said, half-burned about,

"Your tears put it out;

Mother, never mourn."

۲۷

ماں کا خواب

(ماخوذ)

بچوں کے لیے

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب
بڑھا اور جس سے مرا اضطراب
یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں
اندھیرا ہے اور راہ ملتی نہیں
لرزتا تھا ڈر سے مرا بال بال
قدم کا تھا دہشت سے اٹھنا محال
جو کچھ حوصلہ پا کے آگے بڑھی
تو دیکھا قطار ایک لڑکوں کی تھی
زمرد سی پوشاک پہنے ہوئے
دیے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے

وہ چپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں
خدا جانے جانا تھا اُن کو کہاں
اسی سوچ میں تھی کہ میرا پسر
مجھے اس جماعت میں آیا نظر
وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا
دیا اس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا
کہا میں نے پہچان کر، میری جاں!
مجھے چھوڑ کر آ گئے تم کہاں؟
جدائی میں رہتی ہوں میں بے قرار
پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار
نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی
گئے چھوڑ، اچھی وفا تم نے کی!
جو بچے نے دیکھا مرا پیچ و تاب
دیا اس نے منہ پھیر کر یوں جواب
رلاتی ہے تجھ کو جدائی مری
نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی مری
یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چپ رہا
دیا پھر دکھا کر یہ کہنے لگا
سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے؟
ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے!

نہیں معلوم اقبال نے یہ نظم کب لکھی۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ پہلے اقبال نے ولیم بارنس سے ماخوذ یہ نظم لکھ کر کہیں شائع کروائی اور پھر صدرالدین نے اپنی نظم

مخزن میں بھیجی یا صدرالدین کی نظم دیکھ کر اقبال کو خیال آیا۔

اس نظم کے نو متروک اشعار جو ملتے ہیں اُن کے بارے میں معلوم نہیں کہ وہ اقبال کے غیر مطبوعہ کاغذات میں سے نقل کیے گئے یا اگر نظم کی کسی ابتدائی طباعت میں شامل تھے تو اقبال نے انہیں کب خارج کیا کیونکہ بہرحال ۱۹۲۴ء سے پہلے بھی اس نظم کا ترقی یافتہ متن وجود پا چکا تھا جس میں یہ اشعار شامل نہ تھے:

کوئی اس سمے کا بیاں کیا کرے
اندھیرا خموشی بغل گیر تھے
سیاہی کا نقشہ تھا ایسا جما
اُجالا کہیں نام کو بھی نہ تھا
ستارے فلک پر چمکتے نہ تھے
کہ ظلمت کے ڈر سے تھے سہمے ہوئے

...

یکایک دکھائی دیا چاندنا
ہوا جس سے کچھ کچھ مجھے حوصلہ
بڑی دُور تھی مجھ سے یہ روشنی
مگر رفتہ رفتہ قریب آ گئی
کہوں کیا جماعت وہ بچوں کی تھی
کہ معصومیت چلتی پھرتی ہوئی

...

جدائی کے صدمے سہوں کس طرح
جو گذری ہے مجھ پر کہوں کس طرح
پریشاں ترے غم میں رہتا ہے دل

عجب طرح کے رنج سہتا ہے دل
اجل سے بھی بدتر ہے جینا مرا
لٹا دن دہاڑے خزینہ مرا

انگریزی نظم اور صدرالدین کی نظم سے اقبال کی نظم بالخصوص متروک اشعار کے بغیر بعض بنیادی اختلافات رکھتی ہے۔ انگریزی نظم میں ماں خواب سنانے سے پہلے ہی قارئین کو بتا دیتی ہے کہ اُس کا بچہ مر چکا ہے۔ صدرالدین کی نظم میں بچے کی موت کا تذکرہ خواب کے بیان کے بیچ میں آتا ہے مگر وہاں بھی اس پر اصرار ہے۔ اقبال کی نظم کی ابتدا ہی خواب کے بیان سے ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ امکان موجود رہتا ہے کہ بچہ سچ مچ میں نہ مرا ہو بلکہ ماں نے صرف خواب میں اُسے مردہ دیکھا ہو۔

یہ فرق اس لحاظ سے اہم ہو جاتا ہے کہ اقبال کے یہاں روشنی اُس علم کا استعارہ تھا جو انسان کی شخصیت بدل دیتا ہے بلکہ تصوف کی رُو سے ایک طرح کی فنا سے ہم کنار کر کے نئی شخصیت عطا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بچے کا ان مراحل سے گزرنا بھی ماں کے خواب میں بچے کی موت کا استعارہ بن سکتا ہے۔ وہ دیا جو بچے کے ہاتھوں میں روشن نہیں تھا وہ کہیں وہی روشنی تو نہیں تھی جس کی دعا 'ایک بچے کی دعا' میں بھی مانگی گئی تھی اور جس کی بدولت 'ہمدردی' میں جگنو نے بلبل کی رہنمائی کی تھی؟[۱۹]

۲۸

۳ جون کو آرنلڈ نے اقبال کو گورنمنٹ کالج کے شعبۂ فلسفہ میں عارضی پروفیسر مقرر کروالیا۔[۲۰]

اُس مہینے مخزن میں شاہ دین ہمایوں کی نظم 'شالامار کشمیر' ص ۴۹-۴۷ پر شائع ہوئی:

ناظرؔ بڑا مزا ہو جو اقبالؔ ساتھ دے

ہر سال ہم ہوں شیخ ہو اور شالامار ہو

۲۹

اقبال کے ہم صفیر بڑھ رہے تھے۔ دکن کے شاعر نادر کاکوروی کبھی اقبال سے نہیں ملے تھے مگر مشتاق تھے:

پاس والوں کو تو آخر دیکھنا ہی تھا مجھے
نادرِ کاکوروی نے دُور سے دیکھا مجھے

اقبال کی اس غزل کے اکیس شعر دستیاب ہیں۔[۲۱]

۳۰

سجاد حیدر یلدرم نے اُس برس کسی رسالے میں تحریر کیا:

''ہمیں خوشی اور کشادہ دلی سے ماننا چاہیے کہ اُردو کو ایک نیا شاعر ملا ہے جس کی آواز ہر روز لطیف تر، جس کا نغمہ ہر آن شیریں تر اور جس کا تخیل ہر لمحہ بلند تر ہوتا جاتا ہے۔ یہ تنگ دلی، یہ بچوں کا سا رشک، یہ اک شخص کی خداداد قابلیت کے اعتراف سے ابا کیوں ہے؟ اگر عندلیبِ خوش نوا دفعتہً اور رفتہً کسی شاخِ گل پر بیٹھ کر ایسی جاں آویز اور دل گداز نغمہ سنجی شروع کر دیتی ہے جو اور عنادل میں نہیں تو میں خیال کرتا ہوں (میں صرف خیال کرتا ہوں کیونکہ میں عندلیب نہیں، کاش میں مرغِ خوش الحان نہیں تو مرغِ ساکت ہی ہوتا تا کہ اپنے موجودہ ہم جنس انسانوں کی تنگ دلی کا نظارہ نہ دیکھتا!) کہ اور ہم صفیرانِ چمن اس نغمے کو سنتے ہیں اور اس نئے ہم صفیر کا دلی مسرّت سے خیر مقدم کرتے ہیں مگر ہمارے باغِ سخن کے نو آموز عنادل کسی نوعمر عندلیب کا ایسا نغمہ جو اُن کے نغمے سے بدر جہا بہتر ہو بغیر رشک کے نہیں سن سکتے! تعجب ہے اور افسوس!''[۲۲]

۳۱

اُن دنوں عطا محمد برٹش بلوچستان میں ایس ڈی او تھے۔ انگریز میجر انجینئر سے جھگڑا کر بیٹھے۔ اُس نے کسی دیسی ملازم کو ساتھ ملا کر جو پہلے ہی ان سے پرخاش رکھتا تھا، سازش کی اور ایک دن اہلِ خانہ کو اطلاع ملی کہ عطا محمد اسٹور سے مال خورد بُرد کرنے پر حراست میں لے لیے گئے ہیں۔[۲۳]

اقبال نے سُنا تو بے چین ہو گئے۔ فوراً دوستوں کی محفل اُٹھا دی اور سامان باندھا۔ عام حالات میں سفر کے تصور سے بھی اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے مگر یہ معاملہ عطا محمد کا تھا۔ ٹرین پر بیٹھ کر بلوچستان پہنچے۔ یہ راستے کا آسان ترین حصہ تھا۔ قلعہ سنڈیمن پہنچنے کے لیے جہاں عطا محمد تھے، ابھی کوئی مزید سو میل کا سفر گھوڑے اور اونٹ پر طے کرنا تھا!

اِس سفر میں اقبال کو پوری طرح اندازہ ہوا کہ امیر نے اُن کی زندگی میں کیا اہمیت حاصل کر لی ہے۔ دُور ہونے سے کشش کم نہیں ہوئی تھی بلکہ بڑھ گئی تھی۔

از مقام مغل کوٹ

ڈیر سیّد تقی۔ السّلام علیکم... خدا کی پناہ! پہلے روز ۳۷ میل کا سفر گھوڑے پر کیا۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مجھے کس قدر تکلیف ہوئی ہو گی لیکن جو تکلیف محبت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو وہ لذیذ ہو جاتی ہے... بھائی صاحب کے متعلق خبر ملی۔ ان کو رائل انجینئر کوئٹہ کے تار پر تار دینے کی وجہ سے حراست سے نکال دیا ہے...

امیر کہاں ہے، خدا کے لیے وہاں ضرور جایا کریں۔ مجھے بہت اضطراب ہے۔ خدا جانے اس میں کیا راز ہے۔ جتنا دُور ہو رہا ہوں۔ اُتنا ہی اُس سے قریب ہو رہا ہُوں۔ و السّلام۔

شیخ صاحب [عبدالقادر] کی خدمت میں یہ تمام حالات عرض کر دیں۔ والسلام۔ آپکا
مخلص محمد اقبال

۲۷

دہلی میں خواجہ نظام الدین اولیأ کا عُرس تھا۔ ہجوم میں ایک درویش قسم کا آدمی نظم پڑھ

رہا تھا۔ بال کمر تک لمبے اور سینہ اِتنا تنگ جیسے بارہ برس کا بچہ ہو۔[۲۴] یہ درگاہ کے توشہ خانے کے مہتمم خواجہ حسن نظامی تھے جن کا سلسلۂ نسب خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے ملتا تھا۔ مشہور انشا پرداز تھے۔

نظم میں دہلی کے خواجہؒ سے درخواست کی گئی تھی کہ شاعر کی مشکلیں آسان کر دیں اور اُس کا بھائی جن مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے اپنی برکت سے اُنہیں دُور کر دیں۔ اِس کے لیے شاعر نے دہلی کے خواجہ کو اُن کے ایک مرید کا واسطہ دیا تھا جو اُن کا ہم نام گزرا تھا:

محوِ اظہارِ تمنائے دلِ ناکام ہُوں
لاج رکھ لینا کہ میں اقبال کا ہم نام ہُوں

یہ نظم اقبال نے حسن نظامی کو بھیجی تھی۔ ترکیب بند تھی۔ تین بند تھے جن میں اشعار کی تعداد بتدریج بڑھتی جاتی تھی یعنی تیرہ، چودہ اور پندرہ۔ عنوان 'برگِ گل' تھا۔[۲۵]

نظم کے دوسرے بند میں خواجہ کو مدفونِ یثربؐ کی قسم دی تھی۔ ایک بزرگ کو اِتنی بڑی قسم دینا جسارت کی بات تھی جس کے لیے اقبال نے کسی نہ کسی سے اجازت لی ہو گی یا پھر خواجہ سے اُنہیں کوئی خاص تعلق پیدا ہو چکا ہوگا۔

۲۹ جولائی کو ہفت روزہ وطن لاہور میں 'مناجات' کے عنوان سے شائع ہوئی۔

۳۲

مکتوب بنام نواب حبیب الرحمٰن شروانی

از شہر سیالکوٹ

۱۶ اگست ۱۹۰۳ء

مخدوم و مکرم جناب قبلہ خان صاحب

السلام علیکم

...خدا کے فضل سے اُس تشویش کا خاتمہ ہوا... بھائی صاحب بَری ہوئے۔ اگرچہ روپیہ کثیر صَرف ہوا تاہم شکر ہے...ہم باقی رہ گئے اور ہماری مصیبت دشمنوں کی تلاش میں پھر بلوچستان کی طرف عُود کر گئی...والسلام

آپ کا مخلص
محمد اقبالؔ

۴۳

کوئٹہ سے واپسی کے بعد اقبال اور امیر بیگم کی پہلی ملاقات کا احوال معلوم نہیں مگر ایک غزل کے اِستعاروں کے پردے کے پیچھے سے کوئی نغمہ اُبھرتا سنائی دیتا ہے۔

غزل

عبادت میں زاہد کو مسرور رہنا
مجھے پی کے تھوڑی سی مخمور رہنا
تمھیں کیا بتائیں محبت ہے کیا شے
یہ ہے دل کے ہاتھوں سے مجبور رہنا
دِکھاوے کی بے اعتنائی کے صدقے
بڑے کام آیا مرا دُور رہنا
وہ سَو ناز اقبالؔ پر کر رہے ہیں
زمانے میں ہے اُن کو مشہور رہنا

اِس غزل کے تیرہ شعر دستیاب ہیں۔[۴۰] اگست میں ''نادِر کاکوری نے دُور سے دیکھا مجھے'' والی غزل خدنگِ نظر لکھنؤ میں اور یہ غزل مخزن میں شائع ہوئی۔ مخزن میں اس کے ساتھ اسی زمین میں نیرنگؔ اور اعجاز کی غزلیں بھی شائع ہوئیں:

یہ شایاں ہے عاشق کا دستور رہنا
ترے جور سہ کر بھی مسرور رہنا
نیرنگ

ہر ایک حال میں شاد و مسرور رہنا
نہ مغموم رہنا نہ رنجور رہنا
اعجاز

ص ۵-۱ پر میرٹھ کے منشی نیاز احمد کا مضمون 'زندگی کی خزاں' اقبال کی ایک غزل کے شعر سے شروع ہوا تھا:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

مضمون اسراف کے خلاف تھا۔ ''جیسے پرانی رسمیں اور ان کے بے جا اخراجات ناپسندیدہ ہیں ویسے ہی نئے فیشن کے بھی غیر ضروری مصارف گراں اور قابلِ انسداد خیال کیے جاتے ہیں اور یہ سراسر انصاف کا خون ہے کہ پرانی لغویات چھڑا کر نئی لغویات کا رواج منظور کیا جائے۔''

ص ۸-۵ پر کسی جہانگیر کا مضمون 'ایک سین اور اس کے چھ پردے' کنارِ راوی کے بعض مناظر کی لفظی تصویر کشی پر مشتمل تھا۔ ص ۵۲ پر اسی مصنف نے اقبال کی غزل کا جواب دیا تھا:

مانا کہ ضبط عشق میں سیکھا کرے کوئی
بے اختیار دل کو مگر کیا کرے کوئی

اُس مہینے حسرت موہانی کے رسالے اُردوئے معلّیٰ میں ایک مضمون 'اُردو زبان پنجاب میں' شائع ہُوا۔ لکھنے والے کے نام کی جگہ 'تنقیدِ ہمدرد' چھپا۔ ممکن ہے خود حسرت موہانی نے لکھا ہو۔ مضمون نگار نے خوشی محمد ناظر اور اقبال کی زبان پر اعتراضات کیے

تھے اور آخر میں کہا تھا کہ خلافِ محاورہ زبان کے رواج سے بہتر ہے کہ اُردو زبان کا پنجاب میں فروغ ہی نہ ہو۔[۴۷]

۳۴

۱۷ اگست ۱۹۰۳ء کو خواجہ صاحب والی نظم پنجۂ فولاد میں 'ایک دردمند دل کی عرض' کے طور پر شائع ہوئی۔

اقبال اور شیخ عبدالقادر کے درمیان کبھی کبھی یہ بحث ہوتی تھی کہ حسن نظامی جوان ہوں گے یا بوڑھے۔ اقبال کا خیال تھا کہ عمر رسیدہ آدمی ہوں گے۔[۴۸]

۳۵

ہر صبح قرآن پڑھتے ہوئے تاریخ اور قبل از تاریخ کے پراسرار واقعات اقبال کی آنکھوں کے سامنے آجاتے تھے۔ آدم کو بنانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک امانت کائنات کی ہر شے کے سامنے رکھی مگر کسی نے اس بوجھ کو اُٹھانے کی ہمت نہ کی۔ پھر اسے آدم نے قبول کیا۔ وہ بوجھ کیا تھا؟

شیخ نور محمد کبھی کبھی کہتے، ''نجانے بندہ اپنے ربّ سے کب کا بچھڑا ہوا ہے'' اور اُن کی ہچکیاں بندھ جاتیں۔[۴۹]

۳۶

عرب صُوفی نسفی نے کہا تھا کہ حسنِ ازل جسے حقیقتِ اصلی کہنا چاہیے لامحدود ہے۔ فطرت ایک آئینہ ہے جس میں اُس کی جھلک نظر آتی ہے مگر آئینہ بھی دو طرح کا ہو سکتا ہے۔ ایک وہ جو محض حسن کا عکس پیش کرتا ہے اور بزمِ قدرت ایسا ہی آئینہ ہے۔ دوسری طرح کا آئینہ حسن کے باطنی جوہر کو بھی محفوظ کر لیتا ہے۔ یہ انسان ہے جو اُس لامحدود ہستی کی ایک محدود صُورت ہے مگر بھول کر خود کو اُس سے الگ سمجھ بیٹھتا ہے۔[۳۰]

ایک صبح شاعر نے سورج سے اپنی سیہ روزی کا سبب پوچھا تو بزمِ قدرت کی غیبی آواز نے اُسے یہی بات سمجھائی۔ یہ نظم ترکیب بند تھی۔ دو بند تھے۔ تیس شعر۔ عنوان 'انسان اور بزمِ قدرت' تھا:

تُو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے پھر نہ سیہ کار رہے[۳۱]

اُن دنوں عربی ادب کا مطالعہ زیادہ کر رہے ہوں گے کیونکہ اُنہی دنوں کی ایک اور نظم میں ریت گھڑی کی ریت سے پوچھا، ''فتنہ جُو نے تجھ سے دشتِ عرب چھڑایا؟'' پھر اُس کی صدیوں کی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے بہت سے تاریخی واقعات کا ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے:

تُو گردِ پا ہے شائد بصرے کے زائروں کی
بانگِ درا سے تیرا ہر ذرّہ ہے شناسا

یہ بھی ترکیب بند تھی۔ بارہ اشعار کا ایک بند تھا۔ عنوان 'شیشہ ساعت کی ریگ' تھا۔[۳۲]

ستمبر میں 'شیشہ ساعت کی ریگ' خدنگِ نظر میں اور 'انسان اور بزمِ قدرت' مخزن میں شائع ہوئی۔ ص ۱۶ پر شاد عظیم آبادی کے قلم سے ایک شذرہ شائع ہوا تھا:

صوفیوں کی شان

حضرت شاہ بوعلی قلندر رحمتہ اللہ علیہ کے زمانہ میں پانی پت کی فوجداری پر ایک امیر بحال ہو کر دہلی سے آیا۔ ایک دن اِس فوجدار کی سواری جا رہی تھی۔ رستہ میں کوئی فقیر سامنے آ گیا۔ خاص برداروں میں سے کسی نے ایک بلّم اُسکے سر پر مار دیا تا کہ رستہ سے ہٹ جائے۔ اُس فقیر کا سر پھٹ گیا۔ اور خون بہنے لگا۔ وہ فقیر روتا ہوا قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر فریادی ہوا۔ قلندر صاحب بیٹھے جھوم رہے تھے۔ آپ کو غصہ آ

گیا۔ منشی کو بلا کر فرمایا بنولیس ''مرزبان ہندوستان بداند کہ سگے از سگانِ دنیا فقیرے را برسر زد بجائے او دیگرے را فرست ورنہ بجائے تو دیگرے را بفرستم۔'' غرض یہ خط جب تغلق (شاہنشاہِ ہند) کے پاس پہنچا تو گھبرا گیا خط کا جواب لکھا گیا۔ اب یہ تجویز ہونے لگی کہ کون لیجائے۔ امیر خسرو تجویز کیے گئے اور بادشاہی خط لیکر پانی پت آئے جب قلندر صاحب کی خدمت میں پہونچے تو قلندر صاحب نے فرمایا کہ ''خسروِ جانہ کو (غزل گو) تو ئی اگر از کلام سعدی چیزے یاد داری بخواں۔'' امیر خسرو نے شیخ سعدی کا یہ مطلع پڑھا۔

ایکہ گفتی ہیچ مشکل جز فراقِ یار نیست
گر امیدِ وصل باشد آنچناں دشوار نیست

سنتے ہی قلندر صاحب نے ایک نعرہ مارا اور تین دن ہوش نہ آیا۔ (شاہ عظیم آبادی)

۳۷

'اُردو زبان پنجاب میں' نے اچھا خاصا معرکہ گرم کردیا۔ میر غلام بھیک نیرنگ نے ''انبالوی'' کے نام سے اس کا جواب لکھا جو شاید ستمبر میں کہیں شائع ہُوا۔

اقبال نے اپنے دردِ عشق سے کہا نامحرموں میں آشکار نہ ہو، شاعر سے کہا خاموش رہے اور بانسری سے کہا کہ جدائیوں کی شکایت کو سینے میں دبالے:

یہ دور نکتہ چیں ہے کہیں چھپ کے بیٹھ رہ
جس دل میں تو مکیں ہے وہیں چھپ کے بیٹھ رہ

اِس کے بعد خود اساتذہ کے کلام سے اسناد تلاش کرنے میں مصروف ہوئے اور اُن کی نظم 'دردِ عشق' ۲۸ ستمبر کے 'پنجہ فولاد' میں شائع ہوئی۔ ترکیب بند تھی۔ دو بند تھے۔ اکیس اشعار۔ ۳۳

علی بخش کو اقبال کی پیشکش یاد تھی۔ اُس نے گاؤں سے اپنے بھائی کو بلوایا کر حاکم علی کے گھر نوکر رکھوا دیا اور خود اقبال کے پاس آ گیا۔ اقبال کے معمولات کو سمجھنے میں اُسے کچھ وقت لگا۔

ان کی طبیعت کچھ اس طرح کی تھی کہ گردوپیش کی دُنیا سے زیادہ اپنے ذہن میں رہتے تھے۔ کئی سرگرمیاں تھیں جنہیں سچ مچ انجام دینے کی بجائے فقط سوچ کر ہی ان کی تسکین ہو جاتی تھی چنانچہ ہلنا جلنا ناگوار گزرتا تھا اور کوشش کرتے تھے کہ اس کے بغیر سارے کام کروالیں۔ کبھی اکھاڑے میں لنگوٹ کس کر ورزش بھی کی تھی مگر اب شاید وہ مشغلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ بس ہر روز صبح سویرے اُٹھ کر فجر کی نماز ادا کرنا اور پھر تلاوت ایسا معمول تھا جسے وہ کبھی ترک نہیں کرتے تھے۔

کالج سے واپس آنے کے بعد گرمیوں میں دھوتی اور بنیان پہن لیتے تھے۔ سردیوں میں اُس پر کشمیری دُھسّے کا اضافہ ہو جاتا تھا اور بس! گھر میں زیادہ وقت آرام کرسی میں بیٹھ کر کتابیں پڑھتے گزرتا اور ایسے میں علی بخش کا کام یہ ہوتا کہ تھوڑی دیر بعد اُن کا حقہ تازہ کرتا رہے۔ تمبا کو نظام دین کے کھیت سے آتا تھا۔

شام کو دوستوں کی آمد ہوتی اور وہ اُسی آرام کرسی میں پڑے پڑے اُن سے باتیں کرنے لگتے تھے۔ ایسے میں علی بخش کو اُن کے کمرے سے قہقہوں کی آوازیں آتی تھیں۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ کوئی علمی گفتگو ہو رہی ہے اور ویسے علمی گفتگو کا مطلب وہ جانتا بھی نہیں تھا۔

کبھی اقبال کسی دوست کو بھیج کر امیر بیگم کو بلوا لیتے تو پھر ساز و نغمہ کی آوازیں بلند ہونے لگتیں۔

دلبرِ جانانِ من، برد دل و جانِ من
برد دل و جانِ من، دلبرِ جانانِ من

(حافظؔ)

یہ علی بخش کی سمجھ سے اونچی باتیں تھیں۔ اُسے تو کھانا پکانا بھی نہیں آتا تھا۔ کہیں سے آلو گوشت کا سالن پکانا سیکھ لیا تھا۔ مسلسل کئی مہینے اقبال کو یہی کھلاتا رہا اور وہ بھی چپ چاپ زہر مار کرتے رہے کیونکہ جب تک آم دسترخوان پر موجود ہوں وہ کسی دوسری چیز کی کمی محسوس نہیں کر سکتے تھے۔

رات کو سوتے ہوئے وہ بڑے بھیانک خراٹے لیتے جو کبھی کبھی اچانک رُک جاتے اور ایک طویل ہانک سُنائی دیتی، ''علی بخش! کاغذ پنسل لے آؤ۔'' یہ دوڑ کر دونوں چیزیں لے جاتا۔ اقبال روشنی کرتے جس میں علی بخش کو بس اتنا نظر آتا کہ اُن کا چہرہ سُرخ ہوگیا ہے، کسی دوسرے کے وجود کا احساس نہیں رہا اور تیزی سے کچھ لکھے چلے جا رہے ہیں۔ علی بخش جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا ایک عرصے تک نہ سمجھ سکا کہ صاحب کو آدھی رات کے وقت یہ کیسا دورہ پڑتا ہے اور وہ اِس کا علاج کیوں نہیں کروا لیتے۔[۳۴]

کہوں کیا آرزوئے بے دِلی مجھ کو کہاں تک ہے؟
مِرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے
زمانے بھر میں رُسوا ہُوں مگر اے وائے نادانی
سمجھتا ہُوں کہ میرا عشق میرے رازداں تک ہے

اِس غزل کے سترہ اشعار دستیاب ہیں۔ اکتوبر میں مخزن میں شائع ہوئی۔[۳۵]

۳۹

ایمرسن ایک انگریز تھا جسے کسی ہندوستانی پر گولی چلانے کی پاداش میں انگلستان واپس بھجوایا گیا تھا مگر یہاں انصاف کے مطالبے نے زور پکڑا تو اُسے واپس بلوا کر مقدمہ قائم کیا گیا۔

۹ اکتوبر کو مقدمہ کا فیصلہ ہوگیا۔ عدالت نے فیصلہ سناتے ہوئے ایمرسن کو باعزت

بری کیا تھا اور ملازمت کی بحالی اور مالی نقصان کی تلافی کا حکم بھی صادر فرمایا تھا۔

۴۰

شیخ عبدالقادر 'اردو زبان پنجاب میں' والی بحث کو ناگوار قرار دیتے تھے مگر اقبال نے جوابی مضمون لکھ لیا تو اُنہوں نے مخزن کے اکتوبر کے پرچے میں اس نوٹ کے ساتھ شائع کر دیا، ''جس تحقیق سے شیخ محمد اقبال صاحب نے کام لیا ہے، وہ قابلِ داد ہے اور اسے اس بحث کا خاتمہ سمجھنا چاہیے۔''

اقبال نے تنقیدِ ہمدرد کے آٹھ اعتراضات کے خلاف اپنے دفاع میں اساتذہ کے کلام سے استناد کیا تھا البتہ ''مجھ کو'' کی بجائے ''میں نے'' کے استعمال کو اپنی بے دھیانی کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے اعتراض تسلیم کیا تھا۔

اس مضمون میں فارسی اور اُردو کے ۲۳ اساتذہ کے کلام سے دلائل تلاش کیے گئے تھے اور ساتھ میں حسرتؔ موہانی کے ایک شعر کا بھی حوالے دے دیا تھا۔ اساتذہ کے نام یہ تھے: امیرؔ مینائی، مومنؔ، مصحفیؔ، سوداؔ، میرتقی میرؔ، داغؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، عبدالوہاب، نشاط شیرازی، ناسخؔ، فردوسی، سعدی، فوقی ریزدی، نظامی، غالبؔ، امیر اللہ تسلیم، برقؔ، انیسؔ شیخ علی حزیںؔ، آتشؔ جلالؔ لکھنوی، ممنونؔ دہلوی، ملولؔ لکھنوی اور بیدلؔ۔

مضمون کے آخر میں اقبال نے لکھا تھا، ''اگر اہلِ پنجاب مجھ کو یا حضرت ناظرؔ کو ہمہ وجوہ کامل خیال کرتے ہیں تو اُن کی غلطی ہے۔ زبان کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی دشوار گزار وادی ہے کہ یہاں قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہے۔ قسم بخدائے لایزال مَیں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ بسا اوقات میرے قلب کی کیفیت اس قسم کی ہوتی ہے کہ میں باوجود اپنی بے علمی اور کم مائیگی کے شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں ورنہ مجھے زبان دانی کا دعویٰ ہے نہ شاعری کا۔''

۴۱

Love and death

What time the mighty moon was gathering light

Love paced the thimey plots of paradise...

یہ ٹینی سن کی کمزور نظموں میں سے تھی مگر فنا اور بقا کے اَسرار کی جستجو میں نمودِ جہاں کی گھڑی تک پہنچنے کا بہانہ بنی۔ ترکیب بند کی صورت میں اقبال نے اِس حکایت کو نظم کیا جس کے مطابق روزِ ازل عشق کی مسکراہٹ نے موت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ دو بند تھے، اُنتیس شعر اور عنوان 'عشق اور موت' تھا۔[۲۶]

۴۲

پنجاب کا علاقہ بہاولپور اُن دنوں ریاست تھا جہاں کے نواب انگریزوں کی سرپرستی میں حکومت کیا کرتے تھے۔ ۱۲ نومبر کو اس علاقے کی دھج دیکھنے والی تھی نوابزادہ مبارک بالغ ہو گیا تھا اور وائسرائے ہند لارڈ کرزن اپنے ہاتھوں سے اُسے تاج پہنانے تشریف لا رہے تھے۔ دُور دُور کے مشاہیر کو دعوت نامے بھیجے گئے۔ انجمن حمایت اسلام کے توسط سے ایک دعوت نامہ اقبال کو بھی ملا تھا۔[۲۷]

۱۲ نومبر کو شیخ عبدالقادر جشن میں شریک ہوئے کیونکہ صحافی کی حیثیت میں اُنہیں تو وہاں موجود ہونا ہی تھا البتہ ان کے ذمّے یہ پیغام بھی تھا کہ اقبال اپنی مصروفیات کی وجہ سے شریک نہ ہونے پر معذرت چاہتے ہیں اور ایک قصیدہ مکمل کر رہے ہیں جسے بہت جلد مخزن میں شائع کر کے نواب صاحب کے حضور پیش کیا جائے گا۔

لاہور واپس پہنچ کر شیخ عبدالقادر نے اقبال کو بتایا کہ حسن نظامی بھی آئے تھے اور وہ بالکل جوان آدمی ہیں۔ اُن کے ہم عمر ہوں گے۔ اقبال کا اندازہ غلط تھا۔[۲۸]

۴۳

قصیدہ شانِ وشکوہ کے امکانات دریافت کرنے کا بہانہ تھا۔ غالب نے زمین پر فخر کرتے ہوئے فرشتوں سے کہا تھا، ''اِس کو کہتے ہیں عالم آرائی!'' اقبال نے زمین کو چشمِ سکندر سے دیکھا اور ثرّیا سے بھی بلند پایا۔ یہ اِس کے لیے ایک ایسے نواب کا قصیدہ بہانہ بنا جو عباسی حکمرانوں کی اولاد میں سے تھا۔ پہلی بار چراغِ لالہ کی اصطلاح استعمال کی جو بعد میں بہت کام آنے والی تھی۔

قصیدے کے دو بند تھے جن میں 'برگِ گل' کی طرح اشعار کی تعداد تبدریج بڑھتی تھی یعنی چوبیس اور پچیس، جن میں سے دوسرے بند میں بادشاہ کو عدل و انصاف کی اہمیت یاد دلاتے ہوئے شہنشاہ اکبر کی یاد دلائی تھی جسے دنیا اچھے نام سے یاد کرتی تھی کیونکہ اُس نے مسجد اور بتخانے کو قریب لا کر ناقوس اور اذان کو ہم آہنگ کر دیا تھا۔ اِس قصیدے کا اختتام 'خیر مقدم' سے بھی زیادہ کھل کر اپنی خودداری اور قابلیت یاد دلانے پر ہوا:

پاک ہے گردِ غرض سے آئینہ اشعار کا
جو **فلک** رفعت میں ہو لایا ہُوں وہ چُن کر زمیں
تھی تو پتھر ہی مگر مدحت سرا کے واسطے
ہو گئی ہے گل کی پتّی سے بھی نازک تر زمیں

یہ خالی خولی دعویٰ نہ تھا بلکہ واقعی قصیدہ ایک مشکل زمین میں کہا گیا تھا۔ نومبر کا مخزن دیر سے آیا مگر 'عشق اور موت' کے ساتھ 'قصیدۂ تہنیت نواب بہاول پور' بھی شامل تھا۔[۳۹]

اُنہی دنوں یہ ہفت روزہ وطن میں بھی شائع ہوا۔[۴۰]

نومبر ہی کے مخزن میں ص ۴۸-۷ پر ایک مضمون ''مقیاس الرُّوح کا تعلق تصوّف کے ساتھ'' کے عنوان سے ایک قلمی نام سے شائع ہوا جس کے بارے میں یہ شبہ گزرتا ہے کہ ممکن ہے اقبال نے لکھا ہو۔ اِس سے پہلے ادارتی نوٹ میں درج تھا، ''حال میں ایک صاحب نے جو جدّت طرازی کے شیدا ہیں۔ ایک مضمون 'مقیاس الروح' کے

عنوان سے اخبار وطـــن لاہور میں شائع کیا تھا اور اس کے نیچے اپنا نام یوں لکھا تھا۔ 'ایک ہستی غیر ذی روح'۔ خلاصہ اس مضمون کا تو یہ تھا کہ اقوامِ فرنگ اہلِ ایشیا کو اپنی مثل انسان نہیں سمجھتیں۔ اور جا بجا نوآبادیوں میں اور اپنے علاقۂ حکومت میں اُن سے ایسا سلوک کرتی ہیں۔ کہ گویا انُمیں ''رُوح'' ہی نہیں۔ یہ بات اس دلچسپ پیرایہ میں بیان کی گئی تھی کہ رنگ یورپ کی جدید تحقیقات کے رُو سے ''مقیاس الروح'' ہے۔ اگر رنگ گورا ہے۔ تو ہستی ''ذی روح'' ہے۔ اور اس کے حقوق کا خیال ضروری ہے۔ اگر رنگ کالا ہے یا سانولا ہے تو غیر ذی روح ہے۔ یہ مضمون بھی اُسی زبردست قلم سے نکلا ہے۔ اس میں ایک تازہ مقدمہ پر جس میں ایک صاحب ایمرسن نامی ملزم تھے اور بری ہو گئے۔ بالکل نئی طرز میں رائے زنی کی گئی ہے۔ ہر چند کہ یہ مضمون بنفسہٖ کسی پولیٹکل اخبار کے اوراق کے لیے زیادہ موزوں ہے اور ایک علمی اور ادبی رسالہ سے بہت مناسبت نہیں رکھتا۔ مگر اس کی طرزِ تحریر اور اس کی دلآویز عبارت اِسے حصۂ ادب میں شامل کرتے ہیں۔ اور اسی نظر سے ہم اِسے یہاں درج کرتے ہیں۔ اور ایسا کرنے کی ہمارے ہاں پہلے بھی نظیر ہے:۔''

اس مضمون میں ایمرسن کے پورے قضیے کی تطبیق ایک حکایت سے کی گئی تھی جس میں کوئی شخص دور دراز کا سفر اختیار کرتا ہے اور پیچھے اُس کی بیوی بے گھر ہو کر دس سال غربت کا مقابلہ کرتی ہے اور ایک بدچلن عورت کے مشوروں کے باوجود راستے سے نہیں بھٹکتی۔ آخر فاقوں پر مجبور ہوتی ہے۔ ''ایسے عالم میں شیطان محلّہ کی اسی بدچلن عورت کی صورت میں ظاہر ہو کر اس کو ترغیب دیتا ہے کہ گناہ کر کے اپنی جان کو اس فاقہ کشی کی عذاب دہ موت سے بچائے اور وہ نصیبوں جلی مجبوراً اس پر راضی ہو جاتی ہے۔

الحذر اُس فقر و ناداری سے سو بار الحذر
جس سے عزّت کو ہے خوف اور جس سے عصمت کو
ڈر ہے''

عورت کا شوہر واپس آ کر اُسے تلاش کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ آخر ایک بزرگ کے آستانے پر حاضر ہوتا ہے تو وہ شرط رکھتے ہیں کہ وہ پہلے کسی چکلے سے ہو کر آئے۔ وہ شخص پہلے بدکتا ہے مگر پھر بزرگ کی ہدایت پر عمل کرتا ہے تو اتفاق سے اُسے وہاں جو عورت ملتی ہے وہ منت سماجت کرنے لگتی ہے کہ غربت سے مجبور ہو کر پہلے دفعہ یہاں آئی ہے اور اب پچھتا رہی ہے۔ وہ شخص گھونگھٹ اُلٹ کر دیکھتا ہے تو اپنی بیوی ہے۔ یوں میاں بیوی اکٹھے ہو جاتے ہیں اور بزرگ کی ہدایت کی مصلحت واضح ہوتی ہے۔

مصنف جس نے اپنا نام ظاہر کرنے کی بجائے ''ہستیِ غیر ذی روح'' کا قلمی نام اختیار کیا تھا طنزاً لکھا تھا کہ ایمرسن کے معاملے میں بھی ایسی ہی مصلحت معلوم ہوتی ہے۔ اُسے انگلستان سے واپس بلوا کر مقدمہ چلانا انصاف کی خاطر نہ تھا بلکہ اُسے اُس کی دلی مراد دلوانے کے لیے تھا۔

''ہستیِ غیر ذی روح'' ایسا قلمی نام ہے جسے اقبال سے منسوب کرنے میں تامل ہو سکتا ہے ورنہ مضمون میں کئی باتیں ہیں جو اسے اقبال کی تحریر سمجھنے پر مائل کرتی ہیں۔ چھتیس برس بعد 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' میں اقبال نے ابلیس کی زبان سے یہ شعر کہلوایا:

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر

حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

اُس نظم میں ابلیس نے کہا کہ صرف امامانِ سیاست ہی نہیں بلکہ کلیسا کے شیوخ بھی اُس کے زیرِ اثر ہیں۔ مضمون میں بھی انصاف کے ہندوستانی مطالبے کے حوالے سے درج تھا، ''ایک بڑے جغادری لاٹ پادری کی روح نے جس کو روحوں کی اصطباغ و تطہیر اور ہدایت و تلقین کے مشاغل کی وجہ سے عدم میں بھی چین سے لیٹنے کی فرصت نہ تھی۔ مدراس گورنمنٹ کے گوشِ نصیحت نیوش تک یہ پیغام پہونچا دیا کہ جو کالی ہستی شور و غوغا مچا رہی ہے اُس کو دم دلاسہ دینے کا انتظام کیا جائے۔ لیکن طرزِ عمل وہی ملحوظ رہے جو شیکسپیر کی چڑیلوں نے میکبتھ کے متعلق اختیار کیا تھا۔''

اِسی شمارے کے ص ۴۶-۴۴ پر نادر علی خاں نادر (کاکوروی) نے اپنی نظم 'ریفارمیشن' اقبال کے نام معنون کی تھی اور اختتامیہ بند میں لکھا تھا:

منتظر ہوں میں امامِ آخرالایام کا
خیر مقدم از سرِ نو دعوتِ اسلام کا
حسرتِ وا دیدِ اعجازِ مسیحا ہے مجھے
انتظارِ آمدِ مہدی و عیسیٰ ہے مجھے
اے نویدِ وصلِ انصار و نصاریٰ السّلام
السّلام اے صبحِ شامِ خیر بطحیٰ السّلام

۴۴

ابھی تک اقبال کی شاعری میں جس فعل کا سب سے زیادہ ذکر ہوا وہ ''دیکھنا'' تھا۔ اب وہ ''دکھانے'' کا ذکر کرنے لگے۔ اُن کی نظم 'شاعر' کا صحیح زمانہ معلوم نہیں مگر اندازاً اِسی دَور کی ہے۔ اِس کے مطابق شاعر 'دیدۂ بینائے قوم' ہوتا ہے:

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

قومی شناخت سے اپنے آپ کو پہچاننا اور ''قومی بھلائی'' کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا اُس تہذیب کا حصہ بن چکا تھا۔ اس زمانے تک اقبال کی ملّی شناخت بھی پُختہ ہو چکی تھی۔ عیسائی مبلّغوں کا تدارک کرنے کی تجویز ہو یا کشمیری مسلمانوں کی تنظیم کی کوشش اُن کا قلم اور اُن کی آواز ضرور شامل ہوتی تھی۔

۴۵

ہم نے اقبال کو بہت ڈھونڈا
کوئی اِس نام کا نہیں ملتا[۴۱]

بھاٹی دروازے کا اقبال اِس لحاظ سے ایک معمہ ہے کہ اجتماعی سطح پر جس قوم اور جس معاشرے کی بقا چاہتا ہے انفرادی سطح پر اُس کی اخلاقیات کا مذاق اُڑانے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ اس الجھن کو پہلے پہل جس شخص نے محسوس کیا وہ پڑوس میں رہنے والے ایک مولوی صاحب تھے جنہیں تصوف سے بھی لگاؤ تھا۔[۴۲] کسی شناسا سے اقبال کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ متضاد خصوصیات کے حامل ہیں اور کہیں کسی نئے اسلام کی بنیاد نہ ڈال بیٹھیں۔ مولوی صاحب کی بات اقبال تک پہنچی تو اُنہوں نے خوب لطف لیا اور ایک روز سرِ راہ ملے تو یہ ذکر چھیڑ دیا۔ ان دونوں میں جو گفتگو ہوئی وہ معلوم نہیں مگر پورے واقعے کو نظم کرتے ہوئے اقبال نے اُس گفتگو کا جو خلاصہ دیا وہ بڑی حد تک اصل سے قریب رہا ہوگا:

فرمایا شکایت وہ محبت کے سبب تھی
تھا فرض مرا راہ شریعت کی دکھانی
مَیں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے
یہ آپ کا حق تھا زرہِ قُربِ مکانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اُس کی جُدائی میں بہت اشک فشانی
اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے[۴۳]

تیس اشعار کی ترکیب بند تھی اور عنوان 'زُہد اور رِندی' تھا۔ اُنہی دنوں امریکی شاعر لانگ فیلو کی نظم 'Daybreak' نے فنا اور بقا کے مسئلے کو دوبارہ نظم میں لانے کا موقعہ دیا۔ وہ بھی ترکیب بند ہوئی جس میں بارہ شعر تھے اور عنوان 'پیامِ صبح' تھا۔[۴۴]

دسمبر میں 'پیامِ صبح' فتنہ و عطر فتنہ میں اور 'زہد اور رندی' مخزن میں شائع ہوئیں۔ نیرنگ اور اعجاز ستمبر کی چھٹیوں میں شملہ گئے تھے۔ نیرنگ کی تاثراتی

نظم 'کوہستان کا نظارہ' اور اعجاز کی نظم 'ابرِ کہسار' ص ۴۶-۴۳ پر شائع ہوئیں۔ اعجاز کی نظم کا پہلا شعر تھا:

لو گھٹا چھا گئی پہاڑوں پر
لو بہار آ گئی بہاروں پر

۴۶

''عقل کی انتہا کیا ہے؟''

''حیرت،'' اقبال نے جواب دیا۔

''اور عشق کی انتہا کیا ہے؟''

''عشق کی کوئی انتہا نہیں۔ عشق لاانتہا ہے!''

''پھر آپ نے یہ کیا لکھا ہے: ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں!''

''دُوسرا مصرع بھی تو پڑھیے...''[۴۵]

غزل

ترے عِشق کی انتہا چاہتا ہُوں
مری سادگی دیکھ، کیا چاہتا ہُوں

سِتم ہو، کہ ہو وعدہ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہوں

چلو، مِل کے اقبال کے گھر کو ڈھونڈیں
کہ مَیں بھی اُسے دیکھنا چاہتا ہوں

اِس غزل کے پندرہ اشعار دستیاب ہیں۔[۴۶]

۴۷

کوئی عبدالغفور خاں تھے جن کی فرمائش پر اقبال نے کسی ڈانک کا ترجمہ تین اشعار میں کیا:

نیکی ہو ہر اِک فعل میں نیت کی ہویدا
ہر حال میں ہو خالقِ ہستی پہ بھروسا

۴۸

سر سیّد کہہ گئے تھے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلافات دن بدن نمایاں ہوتے جائیں گے اور جو زندہ رہے گا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ اقبال زندہ تھے اور دیکھ رہے تھے۔ اختلافات نقطۂ عروج پر دسمبر ۱۹۰۳ء میں انگریز حکمرانوں کے اس اعلان کے ساتھ پہنچے کہ ہندو اکثریت کا صوبہ بنگال تقسیم کیا جائے گا۔

بنگال میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ تقسیم کا مطلب یہ تھا کہ اس صوبے کے دو حصے ہوتے جن میں مغربی بنگال میں بدستور ہندوؤں کی اکثریت رہتی اور برطانوی ہندوستان کا دارالحکومت کلکتہ بھی اسی صوبے میں رہتا مگر ایک مشرقی بنگال بھی وجود میں آ جاتا جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی اور اُس کا صدر مقام ڈھاکہ ہوتا۔

احتجاج شروع ہوا۔ کانگریس اور انتہا پسند اکٹھے ہو گئے۔ مشرقی بنگال میں بھی جلسے کروائے گئے اور تقسیم کے خلاف پمفلٹوں کی ہزاروں کاپیاں بانٹی گئیں۔ مسلمان بے چین ہوئے اور سوچنے پر مجبور ہوئے، ''کیا ہندوستان ہمارا وطن نہیں ہے؟''

دُوسرا حصہ

۴۹

جنوری ۱۹۰۴ء کے مخزن میں ''ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں'' والی غزل اور ترجمۂ

ڈانک' شائع ہوا۔[47]

۵۰

غالباً سردیوں کی چھٹیوں میں اقبال سیالکوٹ آئے تھے۔ عطا محمد کے یہاں ایک اور لڑکا پیدا ہو چکا تھا جس کا نام امتیاز رکھا گیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر اقبال نے چھینا، وہ چلّایا اور انہوں نے ایک نظم لکھی جس میں بچے سے کہا تھا کہ وہ ان کی مہربانی کو نامہربانی سمجھ رہا ہے مگر ایسی بھول ان سے بھی ہوتی رہتی ہے:

میری آنکھوں کو لبھا لیتا ہے حسنِ ظاہری
کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی میری

ترکیب بند تھی۔ کل بیس اشعار تھے۔ عنوان 'طفلِ شیر خوار' تھا۔[48]

۵۱

فروری میں اُردوئے معلی میں اقبال کے مضمون کے جواب میں تنقید ہمدرد کا 'اصلاحِ زبانِ پنجاب' چھپا۔ دلائل تسلیم نہیں کیے گئے تھے۔[49]

اس مہینے مخزن میں 'طفلِ شیر خوار' شائع ہوئی اور ص ۵۵-۵۴ پر کسی شاعر رضا کی ایک غزل جو اقبال کی 'عرقِ انفعال کے'' والی غزل کی زمین میں تھی:

اقبآل بیمثال عجب چیز ہے رضا
دھو دھو کے پاؤں پیــــــــــــــــــــجیـــــــــــــــــــو اس باکمال کے

۵۲

مغربی ادب سے اُنیسویں صدی کے شروع کی رومانویت اور اواخر کا انحطاط لے کر اُس بنگالی ادب کا خمیر تیار ہوا جس میں ہندوستان کو انگلستان اور فرانس کی طرز پر ایک ریاست سمجھا گیا تھا۔

مغربی تہذیب میں امریکہ ایک ایسا عنصر تھا جو روایات کے پھندوں سے آزاد تھا اور اسے اقبال نے اُس وقت دریافت کیا تھا جب بنگال کے کولمبس بحرِ ظلمات کے پار نہیں پہنچے تھے۔ ایمرسن کی نظم سے ماخوذ 'ایک پہاڑ اور گلہری' غالباً اقبال پہلے ہی لکھ چکے تھے مگر اب امریکی صوفی کی ایک اور نظم نے اُن کی توجہ کھینچی۔ 'گڈبائے' میں ایمرسن نے دنیا کو خدا حافظ کہہ کر عدم کی طرف سفر کرنے کی بجائے فطرت کی طرف رجوع کیا تھا اور اُس کے لیے فطرت غفلت اور فرار کی بجائے آگہی کا ذریعہ بن گئی تھی۔

'رخصت اے بزمِ جہاں' ستائیس اشعار کی نظم تھی۔ اِس کی ہیئت مثنوی کی تھی۔ پہلے بند میں بارہ، دوسرے میں چھ اور تیسرے میں نو شعر تھے:

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اُس کی نمود
گُل کی پتّی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بُود

یہ بنگالی ادب اور اُس سے پیدا ہونے والے تصورات پر بڑی لطیف تنقید تھی۔ فروری میں دکن ریویو میں شائع ہوئی۔ شیخ عبدالقادر نے مخزن کے لیے کوئی نظم طلب کی تو اقبال نے کچھ ترمیم کے ساتھ یہی نظم دے دی جسے اِس ادارتی نوٹ کے ساتھ مخزن کے ص ۴۴-۴۲ کے لیے کتابت کروالیا گیا: ''شیخ محمد اقبال صاحب انجمن حمایت اسلام لاہور کے عظیم الشان جلسے کے لیے نظم لکھنے میں بیحد مصروف تھے۔ جب اس رسالہ کی ترتیب کا وقت آپہنچا۔ اس لئے کوئی چیز خاص اس مخزن کے لئے نہیں لکھی جاسکی۔ انہیں دنوں میں انکی ایک دلپذیر نظم دکن ریویو میں چھپی ہے۔ اس کو بعض ضروری ترمیموں کے ساتھ وہ ہمیں بغرضِ اشاعت عنایت کرتے ہیں۔ اکثر حضرات کے لئے بھی یہ نئی چیز ہوگی:-''

عرصہ تقریر تنگ ہونا موجبِ پریشانی نہ رہا بلکہ خاموشی گفتگو بن گئی۔ شراب مینا بن گئی۔ چمن والے مل کر اقبال کی طرزِ فغاں لُوٹ رہے تھے تو اُن کی داستاں کو ہر طرف

بکھرنا ہی تھا۔ بنگال کے ہندو ادب اور مولوی صاحب کی نیکی ماضی کی طرف دیکھتی تھیں مگر صوفیوں نے ہمیشہ مستقبل سے آگاہی کا دعویٰ کیا تھا۔ یوسفِ یثربؐ کے جمال کو اپنے دل کے آئینے میں دیکھنے والے کو حضرت عیسیٰ کی واپسی کا انکار کرنا زیبا نہ دیتا تھا جبکہ وہ قید خانے میں اپنے ساتھیوں کے خواب کی تعبیر دے سکتا ہو۔ عشقِ رسولؐ جس علم کا سرچشمہ تھا وہ صرف ماضی اور حال تک محدود نہ تھا:

سنے ہیں اہلِ محفل نے فسانے حال و ماضی کے
مرے نالوں میں استقبال کی تفسیر ہوتی ہے

نظم کا عنوان 'تصویرِ درد' تھا۔ انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس کے لیے لکھی۔ ترکیب بند تھی۔ ۱۲۸ اشعر تھے۔ دس بند تھے جن کی طوالت یکساں نہ تھی۔ اس نظم کے لیے یہی مناسب تھا۔

تصویرِ درد

(بند)

عطا ایسا بیاں مجھ کو ہُوا رنگیں بیانوں میں
کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہم زبانوں میں
اثر یہ بھی ہے اِک میرے جنونِ فتنہ ساماں کا
مرا آئینۂ دل ہے قضا کے رازدانوں میں
رُلاتا ہے ترا نظّارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دِیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
ہوائے امتیازِ ملّت و آئیں کی موجوں نے
غضب کا تفرقہ ڈالا ترے خرمن کے دانوں میں

نشانِ برگِ گُل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گل
چیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
جہاں خوں ہو رہا ہے کارزارِ زندگانی سے
مئے غفلت کے ساغر چل رہے ہیں نوجوانوں
میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
سن اے غافل! صدا میری یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک؟ لذّتِ تقریر پیدا کر
زمیں پر تُو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
تغیر اس طرح کا محفلِ ہستی میں آیا ہے
کہ ہے چُپ بیٹھ رہنا بھی تباہی کے نشانوں میں
مزہ دیتا نہیں کچھ صورتِ گل صدزباں ہونا
زباں جب ایک بھی گویا نہ ہو اتنی زبانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ہوا پیکار کی آخر اُجاڑے گی گلستاں کو
خدا رکھے یہ ہے اپنے پرانے مہربانوں میں
قیامت ہے کہ ہر ذرّے سے پیدا سو مصیبت ہے
زمیں بھی اپنی شائد جا ملی ہے آسمانوں میں
اُڑا لے جائے گی موجِ ہوائے نیستی ان کو
نہ ہو جب راہ پیائی کی طاقت ناتوانوں میں
رُلایا خوں مری آنکھوں کو تیرے خوابِ غفلت نے
مری تقدیر میں لکھا تھا رونا کلکِ قدرت نے[۵۱]

۵۴

پروفیسر آرنلڈ انگلستان واپس جا رہے تھے۔ فروری میں گورنمنٹ کالج میں الوداعی جلسہ ہوا۔ کئی طلبہ نے اپنی نظمیں پڑھیں۔ ''یہ نظم اُس وقت لکھی بھی جا چکی تھی،'' اقبال نے بعد میں اپنی الوداعی نظم کے بارے میں کہا۔ ''تاہم اِس خیال سے کہ اِس میں میرے ذاتی تاثرات کا ایک دردانگیز اظہار تھا کسی عام جلسے میں اِس کا پڑھنا مناسب نہ سمجھا گیا۔''[۵۲]

جاتے جاتے آرنلڈ دو اچھی باتیں اُن کے کان میں ڈال گئے۔ پہلی یہ کہ اُن کے لیے گورنمنٹ کالج کے شعبۂ فلسفہ میں مستقل ملازمت کی بات ہو گئی ہے۔[۵۳] دوسری یہ کہ اقبال انگلستان چلے آئیں اور وہاں تعلیم حاصل کریں۔ ۲۶ فروری کو وہ رخصت ہو گئے۔

۵۵

کچھ عرصے سے نظموں میں اُداسی در آئی تھی۔ اُن دنوں کی نظموں کا مزاج پچھلے برس

سے بہت مختلف تھا جب ایک سرشاری کی کیفیت میں نظمیں لکھی تھیں۔ اُداسی کی وجہ کچھ بھی رہی ہو مگر یہ معلوم ہے کہ ایک مرحلے پر امیر بیگم کی والدہ نے اُن کی اقبال سے ملاقات پر پابندی عائد کر دی تھی۔[54] ۱۹۰۴ء کا سال پچھلے برس سے مختلف ثابت ہوا۔

''اُستاذی قبلہ آرنلڈ کے ولایت تشریف لے جانے کے بعد اُن کی جدائی نے اقبال کے دل پر کچھ ایسا اثر کیا کہ کئی دن تک سکوتِ قلبی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا،'' اقبال کا بیان ہے۔[54]

۵۶

مارچ کی آخری تاریخ سے پہلے ہی اقبال کو گورنمنٹ کالج میں تقرری کا پروانہ مل گیا اور انہوں نے اورینٹل کالج میں استعفیٰ دے دیا۔[55]

۵۷

انجمن حمایتِ اسلام کا اجلاس تین روزہ تھا۔ یکم اپریل کو پہلا دن تھا۔[56]

اِس دفعہ لوگ پہلے سے زیادہ تعداد میں آئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ مولانا الطاف حسین حالی بھی تشریف لائے تھے۔ اُن سے پہلے اقبال کو اپنی نظم سنانی تھی اور اُن سے پہلے مولوی احمد دین عُرف الف دین کو تقریر کرنی تھی۔ تقریر طویل ہو گئی تو مجمع میں بے چینی پھیلی اور آوازیں آنا شروع ہوئیں، ''الف دین' بے دین ہو گیا!'' کوئی اور وقت ہوتا تو اقبال اس فقرے سے محظوظ ہوتے مگر اس موقع پر انہیں غُصہ آیا۔ شاعر سے کالج کے اُستاد بن گئے اور مجمع کو ڈانٹا، ''اگر آپ لوگ خاموشی سے تقریر نہیں سنیں گے تو میں نظم بھی نہیں سناؤں گا۔''

خدا خدا کر کے اُن کی باری آئی۔ اُنہوں نے شلوار قمیص اور چاندنی جوتے پہنے ہوئے تھے۔ گریبان کا بٹن کھلا تھا۔ چہرے پر ناک پکڑ عینک لگی تھی۔[57] انہوں نے ترنّم سے 'تصویرِ درد' پڑھنا شروع کی اور اُس کی کاپیاں دھڑا دھڑ بکنے لگیں۔ ایک شعر حالی

نے بھی دس روپے میں خریدا۔ خواجہ حسن نظامی کو شائد حال آ گیا۔ اپنا عمامہ اقبال کے سر پر رکھ دیا جسے عبدالقادر نے بہت کہہ سن کر واپس کیا۔[۵۸]

اقبال کے بعد حالی کھڑے ہُوئے۔ وہ آواز جس نے پہلی بار مسدس سنائی تھی اب نحیف تھی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا نظم گھر بھول آئے ہیں۔ ارشد گورگانی نے آگے بڑھ کر اعلان کیا:

سنتے ہیں کہ اس بزم میں حالی آئے
سننے کو ہیں حالی و موالی آئے
کیا شوق ہے کیا خوف ہے کیا گھبراہٹ
بھول آئے ہیں نظم، گھر سے خالی آئے

معلوم ہوتا ہے اسی جلسے میں عبدالقادر نے اقبال سے کہا کہ وہ کوئی ایسی نظم کیوں نہیں لکھ دیتے جسے ہندوستان میں قومی نغمے کے طور پر گایا جا سکے۔[۵۹]

اگلے روز مولانا حالی نظم ساتھ لائے، 'مادرِ پنجاب انجمن' مگر آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ پیچھے بیٹھے ہوؤں نے کہا، ''آواز نہیں آ رہی۔ اقبال سے پڑھوایئے۔'' ایک بار نظم سُنا چکے تو اقبال کو حکم ہوا کہ اپنی گونج دار آواز میں اُسے دُہرائیں۔[۶۰] انہوں نے نظم سنانے سے پہلے فی البدیہہ رباعی پڑھی:

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالی
معمور مئے حق سے ہے جامِ حالی
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا
نازل ہے مرے لب پہ کلامِ حالی[۶۱]

مخزن کا مارچ کا شمارہ کسی وجہ سے اب تک شائع نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے آخر میں اضافی صفحات لگا کر تصویرِ درد اس ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع کی گئی: ''یہ وہ دلپذیر نظم ہے جو انجمن حمایت اسلام کے انیسویں سالانہ جلسہ میں شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے

نے پڑھی جسکی طرف اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے۔ حالانکہ رسالہ پورا تیار ہو چکا ہے۔ ہم زائد صفحے اسکی خاطر لگا دیتے ہیں۔ تا کہ ناظرین جلد اس سے محظوظ ہوسکیں اور انکو ماہ آیندہ تک انتظار نہ کرنا پڑے۔''

تیسرا حصہ

۵۸

اپریل میں علم الاقتصاد کا ایک حصہ مخزن میں اس ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا: ''شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے نے حال میں ایک کتاب پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ایما سے علم الاقتصاد پر لکھی ہے۔ جس کا انگریزی نام ''پولیٹکل اکانمی'' ہے اور جسے عموماً ''علم سیاستِ مدن'' کہتے ہیں۔ بلا مبالغہ اس فن میں ایسی جامع اور عام فہم کتاب اردو زبان میں آج تک نہیں لکھی گئی۔ ہندوستان میں اس علم کا ابھی بہت کم چرچا ہے۔ حالانکہ اسے بغور پڑھنے کی ہندوستان کو نہائت ہی ضرورت ہے۔ جب یہ کتاب شائع ہوگی تو ہمیں کامل امید ہے کہ شیخصاحب کی شہرت اور اُس کی ذاتی خوبی مقبولیت کو اس کے استقبال کے لئے اُڑا کر لائیگی۔ اور علاوہ عام قدردانی کے خاص جماعتیں اِسے خریدینگی۔ ٹکسٹ بک کمیٹی نے اسے پسند کیا ہے اور ایک سو جلدیں خریدنا منظور فرمایا ہے۔ ہم قابل مصنف کی اجازت سے اسکا ایک دلچسپ حصہ نقل کرتے ہیں۔ کتاب زیرِ طبع ہے:۔''

منتخب حصے کا عنوان تھا 'آبادی'۔[۱۲] اقبال نے لکھا تھا، ''افلاس اور دیگر برائیوں کا اصل منبع آبادی کا حد سے زیادہ بڑھ جانا ہے۔۔۔ جس ملک میں آبادی بلاقید بڑھ رہی ہو، وہاں کے لوگوں کو چاہئیے کہ انجام بینی سے کام لیں اور ان وسائل کو استعمال کریں، جو آبادی کی ترقی کو روکتے ہیں۔''

اقبال نے یہ کتاب مسٹر اسکوٹر کے نام منسوب کی تھی جو محکمہ تعلیم پنجاب کے ڈائریکٹر

تھے۔ پوری کتاب اسی سال شائع ہوئی مگر اس کی درست تاریخ معلوم نہیں۔[۱۳]

''ذرا خیال کرو کہ غریبی... سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قوی انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے... اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ... کیا یہ ممکن نہیں ہے ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لیے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے؟''

۵۹

مثنوی کی ہیئت میں سترہ شعر کی نظم ہوئی جس کے اقبال نے دو بند بنائے۔ پہلے میں سات اور دوسرے میں دس شعر تھے۔ سورج کی کشتی کا ایک ٹکڑا دریائے نیل کی سطح پر تیرتا پھرتا تھا، پھر چاند نکلتا تھا اور اقبال اُسے مخاطب کر کے بہت سی باتیں کرتے تھے جن میں یہ بھی شامل تھی:

قافلہ تیرا رواں بے منّتِ بانگِ درا
گوشِ انساں سن نہیں سکتا تری آوازِ پا

نظم کا عنوان 'ماہِ نو' تھا۔[۱۴]

۶۰

شیخ عبدالقادر نے اقبال کو بتایا کہ وہ بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے انگلستان جا رہے ہیں۔

اقبال کے دل میں آرنلڈ کے جانے کی اُداسی بڑھ گئی ہوگی۔ ''ایک روز تخیل نے اُن کے مکان کے سامنے لا کے کھڑا کر دیا اور یہ چند اشعار بے اختیار زبان آ گئے،'' اُن کا بیان ہے۔ الوداعی نظم میں بہت سی تبدیلی ہوگئی۔ آٹھ بند کی مسدس ہوئی جسے مخزن

میں اشاعت کے لیے دے دیا:

کھول دے گا دشتِ وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو
دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو
کیا تسلّی ہو مگر گرویدۂ تقریر کو

"تابِ گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جو کو ہے سخن تصویر کا"[15]

تصویر کے دہن والا شعر امیرؔ مینائی کا تھا۔ اقبال نے عبدالقادر سے کہا کہ وہ بھی بڑے بھائی کو خط لکھ کر اخراجات کا بندوبست کروانے کے لیے کہیں گے۔[16]

مئی میں عبدالقادر روانہ ہوگئے۔ اُس ماہ مخزن میں نالۂ فراق اقبال کے تمہیدی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی۔ ص ۵۸-۵۶ پر بدرالدین قیصری (لاہور) کی نظم 'اقبال' شائع ہوئی جس کے بارے میں شاعر نے لکھا تھا، "یہ نظم میں نے اپنے ارادے سے نہیں لکھی بلکہ اقبال کی زبردست سخنوری نے جبراً مجھ سے لکھوائی ہے۔ گویا یہ خراج ہے جو انکی شاعری نے میری شاعری سے لیا ہے۔ ہرچند حضرت اقبال سلمہ تعالےٰ بطور شاعر کے کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ مگر میرے خیال میں انکی شاعری کا پایہ انکی شہرت سے بلند تر ہے:- قیصری"

چار اشعار کی فارسی غزل بطور تمہید درج تھی اور اس کے بعد مسدس کے چھ بند تھے۔

دوسرا بند یہ تھا:

بلبلِ پنجاب تُو پنجاب ہے گلشن ترا
پُر ہے نو گلہائے مضموں سے سدا دامن ترا
جسکا دانہ دانہ خرمن ہے وہ ہے خرمن ترا
دوسروں کے سو تصنع ایک سادہ پن ترا

نقشِ تصویرِ مضامیں کے لیے مانی ہے تُو
خطۂ ہندوستاں میں غالبؔ ثانی ہے تُو

اسی مہینے خدنگِ نظر نے 'ماہِ نَو' چھاپی۔

۶۱

کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے
جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے

اِس غزل کے چودہ شعر دستیاب ہیں۔ جون کے مخزن میں شائع ہوئی۔[۱۷]

۶۲

کچھ ہفتے پہلے دریائے نیل پر طلوع ہونے والے ہلال کی روشنی پر رشک کیا تھا۔ اب ماہِ کامل کو مخاطب کر کے کہا:

جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے

یہ بھی مثنوی کی ہیئت میں تھی اور اِس میں سترہ شعر تھے۔ دو بند تھے۔ اِس کا عنوان 'چاند' تھا اور یہ جولائی میں مخزن میں شائع ہوئی۔[۱۸]

وہ مقصد کیا تھا جو اقبال کو معلوم ہو گیا تھا؟

۶۳

عطا محمد اُن دنوں ایبٹ آباد میں تعینات تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں اقبال ان کے پاس چلے گئے اور بیمار پڑ گئے۔[۱۹] غالباً اِسی کیفیت میں ایک روز اُس جگہ بیٹھے تھے جہاں اب میونسپل باغ ہے۔ عین سامنے پہاڑ سربن کی چوٹی تھی۔ مشرق کی جانب سے گھٹا آئی اور پہاڑ اُس میں چھپ گیا۔ اِن کی طبیعت رواں ہو گئی۔

اُٹھی پھر آج وہ پُورب سے کالی کالی گھٹا
سیاہ پوش ہُوا پھر پہاڑ سربن کا

مثنوی کی ہیئت میں سولہ اشعار کی نظم ہوئی۔ اس کا عنوان 'ابر' رکھا۔ ۲۰

۶۴

ایبٹ آباد میں لیکچر کی فرمائش کی گئی۔ اقبال نے 'قومی زندگی' کے عنوان سے ایک لیکچر دیا۔ ''قوم'' سے مراد ہندوستان کی مسلمان قوم تھی۔ دُنیا کی مختلف قوموں کا تجزیہ کیا کہ وہ کس طرح کے حالات سے دوچار ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ نئے دور کے لحاظ سے اسلامی قانون کی نئی تدوین کی طرف توجہ کریں۔ ''اگرچہ شیعہ مفسّروں نے (فقہ کے) بعض اصول کی تشریح میں ایک حیرت ناک وسعتِ نظر سے کام لیا ہے تاہم جہاں تک میرا علم ہے شریعتِ اسلامی کی جو توضیع جناب ابوحنیفہؒ نے کی ہے ویسی کسی اسلامی مفسّر نے آج تک نہیں کی۔ ہمیں اس وقت ایک بہت بڑے فقیہ کی ضرورت ہے اور اگر اس کام کی اہمیت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام شاید ایک سے زیادہ دماغوں کا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے کم از کم ایک صدی کی ضرورت ہے۔''۲۱

۶۵

ہندوستان اور پوری دنیا میں ایک اور اہم سوال جو شاید انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس شدت کے ساتھ سامنے آ رہا تھا وہ تھا معاشرے میں عورتوں کے مقام کا سوال۔

ابھی پچھلے برس ایک خاتون سائنسداں مادام کیوری نے نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔ اور اسی برس انگلستان کی انقلابی رہنما ایمیلیا نے عورتوں کے لیے ووٹ کا حق حاصل کرنے کی جدّ وجہد میں بعض عملی اقدامات اُٹھانے کا عزم ظاہر کیا تھا۔ ہندوستان میں بہت عرصہ سے پردے کے مسئلے پر بحث ہو رہی تھی۔ اس بحث میں ایک اہم آواز مولوی

ممتاز علی کی تھی جنہوں نے بڑی مخالفت کا سامنا کر کے لاہور سے پرچہ تہذیبِ نسواں نکالا تھا۔

دُوسری اہم آواز لکھنؤ کے ایک بانکی طبیعت رکھنے والے ادیب کی تھی۔ ان کا نام عبدالحلیم شرر تھا۔ شبلی کے دوست تھے۔ شبلی ہی کی طرح انگریزی، فرانسیسی اور اسلامی تاریخ کا ذوق رکھتے تھے۔ مگر تحقیق کی بجائے ناول کو اپنا میدان بنایا تھا۔ صحافی بھی تھے اور بہت سے رسالے، پرچے وغیرہ نکالتے رہتے تھے۔ ایک رسالے میں پردے کی مخالفت میں لکھ دیا کہ پردہ تو نگاہ اور ذہن کا پردہ ہوتا ہے نہ کہ گھر کی چاردیواری میں عمر قید! اس پر ایک بزرگ دوست اکبر حسین الہ آباد سے ٹکٹ کٹوا کر ان کے گھر جا دھمکے اور سیدھے زنانے میں گھستے چلے گئے۔ عورتوں نے شور مچا کر شرر کو بلایا تو اکبر الہ آبادی کہنے لگے۔ ”جب آپ اپنے گھر میں اِس اصُول پر عمل نہیں کر سکتے تو لکھتے کیوں ہیں؟“

الہ آباد واپس پہنچ کر انہوں نے شرر کو لکھ بھیجا:

اُٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کون سا حق
بے پکارے جو مِرے گھر میں چلا آتا ہے
بے حجابی مری ہمسائے کی خاطر سے نہیں
صرف حُکام سے ملنے میں مزا آتا ہے

اقبال کے خیال میں عورتوں اور مردوں کے میدان الگ الگ تھے۔[۴۲] پردے کے بارے میں ان کا خیال تھا: ”بعض مسلمان جو مغربی تہذیب سے بہت متاثر ہوئے ہیں اس دستور کے مخالف ہیں اور اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں اور حال کے دیگر اسلامی ممالک میں پردے کی یہ صورت نہیں تھی جو آج کل ہندوستان میں ہے۔ لیکن... چونکہ اقوامِ ہندوستان نے اخلاقی لحاظ سے کچھ بہت ترقی

نہیں کی، اس واسطے اس دستور کو یک قلم موقوف کر دینا میری رائے میں قوم کے لیے نہایت مضر ہو گا۔ ہاں اگر قوم کی اخلاقی حالت ویسی ہو جائے جیسی کہ ابتدائے زمانہ اسلام میں تھی تو اس کے زور کو کم کیا جا سکتا ہے اور قوم کی عورتوں کو آزادی کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنے کی عام اجازت ہو سکتی ہے۔

''ان تمام اصلاحوں کے علاوہ شادی کی بعض قبیح رسوم توجہ کی محتاج ہیں۔ نارضامندی کی شادیاں مسلمانوں میں عام ہو رہی ہیں جن کی وجہ سے ۹۹ فی صد اسلامی گھروں میں اس بات کا رونا رہتا ہے کہ میاں بیوی کی آپس میں نہیں بنتی۔ منگنی کا دستور نہایت مفید ہو سکتا ہے بشرطیکہ شادی سے پہلے میاں بیوی کو اپنے بزرگوں کے سامنے ملنے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کی عادات اور مزاج کا مطالعہ کر سکیں اور اگر ان کے مذاق قدرتاً مختلف واقع ہوئے ہیں تو منگنی کا معاہدہ فریقین کی خواہش سے ٹوٹ سکے۔ لیکن افسوس ہے کہ موجودہ دستور کے مطابق فانکحو اما طالب لکم من النسأ پر پورا عمل نہیں ہو سکتا۔ لڑکا خواہ منگنی سے پہلے اپنے سسرال کے گھر میں جاتا ہی ہو، منگنی کے بعد تو اُس کو اس گھر سے ایسی پرہیز کرنی ہوتی ہے جیسے ایک متقی کو مے خانے سے۔ افغانوں میں منگنی کے بعد میاں بیوی کو آپس میں ملنے کی عام اجازت ہوتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ مغلیہ دستور اسلامی نہیں بلکہ اسرائیلی ہے... تاہم اگر اس کی اصلاح کر دی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ دستور مفید ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں مغربی 'کورٹ شپ' کی تمام خوبیاں موجود ہیں اور اس کے نقائص معدوم۔''[۴۳]

۶۷

لالہ ہردیال نوجوان تھے اور وطن کی محبت میں بہت آگے۔ اُنہیں افسوس تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اُن کے صوبے پنجاب نے عام طور پر انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ چنانچہ خود اس کی تلافی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک روز ینگ مینز کرسچین اسوسی ایشن کے سیکرٹری سے اُلجھ پڑے۔ یوں تو اُس ایسوسی ایشن میں ہندوستانی بھی

شامل تھے مگر بہت سے انگریز ہندوستانیوں سے میل جول کو اپنے لیے توہین کا باعث سمجھتے تھے۔ وائسرائے اور گورنر کی کونسلوں میں ہندوستانیوں کا گزر ہونے لگا تھا مگر نسلی امتیاز میں فرق نہیں آیا تھا۔

ہردیال کسی نسلی امتیاز کی بات ہی پر سکرٹری سے اُلجھے تھے چنانچہ رُکنیت سے استعفیٰ دیا اور مقابلے پر ینگ منز انڈین ایسوی ایشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاید اُسی شام چھ بجے اس کا افتتاحی اجلاس بھی رکھ دیا۔

کوئی دوپہر کے تین بجے ہوں گے جب اقبال سے درخواست کی گئی کہ وہ اجلاس کی صدارت کریں۔ مقررہ وقت پر وہ آئے تو جلسہ اُن کا منتظر تھا۔ انہوں نے تقریر کرنے کی بجائے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ترنم سے ایک نظم پڑھنا شروع کی۔ یوں محسوس ہوا جیسے ہندوستان کے پرندے یک زبان ہو کر سوداگر کو جواب دے رہے ہوں۔[۲۴]

ہمارا دیس

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دِل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اُس کے ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آبِ رُودِ گنگا! وہ دن ہے یاد تجھ کو
اُترا ترے کِنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بَیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یُونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں سے ہے آسماں نامہرباں ہمارا
اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم ہے ہمیں کو دردِ نہاں ہمارا!۵؎

جلسہ کے اختتام پر ہر شخص اسے دوبارہ سُننے پر مصر تھا۔ چنانچہ ایک بار پھر اقبال نے اپنے خاص سُروں میں یہ گیت چھیڑا۔ ایک طالب علم محمد عمر نے نظم سن کر لکھ لی اور عبدالحلیم شرر کو لکھنؤ بھیج دی جنہوں نے اپریل سے ایک نیا پرچہ اتحاد نکالنا شروع کیا تھا۔۶؎

۱۰ اگست کو اقبال نے یہ نظم اپنے ہاتھ سے کہیں لکھی۔۷؎

چھ دن بعد عنوان کے بغیر اور کچھ غلطیوں کے ساتھ اتحاد میں شائع ہوگئی۔ شرر نے جلسے کا ذکر کرکے نظم کی کیفیت بیان کی تھی اور پھر لکھا تھا، ''اِس نظم سے چونکہ اتحاد کو اپنے مشن میں مدد ملی ہے لہٰذا ہم اپنے پرانے دوست مولوی محمد اقبال صاحب کا شکریہ ادا کر کے درجِ اتحاد کرتے ہیں۔''۸؎

اُسی مہینے رسالہ دلگداز میں حسرت موہانی کے رسالے کی تعریف اور اقبال کی نظم پر تنقید شائع ہوئی: ''۱۶ اگست کے اتحاد میں ہمارے قدیم دوست محمد اقبال صاحب کی ایک مختصر نظم چھپی ہے جو ہندو مسلمان کے اتفاق پر ہے۔ اِس کے آخری دو شعروں میں ردیف بگڑ گئی ہے۔

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری

صدیوں سے آسماں ہے نامہرباں ہمارا

''اِس میں ہمارا کی جگہ 'ہم پر' یا 'ہمارے حال پر' چاہیے۔

اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم ہے ہمیں کو دردِ نہاں ہمارا!

''اِس شعر میں 'ہمارا' کی جگہ 'اپنا' چاہیے۔ میں مانتا ہوں کہ اقبال صاحب ملک کے نہایت ہی نازک خیال اور باکمال شعرا میں ہیں اور ایسی دو چار فروگزاشتوں سے اُن کا کمال مِٹ نہیں سکتا اور نہ یہ کسی کی کوشش ہونی چاہیے کہ اُن کے کمالوں پر خاک ڈالے لیکن اِن غلطیوں کو بتانا چاہیے تاکہ خود 'اقبال' صاحب کو اور دیگر شعرا کو ایسی فروگزاشتوں سے بچنے کا موقع مل سکے۔''[۷۹]

منشی دیانرائن نگم کانپور سے اخبار زمانہ نکالتے تھے۔ اُن کی حبُّ الوطنی مشہور تھی۔ اُن کے اخبار میں کتابت اِتنی اغلاط کے ساتھ ہوئی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کہیں سے سن کر لکھی گئی۔ شعروں کی ترتیب بدل گئی تھی۔ بظاہر ''ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا'' سے پہلا مصرع شائد نہ مل سکنے کی وجہ سے اس کی بجائے ''پنجاب کیا، دکن کیا، بنگال بمبئی کیا'' لکھ دیا گیا اور عین وقت پر صحیح مصرع دستیاب ہوا تو حاشیے میں لکھا، ''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بَیر رکھنا۔'' نظم کے ساتھ نگم نے جو طویل نوٹ لکھا وہ اِس گیت کے بارے میں اُن جذبات کا پہلا بھرپور اظہار تھا جو اُس کے بعد ہر ہندوستانی اِس نظم کے متعلق محسوس کرنے والا تھا۔ ''انگلستان میں ایسے گیت ہر خاص و عام کی زبان پر ہوتے ہیں،'' نگم نے لکھا تھا۔ ''کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہمارے مخدوم پروفیسر اقبال کی یہ نظم جو اُنہوں نے ہمارے پیارے اور پرانے دیس پر لکھی ہے ملک بھر میں ہردلعزیز اور مفید ثابت نہ ہو۔ ہمارے نزدیک یہ چھوٹے بڑوں، خاص و عام ہر ایک کے مفید ہونے کی مستحق ہے۔'' زمانہ کا یہ شمارہ ستمبر میں شائع ہوا۔[۸۰]

۶۸

وہ راز جس کی طرف وہ اپنی نظموں میں بار بار اشارہ کر رہے تھے اُسے ڈھکے چھپے الفاظ میں بیان کر دیا۔ نظم غزل کی ہیئت میں تھی جس کا عنوان 'سرگزشتِ آدم' تھا۔ انسان کی زبانی کہلوایا تھا کہ شعور کا جام پینے کے بعد جنت میں طبیعت نہ لگی اور دُنیا میں چلا آیا۔ تاریخ کے تغیرات حقیقتِ عالم کی جستجو کا نتیجہ تھے مگر:

ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اُسے مکیں میں نے

بات یہاں ختم نہ ہوتی تھی۔ مزید پانچ اشعار غزل کی طرز میں کہے اور تان اس پر ٹوٹی:

عجیب شے ہے صنم خانۂ امیر اقبال
مَیں بُت پرست ہوں رکھ دی کہیں جبیں مَیں نے

صنم خانۂ امیر سے امیر بیگم کے آستانے کے علاوہ امیر مینائی کا دیوان صنم خانۂ عشق بھی مراد لیا جا سکتا تھا لہٰذا نظم مخزن میں شائع کروائی جا سکتی تھی۔ ستائیس اشعار ہُوئے تھے۔[۸۱]

۶۹

جب رسول اکرمؐ مدینۂ منورہ میں جلوہ افروز تھے تو کوئی بھی عاشق خدمت میں حاضر ہو کر اپنی نگاہوں کی پیاس بُجھا سکتا تھا۔ اِس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے حضرت بلال حبشیؓ پر نظم لکھی تو جذبات میں ڈوبی ہوئی نعت بن گئی:

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

نظم مثنوی کی ہیئت میں تھی۔ اِس کے تین بند بنائے جن میں سے پہلے اور آخری میں

اشعار کی تعداد برابر تھی یعنی چار جبکہ درمیانی بند میں سات شعر تھے۔ عنوان 'بلال' تھا۔[۸۲]

'سر گزشتِ آدم' اور 'بلال' دونوں ستمبر میں مخزن میں شائع ہوئیں۔

سیالکوٹ سے قاضی حمید الدین کی ادارت میں ماہنامہ الکاشف جاری ہو رہا تھا۔ اقبال کی ایک غزل بھی اشاعت کے لیے مل گئی جس میں سترہ شعر تھے اور مقطع میں سید میر حسن کی طرف اشارہ ہے:

مجھے اقبال اُس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں ہیں وہ کچھ بن کے نکلے ہیں

اِس غزل کے تین اور شعر بھی دستیاب تھے۔[۸۳]

۷۰

اقبال نے دلگداز کے دونوں اعتراضات قبول کر کے مصرعے بدل دیے۔ اس کے علاوہ چند اور الفاظ بدل کر نظم کی بندش چست کر دی مگر اشعار کی ترتیب وہی رکھی جو پہلے تھی۔ تسلی ہوئی تو مخزن میں اشاعت کے لیے دی۔ عبدالقادر نے نوٹ لکھ بھیجا، ''جذباتِ دل کے ایک سینے سے دوسرے پر منعکس ہونے کا بھی عجیب قانون ہے۔ ہمارے دوست نے مندرجہ ذیل اشعار میں ہو بہو وہ خیالات ظاہر کیے ہیں جو وطن سے دُور ہونے کے سبب راقم کے دل میں ہیں۔ اگر میں نظم لکھتا تو لندن سے وہ خیالات ظاہر کرتا جو اقبال نے لاہور میں بیٹھے ہوئے کیے ہیں۔''

یہ نوٹ اور 'ہمارا دیس' اکتوبر کے مخزن میں اقبال کے ایبٹ آباد والے لیکچر کے خلاصے پر مبنی مضمون 'قومی زندگی' کے پہلے حصے کے ساتھ شائع ہوئے۔ بعد میں بھی مزید ایک لفظ اور عنوان بدلا۔ نظم حتمی صورت کو پہنچی۔[۸۴]

ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی، دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا، ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آبِ رود گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو؟
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا
اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

نشانِ ماہِ کنعاں، اے زلیخا، پوچھ لے مجھ سے!
کہ مَیں نے چاہِ دل سے سیکڑوں یوسف نکالے

ہیں

اِس غزل کے سترہ شعر دستیاب ہیں۔ یہ دکن ریویو میں شائع ہوئی۔[۸۵]

۷۲

اکتوبر میں اقبال ایک دوست سے ملنے ہوشیارپُور جانے والے تھے۔ پہلے کئی دفعہ وعدہ کر کے عین وقت پر ارادہ بدلا تھا۔ گورنمنٹ کالج کی سینیٹ کا آیندہ اجلاس ۷ نومبر کو ہونے والا تھا۔ اقبال کو معلوم ہوا کہ مسٹر شاہ دین فیلوشپ کے لیے اُن کا نام تجویز کریں گے مگر اسے منظور کروانے کے لیے اُنہیں سینیٹ کے دوسرے ارکان کو ملاقات کر کے ہموار کرنا ہوگا۔

اقبال اِس دوڑ دھوپ پر آمادہ ہو گئے مگر طے کیا کہ وہ براہِ راست ارکان سے ملنے کی بجائے اُن کے دوستوں سے ملیں۔ ''ذاتی طور پر مجھے یہ زیب نہیں دیتا،'' اُنہوں نے اپنے دوست کو انگریزی میں لکھا۔ ''مگر آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ مسلمان فیلوز کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ کل چھ... جن میں سے تین مولوی ہونے کے اعتبار سے عملاً گویا نہیں ہیں... اِس زمانے میں قومی مفادات سب پر مقدم ہیں۔ دوسری چھوٹی چھوٹی باتوں کو پسِ پشت ڈال دینا چاہیے۔''[۸۶]

اکتوبر کا مہینہ اِسی گناہِ بےلذت کی نذر ہُوا۔

۷۳

تنقیدِ ہمدرد کے نام سے جو بھی صاحب لکھتے تھے وہ 'ہمارا دیس' کو نظم کی بجائے غزل سمجھے۔ کچھ اِس لیے کہ اتحاد میں یہ بغیر عنوان کے چھپی تھی جس کے بعد اِسے مخزن میں دیکھ کر اُنہوں نے ساری توجہ الفاظ کو تنقیدی نظر سے دیکھنے میں صرف کر دی

اور سرخی نہ دیکھ پائے۔ کچھ اس لیے بھی کہ نظم کے اشعار کا اندرونی ربط تلاش کرنا ہندوستان کے عام مزاج کے موافق نہ تھا۔ نومبر کے اُردوئے معلیٰ میں مخزن کے حوالے سے لکھا، ''اکتوبر کا پرچہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض درشت زبان اور ناواقف لوگوں سے قطعِ نظر کرکے جو نکتہ چینی کا جواب سب وشتم سے دینا چاہتے ہیں اہلِ پنجاب میں جو لوگ منصف مزاج اور صحتِ زبان کے خواستگار ہیں وہ اپنی غلطیوں کو چھوڑتے جاتے ہیں اور نکتہ چینوں کی نکتہ چینیوں سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر اقبال صاحب نے ایک غزل کے مقطع میں لکھا تھا:

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم ہے ہمیں کو دردِ نہاں ہمارا

''دلگداز نے اعتراض کیا کہ اس شعر میں 'ہمارا' کی بجائے 'اپنا' چاہیے اور اقبال نے اب اس کو بدل کر مخزن میں اس طرح چھپوایا:

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

''حضرت اقبال کی نظمیں روز بروز زبان کے لحاظ سے صاف ہوتی جاتی ہیں۔ کاش کہ جیسی توجہ اور احتیاط وہ نظم میں کرتے ہیں ویسی ہی نثر میں بھی کرتے کیونکہ ہم افسوس کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ اسی پرچے میں اُن کے لیکچر موسوم بہ قومی زندگی میں بہت سے اغلاط موجود ہیں...''

اِس کے بعد لیکچر کی زبان کی خامیاں بیان ہوئی تھیں۔[۸۷]

اقبال نے لیکچر کی دُوسری قسط چھپوانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

۷۴

گرامی لاہور آئے تو اپنے دوست کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اقبال ہمیشہ کی طرح ہنستے مسکراتے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کئی دنوں سے امیر سے ملاقات نہیں ہوئی

تھی۔اُس کی ماں کو اُس کا اقبال سے ملنا پسند نہیں تھا۔

گرامی اُسی وقت علی بخش کو لے کر نکل گئے اور امیر کی ماں سے جا کر کہا، ''تو نے ہمارے شاعر کو ختم کرنے ٹھانی ہے؟'' نائکہ نے جواب دیا، ''مولانا!...آپ کا شاعر تو ہمارے ہاں نقب لگانے آتا ہے،میری لڑکی چلی گئی تو کون ذمہ دار ہوگا؟'' گرامی نے خود ذمہ داری قبول کی تو اُن کی ڈاڑھی کے لحاظ میں امیر کو دو گھنٹے کی اجازت مل گئی۔

اقبال کے پاس پہنچ کر گرامی نے اُنہیں جھنجھوڑا اور بولے، ''اُٹھو جی، آ گئی امیر!''

اقبال کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا مگر امیر اُن کی نگاہوں کے سامنے کھڑی تھیں۔[۸۸]

غزل

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

خموش اے دل! بھری محفل میں چلّانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

برا سمجھوں اُنہیں، مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہُوں اقبالؔ اپنے نکتہ چینوں میں

اِس غزل کے اکیس اشعار دستیاب ہیں۔[۸۹]

۷۵

فوقؔ نے یادِ رفتگاں کے عنوان سے تذکرہ مرتب کیا جس میں مسلمانوں کے

ساتھ ہندو صوفیوں کو بھی جگہ دی۔ اقبال نے پڑھا تو لکھا، "بھائی فوقؔ۔ خود بھی اُس گوہرِ نایاب کی تلاش میں رہو جو بادشاہوں کے خزانے میں نہیں مل سکتا بلکہ کسی خرقہ پوش کے پاؤں میں اتفاقاً مل جاتا ہے۔"

۷۶

دنیا میں ہر چیز کو حقیقتِ مطلق سے وصال کی تمنا ہے۔ یہ خیال ایک موج کی زبانی کہلوایا گیا جس نے سمندر کے عشق میں اپنی بےتابی بیان کی تھی۔ "موجِ دریا" مسدس کی صورت تھی اور اس میں تین بند تھے۔[۷]

دوسری طرف یہ بھی درست تھا کہ جس کی تلاش تھی وہ ہر چیز میں موجود بھی تھا۔ اندازِ گفتگو نے دھوکے دیے تھے ورنہ نغمہ بلبل کی خوشبو اور بُو پھول کی چہک تھی۔ آسمان پر چاند شاعر کے دل کی مانند تھا، وہاں جو چیز چاندنی بنی تھی وہی شاعر کے دل میں درد بن گئی تھی:

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شے میں جب کہ پنہاں خاموشیِ ازل ہو

یہ بات جگنو کے حوالے سے کہی تھی جو شب کی سلطنت میں دن کا سفیر بن کر آتا تھا۔ نظم 'جگنو' ترکیب بند تھی۔ اس میں تین بند تھے۔ سترہ شعر تھے۔ پہلے دونوں بند چھ چھ شعر کے تھے اور آخری بند میں پانچ شعر تھے۔[۸]

حقیقت کی جھلک ہر شے میں تھی مگر انسان کو خودشناسی ملی تھی جو درد سے پرورش پاتی تھی۔ یہ بات صبح کے ستارے کی زبانی کہلوائی تھی جو صبح کے دامن سے کفن پہننے کی بجائے کسی ایسی بیوی کی آنکھ کا آنسو بننا چاہتا تھا جس کا شوہر جنگ پر روانہ ہو رہا ہو اور وہ اُسے رخصت کرتے ہُوئے رو بیٹھے۔ نظم 'صبح کا ستارہ' مثنوی کی ہیئت میں تھی جس کے پہلے بند میں سات، دوسرے میں چھ اور تیسرے میں نو شعر تھے۔[۹]

’موجِ دریا‘ دکن ریویو کے نومبر دسمبر کے شمارے میں شائع ہوئی۔ ’جگنو‘ اور ’صبح کا ستارہ‘ دسمبر میں مخزن میں شائع ہوئیں۔ ان کے علاوہ پرانی نظم ’یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے‘ کا پہلا بند ’ہلالِ عید‘ کے عنوان سے شائع ہوا۔

۷۷

اقبال نے حضرت علیؓ کی شان میں میں ایک منقبت فارسی میں لکھی تھی جسے وہ ان دنوں صبح کے وقت پڑھا کرتے تھے، ’’اے کہ آپ کی ثنا میں زبان محو ہے، اے کہ آپ روح کے کارواں کے یوسف ہیں...‘‘

اے محوِ ثنائے تو زباں ہا
اے یوسفِ کاروانِ جانہا[۹۳]

۷۸

۱۹۰۴ء کے اواخر میں امیر بیگم اور اقبال کا تعلق امیر کی والدہ کی دخل اندازی سے ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔[۹۴]

۷۸

اقبال کی جذباتی زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے اُن کے ذہن کی ہمہ گیر وسعت کو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے۔ یہ تو ممکن تھا کہ نسوانی حسن اُن کی فطرت کے لیے بجلی بن کر انہیں عظیم الشان نفسیاتی تجربے سے دوچار کر دیتا مگر یہ ممکن نہ تھا کہ محض کسی کے ہجر کا غم اُن کی زندگی کا رُخ بدل دیتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۰۴ء کے اختتام پر اُن کی زندگی میں کئی مایوسیاں جمع ہوگئی تھیں۔ اُنہیں جس فیلوشپ کا آسرا ہُوا تھا وہ انہیں نہیں ملی تھی۔ عزیز دوست (عبدالقادر) انگلستان گئے تھے اور اپنی بے پناہ ذہانت کے باعث یہ بھی اپنا حق سمجھتے تھے کہ مغرب

کے میکدۂ علم سے جرعے حاصل کرنے کا موقع ملے۔ اِس معاملے میں تقدیر اُن سے ناانصافی پر آمادہ نظر آتی تھی جس کی شکایت اُن دنوں کی نظموں میں موجود ہے۔ ان سب سے قطعِ نظر ہندوستان کے سیاسی پس منظر پر ہندو اور مسلمان کے درمیان بڑھتے ہوئے تعصبات اور جہالت کی کارفرمائیاں انہیں اپنے گردوپیش سے اور بھی بیزار کر رہی تھیں۔ یہ تعصب اور جہالت یقیناً ایک ایسے حساس شخص کے لیے جس کا نفیس فلسفہ ہندو کو خدا پرست مانتا تھا ایک ذاتی اذیّت سے کم نہ تھیں۔ ہندو اور مسلم کی معرکہ آرائی کا خیال اُن کی اپنی شخصیّت میں ایک تکلیف دہ توڑ پھوڑ کا استعارہ تھا۔

بہر حال یہ عجیب اتفاق ہے کہ امیر بیگم سے قطعِ تعلق کے بعد آیندہ سات برس تک نہ وہ انجمن کے اجلاس میں نظم سُنا سکے نہ کوئی طویل نظم لکھ سکے۔

علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن گوہر بدست
وائے محرومی خزف چینِ لبِ ساحل ہوں میں
مَیں وہی ہوں کھو گیا تھا جس کا دِل روزِ الست
تم نہ پہچانو تو تم جانو، وہی بے دِل ہوں مَیں
ہے عبث اے برق تجھ کو میرے حاصل کی تلاش
مجھ پر آ کر گر کہ اپنا آپ ہی حاصل ہوں مَیں
ڈھونڈھتا پھرتا ہے کیا اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر، آپ ہی منزل ہوں میں

یہ غزل دسمبر میں مخزن میں شائع ہوئی۔ اِس کے چودہ شعر دستیاب ہیں۔[۹۵]

تتمہ

امیر بہت دن زندہ رہیں مگر اقبال سے نہ مل سکیں۔ یہ بات ماننا پڑتی ہے کہ اتنے بڑے شاعر نے اُنہیں جس توجہ کے لائق سمجھا تھا اُنہوں نے آخر عمر تک اُس کی لاج

رکھی۔ کوئی اقبال کا ذکر کرتا تو مُسکرا کر خاموش ہو جاتیں۔ کبھی کسی کو اپنی اور اقبال کی ملاقاتوں کا حال نہ بتایا یہاں تک کہ جب اقبال کی وفات کے بعد اور پاکستان بننے کے بعد اقبال کی شخصیت کے نام پر لوگوں نے دولت اور شہرت سے اپنا دامن بھرنا شروع کیا امیر نے تب بھی کوئی واقعہ، کوئی فقرہ کہہ کر اس دِلی تعلق کی تشہیر کرنا گوارا نہ کی۔ ایک صحافی نے ۱۹۴۸ء میں اُن سے ملاقات کا حال بیان کیا ہے:

> امیر چھیاسٹھ برس کے سِن میں ہے... رنگ سنولا چکا بلکہ سیاہ ہوتا جا رہا ہے۔ بال سفید ہو چکے ہیں...
>
> ''خالہ یہ کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔''
>
> امیر نے آنکھیں کھول دیں... ہم نے سوال کیا تو اُس کے بوڑھے چہرے کی جھریاں مُسکرائیں، جیسے کسی گم شدہ کہانی کے الفاظ بکھر گئے ہیں اور وہ انھیں ایک ایک جوڑ دینا چاہتی ہے۔ اقبال کے نام سے اُس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں ایک نور سا جاگ اُٹھا، لیکن بسرعت مدھم ہو گیا۔ گویا ایک چُپ، سو سُکھ۔
>
> اس نے کچھ بتانا قبول نہ کیا۔ ہمارا اصرار بڑھا تو قدرے جھنجھلا کر کہا، ''ہمارے ہاں مُردوں کے کفن پھاڑنے کا رواج نہیں۔ انسانی گوشت کی چاٹ بُری ہوتی ہے... اِس عمر میں انسان کو خوفِ خدا کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا۔ جب خُدا کا خوف نہیں تھا تو سب کچھ یاد تھا۔''
>
> ہم نے بات کو طول دینا چاہا اور تقاضا کیا کہ وہ اُن صحبتوں کی کوئی کہانی چھیڑے جب اقبال، عبدالقادر گرامی، ناظر وغیرہ ہم حاضر ہوتے تھے لیکن اُس نے نکو کھلے قہقہوں میں ہمارے استفسار کو سمیٹا پھر ذرا ترش ہو کر کہا، ''... میں کوئی کتاب نہیں کہ اُٹھایا، ورق پلٹے، جس پیرے یا صفحے پر نظر ٹھیری اُس کو کھنگالنا شروع کیا۔ پُرانی باتیں وقت کے ساتھ مر چکی ہیں۔''
>
> ہمیں یقین ہو گیا کہ امیر اِس معاملے میں بڑی ضدی ہے۔ اُس کا روپ مر چکا ہے لیکن اُس کی آن نہیں مری، اس کی خودی زندہ ہے۔''

حاشیے

نوٹ:

☆ اس سوانح میں اقبال کا کلام گیان چند (۱۹۸۸) سے لیا گیا ہے۔ جہاں کوئی اور ماخذ ہے وہاں نشاندہی کی گئی ہے۔ جہاں تک ہو سکا ہے میں نے ابتدائی ماخذ بالخصوص مخزن کے اصل شماروں سے موازنہ کر لیا ہے اور حسب ضرورت تصحیح بھی کر دی ہے۔

☆ جن معلومات کا ماٰخذ اقبال کے خطوط ہیں وہاں صرف مکتوب علیہ کا نام اور خط کی تاریخ درج کی گئی ہے (مثلاً دیکھیے باب ۲ ماٰخذ ۷)۔ ایسی تمام صورتوں میں ہمارا حوالہ کلیاتِ مکاتیبِ اقبال (مرتبہ سیّد مظفر حسین برنی مطبوعہ اُردو اکادمی دہلی) رہی ہے۔

☆ اقبال کی ابتدائی تعلیم (سیالکوٹ کے زمانۂ قیام) اور اُس زمانے کے نصاب سے متعلق معلومات عام طور پر سلطان محمود (۱۹۸۶ء) سے اخذ کی گئی ہیں۔

باب ا: زمین اور آسمان

ا یہ وہی منتر ہے جسے گاتیری کہتے ہیں۔ اقبال نے 'آفتاب' کے نام سے اس کا ترجمہ کیا اور کفر کا فتویٰ پایا۔ دیگر تفصیلات نیز سنسکرت متن کے لیے گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۷۴

۲ اقبال کے خاندانی پس منظر کے بارے میں معلومات زیادہ تر جاوید اقبال (۱۹۷۹) اور اعجاز احمد (۱۹۸۴) سے لی گئی ہیں۔

۳ تاثرات مولوی سید میر حسن کے ہیں جو انہوں نے منشی محمد دین فوق کے نام

خط میں درج کیے۔ سلطان محمود (۱۹۸۶) ص ۳۴ پر منشی محمد دین فوق کی کتاب ملک العلما علامہ عبدالحکیم (۱۹۲۴) ص ۲۶ کے حوالے سے درج ہے۔

۴ اعجاز احمد (۱۹۸۴)

۵ سلطان محمود (۱۹۸۶) ص ۱۷

۶ انیسویں صدی کے سیالکوٹ کے بارے میں معلومات عام طور پر سلطان محمود حسین (۱۹۸۶) سے لی گئی ہیں۔

۷ اعجاز احمد (۱۹۸۴)

۸ سید میر حسن کے بارے میں معلومات عام طور پر سلطان محمود حسین (۱۹۸۱) سے لی گئی ہیں۔

۹ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۵) نے ماہنامہ میثاق لاہور، دسمبر ۱۹۷۷ء کے حوالے سے لکھا ہے کہ مولوی میر حسن کی غالب سے ملاقات کا حال پروفیسر سلیم چشتی نے خود مولوی صاحب سے سنا تھا۔

۱۰ یہ روایت سید زکی شاہ کی ہے۔ دیکھیے عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷)

۱۱ یہ واقعہ خود اقبال نے ۱۹۰۴ کے لیکچر 'قومی زندگی' میں بیان کیا۔ دیکھیے مقالاتِ اقبال مرتبہ عبدالواحد معینی (۱۹۶۳)

۱۲ تقریر کا اقتباس انور صدیقی (۱۹۸۷) کی انتخاب مضامین سر سید (ص ۱۱) سے لیا گیا ہے۔

۱۳ علی گڑھ کالج کے سنگِ بنیاد سے متعلق عام واقعات GRAHAM (1885/1909) بالخصوص باب ۱۳ سے لیے گئے ہیں۔

۱۴ روایت سید زکی شاہ۔ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷)

۱۵ یہ خواب بہت مشہور ہے۔ ہمارا ماخذ عبدالمجید سالک (۱۹۵۵) ہیں۔ اُن کا

بیان ہے کہ خلیفہ عبدالحکیم نے خود اقبال سے سُنا تھا۔

۱۶ اقبال کی تاریخِ پیدائش متنازعہ ہے۔اقبال کی تاریخِ پیدائش پر **مفصل بحث** جاوید اقبال (۱۹۷۹ء) یا اعجاز احمد (۱۹۸۴ء) میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔حال ہی میں ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبال اکادمی لاہور سے **اقبال کی تاریخِ ولادت** کے عنوان سے مقالات کا مجموعہ بھی شائع کیا ہے۔

مندرجہ ذیل تاریخوں کو اُن کی پیدائش سے متعلق سمجھا گیا ہے۔

۹ نومبر ۱۸۷۷ء (۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ)

اقبال نے میونخ یونیورسٹی میں اپنا مقالہ داخل کرتے ہوئے اپنی تاریخِ پیدائش ''۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۶ء)'' لکھی تھی۔خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے گھر والوں سے تاریخ معلوم کروائی ہوگی۔وہاں سے ہجری تاریخ بتائی گئی اور عیسوی سال اقبال نے خود اندازے سے نکال لیا۔ چنانچہ زندگی بھر خود اقبال اور اُن کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد اسی لحاظ سے اقبال کی عمر کا حساب لگاتے رہے۔اقبال نے اپنی زندگی میں سالِ ولادت ہمیشہ ۱۸۷۶ء لکھا یہاں تک کہ جب ۱۹۳۱ء میں اُن کا پاسپورٹ بنا تو اُس پر بھی یہی سال درج کیا۔

۱۹۶۳ء میں عطا محمد کے فرزند اعجاز احمد نے ایک تقویم سے صحیح عیسوی تاریخ نکالی جو ۹ نومبر ۱۸۷۷ء بنتی تھی۔یہ تاریخ انہوں نے فقیر سیّد وحید الدین کی کتاب فقیر سید وحید الدین (۱۹۶۳ء) میں شائع کروادی مگر اُس وقت تک بعض دوسری تاریخیں (خصوصاً ۱۹۷۳ء) اس قدر مشہور ہو چکی تھیں کہ چند سال بعد پہلے بزمِ اقبال لاہور کو اور اس کے بعد حکومتِ پاکستان کی وزارتِ تعلیم کو باقاعدہ کمیٹیاں مقرّر کرنا پڑیں۔بزمِ اقبال کی کمیٹی ۱۹۷۲ء کی آخری سہ ماہی میں بیٹھی جبکہ وزارتِ تعلیم کی کمیٹی نے

جنوری ۱۹۷۷ سے یکم فروری ۱۹۷۷ تک تین اجلاس منعقد کرنے کے بعد اِس تاریخ کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس کمیٹی کے گیارہ ارکان تھے یعنی (۱) ڈاکٹر محمد اجمل (سیکرٹری تعلیم) چیرمین (۲) ریٹائرڈ جسٹس ایس اے رحمان (۳) جسٹس جاوید اقبال (اقبال کے بیٹے) (۴) پروفیسر حمید احمد خان (ناظم مجلس ترقیٔ ادب لاہور) (۵) ایس اے واحد (نائب صدر اقبال اکادمی پاکستان کراچی) (۶) پروفیسر محمد عثمان (معتمد بزمِ اقبال) (۷) ڈاکٹر سیّد عبداللہ (۸) پروفیسر وقار عظیم (۹) ڈاکٹر وحید قریشی (۱۰) خواجہ عبدالرحیم ایڈوکیٹ اور (۱۱) شیخ اعجاز احمد (اقبال کے بھتیجے)۔

یہ تاریخ سیالکوٹ کے رجسٹر پیدائش میں کہیں نہیں ملتی۔ اس بات کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ شیخ نور محمد اپنے بچوں کی پیدائش کا اندرج کروانے میں بعض اوقات لاپرواہی برت جاتے تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اقبال کی بعض بہنوں کی پیدائش کا اندراج بھی رجسٹر میں نہیں ملتا۔ اِس تاریخ کو درست تسلیم کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں: (۱) یہ تاریخ اقبال نے خود اپنے ہاتھ سے درج کی (۲) اقبال کی زندگی میں وہ خود اور اُن کے اہلِ خانہ اسی تاریخ کو اُن کی پیدائش کی تاریخ سمجھتے رہے۔ اہلِ خانہ کی مزید شہادتیں اعجاز احمد (۱۹۸۵) میں درج ہیں۔ (۳) اِس تاریخ کو جمعے کا دن تھا۔ اقبال کی والدہ کہا کرتی تھیں کہ وہ جمعے کے دن پیدا ہوئے تھے۔ اقبال کی دوسری جتنی بھی تاریخیں بیان کی جاتی ہیں وہ جمعے کے علاوہ دوسرے دنوں کی ہیں۔

پاکستان میں یہ تاریخ سرکاری طور پر اقبال کی پیدائش کی تاریخ تسلیم کی گئی ہے۔ اقبال کے اکثر سوانح نگار (مثلاً جاوید اقبال) اب یہی تاریخ استعمال کرتے ہیں۔

اِس تاریخ کے متعلق شبہات کا اظہار بھی بہت کیا گیا ہے۔ شبہات کی بنیاد

مندرجہ ذیل امور پر ہے: (۱) اقبال کی زندگی میں اُن کا کلام تو بہت چھپا مگر اتفاق سے تاریخِ پیدائش کی اشاعت زیادہ نہیں ہوئی۔ اُن کی وفات کے بعد جو تاریخِ پیدائش مشہور ہوئی وہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء تھی۔ یہ تاریخ اتنا عرصہ لوگوں کے ذہنوں میں رہی کہ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں اچانک اِسے ترک کرنا بعض لوگوں کو گوارا نہ ہو سکا۔ (۲) جن حالات میں حکومتِ پاکستان نے تاریخِ ولادت کی تحقیق کروائی اُن کی وجہ سے بھی شبہ پیدا ہُوا۔ ۱۹۷۲ء میں بھارت میں اعلان ہوا تھا کہ اگلے برس اقبال کا صد سالہ جشنِ ولادت منایا جائے گا۔ حکومتِ پاکستان کو اُس وقت خیال آیا جب اگلے برس بھارت میں جشن شروع ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ حکومت کو اتنے بڑے جشن کا اہتمام کرنے کے لیے وقت درکار تھا۔ لہٰذا یہ بات حکومت کی خواہش کے عین مطابق تھی کہ تاریخ پیدائش ایسی نکل آئے جسے ابھی سو سال پورے ہونے میں کچھ وقت باقی ہو مثلاً اگر فروری ۱۹۷۴ء میں وزارتِ تعلیم کی کمیٹی یہ اعلان کرتی کہ اقبال ۱۸۷۳ء ہی میں پیدا ہوئے تھے تو حکومتِ پاکستان کے پاس اس بات کا کیا جواب تھا کہ یہ تحقیق پہلے کیوں نہ ہوئی اور اقبال کا جشن بھارت میں منایا گیا تو خود پاکستان میں کیوں نہ منایا گیا۔ (۳) ایک الجھاو یہ بھی ہے کہ اقبال نے نومبر ۱۸۹۰ء میں مڈل کے امتحانی فارم میں اپنی عمر پندرہ سال درج کی تھی۔ دو ڈھائی سال بعد انٹرنس کا امتحان پاس کیا تو گزٹ میں اُن کی عمر سترہ سال بتائی گئی۔ اِس لحاظ سے اُنہیں ۱۸۷۵ء میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔

یہاں ایک اور بات کی وضاحت ضروری ہے۔ جنوری ۱۹۳۸ء میں جب اقبال ابھی زندہ تھے لاہور کے انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ نے ملک بھر میں یومِ اقبال منانے کا اہتمام کیا تھا مگر یہ یومِ ولادت کے طور پر نہیں منایا گیا تھا

بلکہ کسی مناسب دن کو منتخب کر کے اقبال کے پیغام کی ترویج کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔

دسمبر ۱۸۷۶ء

اصل میں یہ تاریخ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہی ہے۔ اقبال کی وفات کے بعد روزنامہ انقلاب کے رپورٹر نے اُن کے بھائی سے تاریخِ پیدائش دریافت کی تو انہوں نے ہجری تاریخ کو ذہن میں رکھتے ہوئے اندازے سے دسمبر ۱۸۷۶ء کہہ دیا۔ یہ تاریخ رونامہ انقلاب کے اپریل ۱۹۳۸ء کے شماروں میں شائع ہوئی۔

۲۲ فروری ۱۸۷۳ء

یہ تاریخ سب سے پہلے روزنامہ انقلاب کی ۷ مئی ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا ماٰخذ یہ تھا کہ سیالکوٹ میں کسی نے رجسٹرِ پیدائش میں اس تاریخ کے سامنے ایک لڑکے کی پیدائش کا اندراج دیکھا تھا۔ لڑکے کے باپ کا نام نتھو درج تھا۔ اس اندراج کو اقبال کی پیدائش کا اندراج سمجھا گیا۔ شیخ عطا محمد کے نواسے خالد نظیر صوفی کا خیال ہے کہ یہ اصل میں اُس لڑکے کی پیدائش کا اندراج ہے جو بچپن ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ (دیکھیے اسی باب کی فصل نمبر ۳۷ اور ۳۹) مگر پروفیسر عثمان کی تحقیق یہ ہے کہ یہ اندراج سرے سے شیخ نور محمد کے گھر کا ہی نہیں ہے کیونکہ رجسٹرِ پیدائش میں کم از کم پچیس نتھو ملتے ہیں جو سبھی سیالکوٹ میں رہتے تھے۔ اقبال کے والد بھی اگرچہ نتھو کے نام سے مشہور تھے مگر وہ محلّہ چوڑی گراں میں رہتے تھے جبکہ ۱۸۷۳ء والے اندراج میں نتھو کا پتہ محلّہ کشمیریاں ہے۔

۱۹۵۵ء میں بزمِ اقبال لاہور کے زیرِ اہتمام ذکرِ اقبال شائع ہوئی جسے اقبال کی پہلی باقاعدہ (اسٹینڈرڈ) سوانح کہنا چاہیے۔ اتفاق سے اس کے

مصنف عبدالمجید سالک تھے جو انقلاب کے بانی اور مدیر تھے۔ انہوں کتاب میں بھی یہی تاریخ درج کی اور وہاں سے یہ تاریخ ہر جگہ نقل ہونے لگی۔ ۱۹۷۴ء تک یہی تاریخ درست سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ بھارت میں اقبال کا صد سالہ یومِ پیدائش اسی حساب سے ۱۹۷۳ء میں منایا گیا۔

۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء

یہ تاریخ سب سے پہلے ۱۹۷۱ء میں اقبال درونِ خانہ میں شائع ہوئی۔ کتاب کے مصنف خالد نظیر صوفی تھے یعنی شیخ عطا محمد کے نواسے اور اعجاز احمد کے بھتیجے۔ اُن کا ماٰخذ بھی سیالکوٹ کا رجسٹرِ پیدائش تھا جس میں اس تاریخ کو ایک اور لڑکے کی پیدائش کے اندراج میں والد کا نام نتھو درج تھا۔ اِس اندراج کے متعلق بھی پروفیسر عثمان کی تحقیق یہی ہے کہ یہ نتھو کوئی اور ہے کیونکہ اس کا پتہ اگرچہ چوڑی گراں ہے مگر ''پیشہ۔ قوم و مذہب'' کے خانے میں خیاط درج ہے جسے پیشہ نہیں قوم (ذات) سمجھنا چاہیے۔ نور محمد ہوتے تو وہ اس خانے میں کشمیری لکھواتے جیسا کہ اُن کے والد محمد رفیق نے ۶ ستمبر ۱۸۷۰ء کو اُن کی لڑکی کی پیدائش کے اندراج میں لکھوایا تھا۔

۱۸۷۵ء

یہ تاریخ کم معروف ہے اور بہت کم محققین اسے قبول کرتے ہیں، مثلاً سلطان محمود حسین۔ اِس کا ماٰخذ اقبال کی مڈل کی سند اور انٹرنس کے نتیجے والا گزٹ ہے۔ مڈل کی سند اُس امتحانی فارم کی بنیاد پر جاری کی گئی جسے اقبال نے نومبر ۱۸۹۰ء میں بھرا ہوگا۔ انٹرنس کا نتیجہ دو ڈھائی سال بعد نکلا تھا۔ فارم میں عمر پندرہ سال لکھی گئی ہے جس کے مطابق اقبال کو ۱۸۷۵ء میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ انٹرنس کے نتیجے سے بھی یہی حساب نکلتا ہے۔ اِس کے جواب میں شیخ اعجاز احمد لکھتے ہیں کہ اقبال کو پہلی جماعت میں شاید مولوی میر حسن نے داخل

کروایا ہوگا اور اندازے سے اُن کی عمر لکھوا دی ہوگی۔ اقبال اچھے قد کاٹھ کے تھے لہٰذا مولوی صاحب کو عمر میں مغالطہ لگ سکتا تھا۔ پھر اسکول کے رجسٹر میں یہی عمر چلتی رہی اور مڈل اور انٹرنس (میٹرک) کے رزلٹ تک لکھوائی جاتی رہی۔ بعد میں بی اے کی درخواستِ داخلہ میں ۱۸۹۶ء میں انیس سال عمر لکھوائی۔ اس لحاظ سے اُن کا سالِ پیدائش ۱۸۷۵ء نہیں بلکہ ۱۸۷۷ء بنتا ہے۔

اِس کے جواب میں سلطان محمود کا استدلال یہ ہے کہ اولین فارم پر درج کی ہوئی عمر ہی درست تھی اور بعد میں اِسے دو سال کم اِس لیے کیا گیا کہ اقبال کے دِل میں سرکاری ملازمت کے حصول کا خیال پیدا ہو گیا تھا اور سرکاری ملازمت میں عمر کم بتانے میں جو فائدہ ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔

۱۹۰۷ء میں اقبال کے جوانی کے دِنوں کے دوست منشی محمد دین فوق نے کشمیری میگزین (لاہور) میں اقبال کے حالاتِ زندگی شائع کیے تھے۔ بعد میں یہی حالات ترمیم و اضافے کے ساتھ ۱۹۱۱ء میں اپنی کتاب مشاہیرِ کشمیر میں شائع کیے۔ اس کے بعد بھی اقبال کی زندگی میں اِن میں دو دفعہ اور ترمیم ہوئی۔ منشی فوق نے اقبال کی تاریخِ پیدائش ۱۸۷۵ء ہی بتائی ہے اور ہر مرتبہ اسی لحاظ سے اُن کی عمر لکھی ہے۔

۱۷ خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) لکھتے ہیں کہ محمد اقبال نام امام بی بی نے تجویز کیا تھا مگر کوئی سند نہیں دی۔

۱۸ حمید احمد خاں (۱۹۷۴) ص ۵۰۔ انہیں اقبال نے خود یہ بات بتائی تھی۔

باب ۲: ماں کی آغوش کی وسعت

۱ حمید احمد خان (۱۹۷۴) ص ۵۰

۲ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۱۳۔ اُن کا ماخذ ہے غلام دستگیر رشید (۱۹۶۴)

آثارِ اقبال۔

۳ نذیر نیازی (۱۹۶۱) ص۷۰۔۶۹

۴ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص۱۸۰۔۱۷۹۔ یہ روایت اقبال اور عطا محمد کے بھانجے منظور احمد کی ہے۔ وہ طالع بی کے بیٹے تھے۔

۵ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص۵۰

۶ ایضاً ص۴۹

۷ اقبال بنام مہاراجہ کشن پرشاد ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء

۸ سلطان محمود حسین (۱۹۸۶) ص۱۱۵

۹ نذیر نیازی (۱۹۷۹) ص۱۰۔ انہوں نے ۱۹۷۳ میں کریم بی سے انٹرویو کیا تھا جب محترمہ کی عمر نوے برس سے اُوپر تھی۔ غلط اور غلت والا واقعہ بھی نذیر نیازی ہی نے ص۵۲ پر لکھا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ اُنہوں کس سے سنا۔ نہ ہی یہ لکھا ہے کہ اقبال نے یہ بات کب اور کس اُستاد کے سامنے کہی۔

۱۰ اقبال بنام شاہ سلیمان پھلواری ۲۴ فروری ۱۹۱۶ء

۱۱ سلطان محمود حسین (۱۹۸۶) ص۱۱۵

۱۲ خالد نظیر صوفی (۱۹۷۰) ص۷۵

۱۳ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص۲۳۔ یہ روایت سیّد زکی شاہ کی ہے۔

باب ۳: خاندانِ مرتضیٰ کی بارگاہ

۱ مولوی سیّد میر حسن کے حالات عام طور پر سلطان محمود (۱۹۸۱) سے اخذ کیے گئے ہیں۔

۲ اعجاز احمد (۱۹۸۵) ص۴۹

۳ ایضاً۔ باب نمبر ۸، ۷، ۶

۴ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص۴۵۔ روایت سیّد ذکی شاہ

۵ مسلم ایجوکیشنل کانگریس (کانفرنس) کے اجلاسوں کی کاروائی ، قراردادوں اور دیگر تفصیلات کے لیے دیکھیے الطاف علی بریلوی (۱۹۷۰)۔

۶ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۲۷ روایت سیّد ذکی شاہ۔ اُن کا کہنا ہے کہ اخیر عمر میں عطا محمد کو واقعی افیون کی عادت پڑ گئی تھی۔

۷ خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) ص ۹۔۸۔ یہ روایت مہتاب بیگم کی ہے۔ مصنف نے غالباً اُن کی بیٹی سے سُنی ہو گی جو مصنف کی والدہ تھیں۔

۸ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۲۹۔۲۸ اعجاز احمد نے یہ واقعہ خود اقبال کی زبانی سنا تھا۔

۹ سلطان محمود (۱۹۸۱) ص ۹۴

۱۰ شیخ گلاب دین اور میر حسن کا معاملہ جو اِس باب کی آیندہ فصلوں میں بھی آئے گا، عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۳۴۔۳۳ پر سیّد ذکی شاہ کی روایت سے ماخوذ ہے۔

۱۱ خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) ص ۱۰،۹۔ یہ روایت اُن کے والد صاحب نے اقبال کے ایک ہم جماعت کے حوالے سے سنائی تھی جس کا نام کتاب میں درج نہیں۔

۱۲ خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) ص ۸۔ معلوم ہوتا ہے مصنف نے یہ واقعہ اقبال کی بھابی یعنی شیخ عطا محمد کی دوسری بیوی مہتاب بیگم کی زبانی سنا تھا۔ وہ مصنف کی نانی تھیں۔

۱۳ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو خود اپنے بچپن کا یہ واقعہ سنانے کا بہت شوق تھا۔ عطیہ فیضی (۱۹۴۶) اور عبدالمجید سالک (۱۹۵۵) نے الگ الگ موقعوں پر اسے اقبال سے سن کر روایت کیا ہے۔

۱۴ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۳۳۔ اُن کا ماخذ خوشیا کا انٹرویو ہے جو رحیم

بخش شاہین کی اوراقِ گم گشتہ میں شائع ہوا۔

۱۵ فقیر سیّد وحید الدین (۱۹۶۳) ص ۵۸۔ انہوں نے یہ واقعہ خود اقبال کی زبانی سنا تھا۔

۱۶ یہ واقعہ اتنا مشہور رہا کہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارا ماخذ خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) ص ۹ ہے مگر انہوں نے اپنا ماخذ درج نہیں کیا۔

۱۷ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۳۵۔ اُن کا ماخذ رفیع الدین ہاشمی کی تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ ہے جہاں رسالہ الزبیر، اقبال نمبر ۱۹۷۷ء نمبر ۲ کے صفحہ ۱۱ پر خود محمد تقی شاہ کا بیان درج ہے۔ گیان چند نے اسے مخمس قرار دیا ہے اور یاد دلایا ہے کہ چوتھا مصرعہ پچھلے مصرعوں سے ہم قافیہ نہیں ہے۔ ممکن ہے یہی بات ہو مگر یوں بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دراصل مسدّس ہو اور محمد تقی کو مصرعے بیان کرتے ہوئے خیال نہ رہا ہو کہ وہ تیسرے مصرعے کے بعد ٹیپ کے شعر پر آگئے ہیں (زبانی سنانے میں اس بات کا احتمال ہے)۔ ویسے بھی اُن دنوں مسدّس لکھنے کا رواج عام تھا۔ سیّد نذیر نیازی (۱۹۷۹) ص ۵۳ پر بھی اس کا حوالہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں، ''محمد اقبال نے شعر کہا: جی میں آئی جو تقی کے تو کبوتر پالے۔ کوئی کالا، کوئی اسپید ہے، دو مٹیالے۔''

۱۸ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۸)۔ دیکھیے اوپر حاشیہ نمبر ۴۔

۱۹ کسان والا واقعہ: ایضاً۔ ص ۳۴۔ اُن کا ماخذ ہے رحیم بخش شاہین کی اوراقِ گم گشتہ میں سیّد ذکی شاہ کا بیان ص ۲۶۸۔

۲۰ ایضاً

۲۱ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۶۳۔ یہ روایت پروفیسر محمد دین بھٹی نے بیان کی ہے۔

۲۲ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۲۸۔ اُن کا ماخذ ہے سیارہ ڈائجسٹ، قرآن نمبر (۲) ص ۷۵۲

۲۳ نذیر نیازی (۱۹۷۹) ص ۵۲۔ اُنھوں نے یہ روایت جمشید علی راٹھور سے سنی تھی۔

۲۴ دیکھیے باب ۷ میں شیخ عبدالقادر کا مضمون 'اقبال'، خدنگِ نظر (لکھنؤ) مئی ۱۹۰۲۔

۲۵ اقبال بنام شاہ سلیمان پھلواری ۲۴ فروری ۱۹۱۶ء

[۲۶] افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۳۸۔ ان کا ماخذ ہے اقبالنامہ حصہ اول ص ۳۴۳

۲۷ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۲۵۔ روایت سیّد ذکی شاہ

۲۸ ایضاً ص ۱۹۹۔ روایت لالو پہلوان

۲۹ سلطان محمود حسین (۱۹۸۲) ص ۱۸۹۔ اُن کا ماخذ ہے ڈاکٹر بشارت احمد کی خودنوشت یادِ رفتگاں، احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام لاہور (سنہ ندارد) حصہ اول ص ۱۴۰

۳۰

۳۱ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۳۰۔ روایت سیّد ذکی شاہ

۳۲ عطا محمد کے بیٹے اعجاز احمد کا بیان ہے کہ شیخ نور محمد بھی شروع شروع میں وابستہ ہوئے اور ۱۹۰۲ء تک رہے۔ اُن کے مطابق امام بی کو بھی مرزا غلام احمد سے عقیدت تھی۔

یہ بات صاف ہے کہ اقبال نے کبھی مرزا غلام احمد کی بیعت نہیں کی تھی یہاں تک کہ جب ۱۹۰۲ء میں میر حامد شاہ نے (جو ایک طرح سے اقبال کے اُستاد بھی تھے) اقبال کو دعوت دی تو اقبال نے اس کا نہائت واضح جواب

منظوم کر دیا۔ منتخب اشعار بانگِ درا میں 'عقل و دل' کے نام سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اقبال کے بھتیجے اور واقفِ حال شیخ اعجاز احمد بھی جو خود نہایت سرگرم احمدی تھے، اپنی کتاب مظلوم اقبال (۱۹۸۴) میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ایک عرصے تک (بعض اصحاب کے نزدیک ۱۹۳۵ء تک) اقبال احمدیت کو پنجاب میں اسلامی معاشرے کا ایک صحت مند مظہر سمجھتے رہے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد اُن کے احمدیت سے اختلافات سامنے آنے لگے۔ اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ پہلے ختمِ نبوّت کے قائل نہ تھے اور بعد میں ہوئے۔ ختمِ نبوّت کا عقیدہ اُن کے ابتدائی اشعار میں بھی پیش کیا گیا ہے مثلاً ایک نعت میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرتے ہیں: ''اے کہ بعد از تو نبوّت شد بہر مفہوم شرک۔'' 'عقل و دل' والی نظم میں بھی دل کی پیروی سے یہی عقیدۂ ختمِ نبوّت مراد لیا گیا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اقبال وسیع النظر تھے اور عام طور پر تعصّبات سے بلند رہتے تھے۔ اُن سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ کسی عقیدے پر ایمان نہ رکھنے کی وجہ سے اُس عقیدے کے ماننے والوں کی اچھائیوں کو نظر انداز کر دیں گے۔

البتہ اقبال کے والدین اور بھائی کے متعلق شیخ اعجاز احمد کا دعویٰ تھا کہ اقبال کے بھائی شیخ عطا محمد شروع ہی میں احمدی ہو گئے تھے اور اقبال کے والدین بھی مرزا غلام احمد سے عقیدت رکھتے تھے۔ امام بی بی نے اُن سے دعا کروائی تھی جس کے نتیجے میں عطا محمد کے یہاں لڑکا پیدا ہوا اور اُس کا نام اعجاز احمد بھی اسی سبب سے رکھا گیا۔ نیز یہ کہ شیخ نور محمد نے مرزا غلام احمد کی بیعت کر لی تھی جس سے وہ ۱۹۰۲ء میں دستبردار ہوئے۔ اقبال کے دیگر رشتہ داروں کو اِن روایات کے قبول کرنے میں تردّد ہے اور اِن میں خود شیخ

عطا محمد کی نسل بھی شامل ہے۔ مثلاً اُن کے نواسے خالد نظیر صوفی اصرار کرتے ہیں کہ وہ احمدی نہیں تھے۔ راقم الحروف سے ایک انٹرویو میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ تمام روایات، یہاں تک کہ شیخ عطا محمد کی احمدیت کی روایت بھی، اعجاز احمد کے حسنِ عقیدہ کا اعجاز ہے۔ شیخ عطا محمد کے متعلق اُن کا خیال ہے کہ وہ بیٹے کے لحاظ میں خاموش رہتے تھے اور اُس کے سامنے اپنے احمدی نہ ہونے پر اصرار نہیں کرتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ایک دلچسپ روایت ملفوظاتِ اقبال میں اقبال کی زبانی بیان کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مرزا غلام احمد نے جب نیا نیا الہام کا دعویٰ کیا تو وہ سیالکوٹ کی مسجد میں اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ ایک روز اقبال بھی پہنچ گئے اور کہا کہ مجھے بھی الہام ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے سننے پر رضامندی ظاہر کی تو انہوں نے عربی میں احمدیت کے خلاف کچھ فقرے جوڑ کر پیش کر دئے جس پر وہ ساری جماعت اِن کے خلاف ہو گئی اور انہیں جان بچا کر بھاگنا پڑا۔

بظاہر تو یہ شرارت اقبال کے مزاج کے عین مطابق معلوم ہوتی ہے مگر اسے درست تسلیم کرنے میں قباحتیں ہیں۔ اول تو یہ کہ مرزا غلام احمد نے الہام کا دعویٰ ۱۸۸۰ء میں کیا تھا اور اگر بالفرض اقبال کی تاریخ پیدائش ۱۸۷۳ء بھی مان لی جائے تو اُس وقت اُنکی عمر سات سال بنتی ہے۔ ۱۸۷۷ء کے لحاظ سے تو وہ صرف تین برس کے ہوئے۔ دُوسری بات یہ ہے کہ مرزا غلام احمد کا سیالکوٹ میں قیام الہام کے دعوے سے بہت پہلے کی بات ہے۔ تیسرے، اگر مرزا غلام احمد اپنے معتقدین کے ساتھ بیٹھے تھے تو اُن میں بہت سے ایسے افراد شامل رہے ہوں گے جو اقبال کے لیے بزرگوں کا درجہ رکھتے تھے

مثلاً اُن کے اُستاد سیّد میر حسن کے چچا زاد بھائی میر حسام الدین جن کی مسجد میں اقبال نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا تھا اور حسام الدین کے بیٹے سیّد حامد شاہ جن سے ایک روایت کے مطابق اقبال نے انگریزی زبان کا پہلا سبق لیا تھا۔ اِن بزرگوں کی موجودگی میں اُس شخص کے ساتھ یوں شوخی سے پیش آنا جسے یہ حضرات اپنا رہنما مانتے تھے اور جس کی اُس وقت تک خود اقبال بھی عزت کرتے تھے (جیسا کہ اُن کے انجیلی والے مقالے سے ظاہر ہے) ایک ایسی بات ہے جو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔

۳۳

۳۴ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۳۲۔ اعجاز احمد کے بیان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ واقعہ کس زمانے کا ہے۔

۳۵ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۶۲۔ روایت پروفیسر محمد دین بھٹی۔

۳۶ ترجمہ ظ۔ انصاری (۱۹۸۳) سے مگر بعض جگہ لفظی ترمیم کی گئی۔ اصل فارسی اشعار یوں ہیں:

"بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدایہا شکایت می کند"
من نیم کز خود حکایت می کنم
از دمِ مردے روایت می کنم
از دمِ فیضے کز اُستاد آورم
خامہ را چوں نے بر فیاد آورم
نالۂ نے از دمِ مردے رہست
کام ہم از ساز و ہم از راز
آگہست

بر نوائے رازِ حق گر دل نہی

بایدت چوں نے زخود بودن تہی

گر نہ دل ریش از مستے ملاف

کیں می از اتندی بود پہلو شگاف

اے کہ از رازِ نہاں آگہ نہ

دم مزن از رہ کہ مردِ رہ نہ

دست در دامانِ مردِ راہ، زن

لیک رہبر را شناس از راہزن

در ہزاراں مردمردِ راہ یکیست

آدمی بسیار اما شہ یکیست

۳۷ ترجمہ ظ۔انصاری (۱۹۸۳) سے مگر بعض جگہ لفظی ترمیم کی گئی۔ اصل فارسی اشعار یوں ہیں:

در آنجا کہ از روئے فرہنگ

ورائے

بجا باشد ار خود نگوید جائے

جہت را دم خودنمائی نماند

زمان و مکاں را روائی نماند

غبار از نظر شد ز رہ ناپدید

سراپائے بینندہ شد جملہ دید

درآورد بے کلفت سمت و سوئے

بنور السمٰوات و الارض روئے

تماشا ہلاکِ جمالِ بسیط

فروغِ نظر موجۂ زاں محیط
شنیدن شہیدِ کلامی شگرف
منزہ ز آمیزشِ صوت و حرف
کلامے بِی نیرنگے ذات علم
شنیدن بہ عقل اندر اثباتِ علم

۴۸ نذیر نیازی (۱۹۷۹) ۔ص ۵۳۔ اُن کا ماخذ ہے رحیم بخش شاہین کی اوراقِ گم گشتہ میں سیّد محمد ذکی کا بیان، 'اقبال کا بچپن' ص ۲۶۶ اور ۲۶۷۔

باب ۴: گجرات کا قید خانہ

۱ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۳۷

۲ یہ تجزیہ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی (۱۹۸۳) کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔

۳ اقبال کی تاریخ گوئی پر محمد عبداللہ قریشی (۱۹۸۷) مفصل ہے۔

۴ کلیاتِ مکاتیبِ اقبال

۵ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۸۲ پر متفرق اشعار میں یہ شعر سرودِ رفتہ کے اِس نوٹ کے ساتھ درج ہے، ''اقبال کے ایک ہم وطن میر انجش صاحب جلوہ سیالکوٹی تھے جو عرضی نویسی کرتے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے اور انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اقبال نے یہ شعر بطورِ تفنن اُن کے لیے کہا تھا۔ جلوہ صاحب کا رنگ خاصا سیاہ تھا جس کی وجہ سے شعر اُن پر خوب چسپاں ہوا۔''

۶ سلطان محمود حسین (۱۹۸۶) ص ۱۴۸

۷ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۹۲

۸ دیکھیے باب ۷ میں شیخ عبدالقادر کا مضمون 'اقبال' مطبوعہ خدنگِ نظر (لکھنؤ) مئی ۱۹۰۲ء

۹ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۴۳

۱۰ اقبال کا مقالہ 'قومی زندگی' جو ۱۹۰۴ء میں ایبٹ آباد میں پڑھا گیا۔ مشمولہ:
عبدالواحد، سیّد محمد عبداللہ قریشی، مقالاتِ اقبال

۱۱ محمد عبداللہ چغتائی۔ ۱۹۷۷۔ ص ۲۶۔ روایت سیّد ذکی شاہ

۱۲ ایضاً

۱۳ نکاح کا مفصل احوال سلطان محمود (۱۹۸۶) میں دیکھیے۔

۱۴ دیکھیے باب ۷ میں شیخ عبدالقادر کا مضمون 'اقبال' مطبوعہ خدنگِ نظر
(لکھنؤ) مئی ۱۹۰۲ء

۱۵ شبلی نعمانی

۱۶ نذیر نیازی (۱۹۶۱) ص ۶۷۔۶۶

۱۷ عبدالقادر، دیباچہ بانگِ درا

۱۸ گیان چند (۱۹۸۸) ص

۱۹

۲۰ گیان چند (۱۹۸۸)، ص ۵۵ اور ۵۶ پر غزل موجود ہے۔ اُنھی کا خیال ہے کہ اخلاق کسی شخص کا نام معلوم ہوتا ہے مگر زمانہ متعین کرتے ہوئے سید نذیر نیازی (۱۹۷۹)، ص ۹۵ (۱۹۸۸ء کے ص ۶۷، باب ''ازدواج'') سے یہ مطلب اخذ کیا ہے، ''نذیر نیازی کے مطابق اقبال ۱۸۹۵ء اور ۱۹۰۰ء کے بیچ لاہور سے اکثر گجرات جایا کرتے تھے۔ تبھی یہ شعر کہا۔'' اس کی بنیاد پر انہوں نے بشیر احمد ڈار کی انوارِ اقبال ص ۳۱۳ کا یہ قیاس بھی تسلیم کرلیا کہ غالباً ۱۸۹۸ء میں گجرات والا شعر پڑھا۔ بشیر احمد ڈار نے صرف قیاس کیا ہے، سند نہیں دی ہے اور سید نذیر نیازی کے بیان میں بھی سقم ہے۔ وہ لکھتے ہیں، ''۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۰ء تک دورانِ ملازمت میں جب بھاٹی دروازہ میں

قیام تھا والدہ آفتاب اقبال ان کے ساتھ لاہور نہیں آئیں۔ سیالکوٹ ہی میں رہیں یا پھر گجرات اور گجرات سے سیالکوٹ آنا جانا رہتا۔ محمد اقبال بھی لاہور سے اکثر سیالکوٹ جاتے بلکہ گجرات بھی۔ اُسی زمانے کی ایک غزل ہے:

ہو گیا اقبال قیدی محفلِ گجرات کا
کام کرتے ہیں یہاں انسان بھی صیاد کا''

سید نذیر نیازی نے شعر کا دوسرا مصرع غلط لکھا ہے اگرچہ حوالہ روزگارِ فقیر حصہ دوم کا دیا ہے (مگر صفحہ نمبر کے بغیر) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یادداشت اور اندازے سے لکھ رہے تھے۔ نیز ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۰ء اقبال کا زمانہ ملازمت نہیں بلکہ زمانہ تعلیم تھا جس کے لیے وہ لاہور میں رہتے تھے۔ ملازمت بعد میں شروع ہوئی۔ نذیر نیازی نے بظاہر غزل کا زمانہ بھی اندازے ہی سے متعین کیا ہے مگر یہ بات نظر انداز کر گئے ہیں کہ اقبال شادی کے پہلے دو برسوں میں بھی سسرال جاتے تھے اور محفلِ گجرات کا قیدی ہونا اُس زمانے پر زیادہ صادق آتا ہے نہ کہ بعد کے زمانے میں جب لاہور جا بسے تھے۔ بہر حال بشیر احمد، نذیر نیازی اور گیان چند میں سے کسی نے غزل پر خصوصی توجہ دے کر یہ نہیں دیکھا کہ اتنی ناپختہ غزل قیامِ لاہور کے زمانے کی نہیں ہوسکتی جب مرزا ارشد سے داد مل رہی تھی۔ پھر اِس غزل کا قافیہ ردیف بھی نومبر ۱۸۹۳ء میں شائع ہونے والی غزل سے مشترک ہے۔

۲۱ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۱۸۶-۱۸۵۔ یہ چونکہ گیان چند کی مرتبہ ابتدائی کلامِ اقبال میں بھی شامل نہیں لہٰذا یہاں پوری درج کی جارہی ہے۔ عنوان تھا، 'مشہور پنجابی مثل ہے جیہا منہ تیٔ چپیڑ':

واہ سعدی دیکھ لی گندہ دہانی آپ کی

مہتروں میں خوب ہوگی قدردانی آپ کی
بیت ساری آپ کی بیت الخلا سے کم نہیں
ہے پسندِ خاکروباں شعر خوانی آپ کی
تیلیاں جاروب کی لیتے وہ خامہ کے عوض
کھینچتے تصویر گر بہزاد و مانی آپ کی
راہ اپنی چھوڑ کر نکلے دہن کی راہ سے
ہے مگر بادِ مخالف نغمہ خوانی آپ کی
ان دنوں کو فصلِ گل کہیے و یا دن پھول کے
ہر طرف ہوتی ہے سعدی گل فشانی آپ کی
آپ کے اشعار موتی ہیں مگر آبی کے بغیر
گوشِ عالم تک یہ پہنچے ہیں زبانی آپ کی
گوہرِ بے آب جھڑے ہیں آپ کے منہ سے سبھی
جان سے تنگ آ گئی ہے مہترانی آپ کی
ہر طرف سے آ رہی ہے یوں جو دُر دُر کی صدا
بھا گئی اہلِ سخن کو دُر فشانی آپ کی
آپ سے بڑھ کر عروضے کوئی دنیا میں نہیں
واہ صاحب شعر خوانی شعر دانی آپ کی
خاک کو ہم چاٹ کر یہ بات کہہ دیتے ہیں آج
تلخ کامی ہوگی یہ شیریں دہانی آپ کی
جب اُدھر سے بھی پڑیں گے آپ کو سابن

کے مول

آپ پر کھل جائے گی رنگیں بیانی آپ کی

کھاؤ گے فرمائشی سر پلپلا ہو جائے گا

پھر نکل جائے گی سر سے شعر خوانی آپ کی

دین اور ایمان کی دُم میں واہ نمدہ دے دیا

سارے عالم کی زباں پر ہے کہانی آپ کی

آفتابِ صدق کی گرمی سے گھبراؤ نہیں

حضرتِ شیطاں کریں گے سائبانی آپ کی

اشتہارِ آخری اِک آنت ہے شیطان کی

سر بسر جس سے عیاں ہے خوش بیانی آپ کی

وہ مثل ہے، ہے طویلے کی بلا بندر کے سر

ہو گیا ہم کو یقیں شامت ہے آئی آپ کی

خر کمہاروں کا مواتی ہوتی ہے مفت

ہے مگر قومِ نصاریٰ یارِ جانی آپ کی

رانڈ کے چرخے کی صورت کیوں چلے

جاتے ہیں آپ

اہلِ عالم نے سبھی بکواس جانی آپ کی

نیلے پیلے یوں نہ ہو پھر کیا کرو گے اس

گھڑی

جب خبر لیوے گا قہرِ آسمانی آپ کی

بات رہ جاتی ہے دنیا میں نہیں رہتا ہے

وقت

آپ کو نادم کرے گی بدزبانی آپ کی
قومِ عیسائی کے بھائی بن گئے پگڑی بدل
واہ کیا اسلام پر ہے مہربانی آپ کی

۲۲ ایضاً ص ۴۳

۲۳ ایضاً ص ۹۸

۲۴ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ان کا ماخذ ہے اقبال کی اپنی روایت منقولہ در رسالہ جوہر (دہلی) ۱۹۳۸ء

۲۵ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۲۲

۲۶ اقبال نے یہ واقعہ مثنوی اسرار و رموز کے حصے 'رموزِ بیخودی' میں نظم کیا ہے۔

۲۷

باب ۵: حکیموں کا بازار

۱ غلام بھیک نیرنگ کی روایت ہے، جریدہ اقبال (اکتوبر ۱۹۵۷) ص ۲۔ اقبالیات کے سو سال میں بھی شامل ہے۔

۲ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۴۲

۳ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۲۶، ۲۷۔ اعجاز احمد نے مقدمے کی تاریخ نہیں دی مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرور یہی زمانہ رہا ہوگا۔

۴ اِس غزل کے بارہ اشعار دستیاب ہیں جو گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۱۶-۱۱۵ پر موجود ہیں۔ اِس کا قدیم ترین ماخذ فقیر سید وحید الدین (۱۹۶۳ء) ہے چنانچہ اِس کا زمانہ معلوم نہیں ہو سکا مگر یہ داغ کی زندگی میں لکھی گئی ہوگی کیونکہ اِس کا مقطع ہے:

جنابِ داغ کی اقبال یہ ساری کرامت ہے

ترے جیسے کو کر ڈالا سخنداں بھی سخنور بھی

گیان چند نے اسے مخزن کے زمانے کی غزلوں کے درمیان رکھ دیا ہے مگر میرے خیال میں یہ بہت پہلے کی ہے کیونکہ نظمیں لکھنا شروع کرنے کے بعد یا اُس سے بھی پہلے اقبال نے داغ سے اصلاح لینا چھوڑ دی تھی جبکہ یہ غزل داغ کی شاگردی کے زمانے کی معلوم ہوتی ہے۔ پھر یہاں واعظ پر پھبتیوں میں کچا پن ہے مثلاً:

سچ کی کہہ رہا ہوں یاد ہو گی تجھ کو اے واعظ!
وہ خلوت اور اُس خلوت میں پھر آں کارِ دیگر بھی

۵ Muhammad Siddique

۶ غلام بھیک نیرنگ، میر (۱۹۵۹) ص ۲

۷ غزل روزگار فقیر کے حوالے سے گیان چند (۱۹۸۸) ص ۴۵ پر موجود ہے۔ نیرنگ کا بیان مجلہ اقبال، اکتوبر ۱۹۵۷ء ص ۴ پر اُن کے مضمون 'اقبال کے بعض حالات' سے ماخوذ ہے۔

۸ عبداللہ قریشی (۱۹۸۲) ص ۶۸

۹ عبداللہ قریشی (۱۹۸۲) ص ۵۱

۱۰ مشاعرے کی تاریخ کے بارے میں عرصہ تک اختلاف رہا ہے کہ یہ ۱۸۹۵ء میں منعقد ہوا یا ۱۸۹۶ء میں۔ ناظم اقبال اکادمی پاکستان جناب محمد سہیل عمر نے تصدیق کی ہے کہ ایک لائبریری میں رسالہ شورِ محشر کا دسمبر ۱۸۹۵ء کا پرچہ دیکھا گیا ہے جس میں مشاعرے کی تاریخ دسمبر ۱۸۹۵ء درج ہے۔

۱۱ دیکھیے باب ۷ میں شیخ عبدالقادر کا مضمون 'اقبال'، خدنگِ نظر (لکھنؤ) مئی ۱۹۰۲ء۔

۱۲ عبداللہ قریشی (۱۹۸۸)

۱۳ عبداللہ قریشی (۱۹۸۲) ص ۱۳۶

۱۴ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷)

۱۵ اعجاز احمد (۱۹۸۵)

۱۶ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۱۹۹۔ روایت لالو پہلوان

۱۷ معراج بیگم کا تذکرہ اقبال کی اکثر سوانح میں پایا جاتا ہے۔

۱۸ عبداللہ قریشی (۱۹۸۲) ص ۱۳۹

۱۹ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۵۱

۲۰ ایضاً

۲۱ غلام بھیک نیرنگ کی روایت ہے، جریدہ اقبال (اکتوبر ۱۹۵۷)۔ اقبالیات کے سو سال میں بھی شامل ہے۔

۲۲ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۴۴ پر اعداد کا حل تفصیلاً موجود ہے مگر قطعے میں اشعار کی تعداد کا گم شدہ اعداد کے ساتھ نظر انداز ہوا ہے۔

۲۳ عبداللہ قریشی (۱۹۸۲) ص ۷۰

۲۴ پوری غزل، نسیم اور تشنہ کا تعارف نیز دیگر تفصیلات گیان چند (۱۹۸۸) ص ۴۶ تا ۴۹ پر موجود ہیں۔

۲۵ دیکھیے عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) روایت احمد حسین خان

۲۶ اس کا صحیح زمانہ معلوم نہیں مگر گیان چند (۱۹۸۸) ص ۵۳ اور ۵۴ میں اسے مرزا ارشد والے مشاعروں کے زمانے میں رکھا گیا ہے۔ وہاں رافت کا تعارف بھی موجود ہے اور خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ جب رافت لاہور آ کر کچھ عرصہ پیسہ اخبار میں سب اڈیٹر ہوئے یہ غزل شاید اُس زمانے میں کہی گئی ہو اگرچہ رافت کے لاہور آنے کا زمانہ ٹھیک سے معلوم نہیں۔ اُس زمانے کے

اخبارات میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

۲۷ پوری غزل گیان چند (۱۹۸۸) ص ۵۸ پر موجود ہے۔ شیخ عبدالقادر نے لکھا ہے کہ اقبال سے اُن کی پہلی ملاقات جس مشاعرے میں ہوئی وہاں اقبال نے یہی غزل پڑھی تھی۔

۲۸ گیان چند (۱۹۸۸)، ص ۵۴ اور ۵۵ پر یہ غزل روزگارِ فقیر کے حوالے سے درج کی گئی ہے جس میں اس کا ماخذ شیخ اعجاز احمد کی بیاض ہے۔ اس کا زمانہ معلوم نہیں مگر گیان چند کے نزدیک "اشعار کے قدیم اور ناپختہ رنگ کی بنا پر یہ بھی ۱۸۹۷ء کے بعد کی نہیں ہوسکتی"۔

۲۹ اقبال پر طوائف کے قتل کے الزام کے سلسلے میں مفصل بحث کے لیے دیکھئے جاوید اقبال (۱۹۸۱) ص ۱۸۰

۳۰ گیان چند (۱۹۸۸ء) ص ۵۹ پر یہ غزل موجود ہے۔ مقطع سے پہلے کے شعر کا پہلا مصرع موجود نہیں جس کی وجہ سے اُن کا اندازہ ہے کہ یہ مصرعِ طرح ہوسکتا ہے "جس پر گرہ لگانے کا ارادہ ہو لیکن لگائی نہ گئی۔"

۳۱ یہ تینوں نظمیں گیان چند (۱۹۸۸) ص ۸۸-۸۳ پر موجود ہیں۔ عیشِ جوانی، ۴۵ اشعار کا قطعہ ہے جس میں شاعر نے گزری ہوئی جوانی کو یاد کرتے ہوئے وصال کے لمحات کا نقشہ کھینچا ہے اور 'بوس و کنار' کے قافیے کو اتنی بار استعمال کیا ہے کہ بیزاری ہونے لگتی ہے۔ آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اب بوڑھا ہو چکا ہے اور ناتوانی سے کروٹ بدلنا بھی ناگوار ہے۔ اس کے بارے میں خود گیان چند نے خیال ظاہر کیا ہے، "اقبال سے منسوب کرتے ہوئے تامل ہوتا ہے... لیکن 'در ایامِ جوانی چناں کہ اُفتد دانی' والا معاملہ ہے۔" اُنہوں نے کسی سند کے بغیر اسے اقبال کی نظم تین بنیادوں پر مان لیا ہے۔ پہلی یہ کہ اقبال نے ایک اور متروک قطعے 'ہم نچوڑیں گے دامن'

میں بھی عورت کے سراپے کی تصویر کشی کی ہے۔ یہ موقف تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ کبھی نہ کبھی اقبال کی شاعری میں بھی جنس کا اثر جھلکا ہوگا اور ایسی کوئی چیز ملے تو اُسے تبرک سمجھا جائے مگر ایسی چیز 'ہم نچوڑیں گے دامن' تو ضرور ہے کیونکہ اُس میں ذہانت جھلکتی ہے، 'عیشِ جوانی' صرف جنس زدہ ہی نہیں بلکہ اس میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچنے کے لیے جس قدر بے لطف انداز اختیار کیا گیا ہے وہ اقبال کے فطری رجحانات سے کسی زمانے میں بھی میل نہیں کھاتا تھا۔ گیان چند کی دوسری دلیل یہ ہے، ''عام طور سے قطعے میں مطلع نہیں ہوتا لیکن اقبال نے اپنی کئی نظموں میں ایسا کیا ہے مثلاً 'شمعِ زندگانی' میں۔ یہی ہیت دوسری نظم 'گلِ خزاں دیدہ' کی ہے۔'' یہ دلیل کافی نہیں ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جن دو نظموں کا خاص طور پر حوالہ دیا ہے یعنی 'شمعِ زندگانی' اور 'گلِ خزاں دیدہ' خود اُن دونوں کے اقبال کی نظمیں ہونے کی سند نہیں ہے۔ تیسری دلیل ہے، ''آخری شعر میں 'خندۂ گل' کا موضوع بھی اقبال پن لیے ہوئے ہے'' مگر بلبل کے کاروبار پر خندہ ہائے گل تو غالب کے یہاں کے بھی ہیں۔

اِس نظم کا قدیم ترین ماخذ جو مولف کو بالواسطہ دستیاب ہوا وہ نیچرل شاعری ہے جو ۱۹۰۸ء اور ۱۹۲۴ء کے درمیان کسی وقت لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اس کے مرتب صفدر مرزاپوری کی بے توجہی کا اندازہ گیان چند کی اس بات سے لگایا جا سکتا ہے، ''اس میں ڈاکٹر اقبال ایم اے اور مسٹر اقبال ایم اے بیرسٹرایٹ لا کے نام سے حسبِ ذیل نظمیں شامل ہیں...'' گویا کتاب میں ایک ہی شاعر کا نام الگ الگ جگہوں پر الگ الگ اعزازات کے ساتھ درج ہے اور لطف یہ ہے کہ دونوں جگہ غلط یعنی ''ڈاکٹر اقبال ایم اے'' جبکہ کسی نے صرف ایم اے کیا ہو تو وہ ڈاکٹر کیسے کہلائے گا اور ''مسٹر اقبال ایم

اے بیرسٹر ایٹ لا' تاریخی اعتبار سے غلط کیونکہ اقبال بیرسٹر بننے سے پہلے پی ایچ ڈی کر کے ڈاکٹر بن چکے تھے۔ جس مرتب کی بے توجہی کا یہ حال ہو اُس کی سند پر ایک بالکل نئی نظم کو اقبال سے کیونکر منسوب کر لیا جائے۔

دوسری نظم 'گلِ خزاں دیدہ' میں بھی دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ ایک پھول کی زبان سے کھینچا گیا ہے جو کبھی جوان تھا اور اب نہیں ہے۔ بظاہر یہ نظم اُسی شاعر نے لکھی ہو گی جس نے 'عیشِ جوانی' لکھی تھی اور کسی سند کے بغیر اس شاعر کو اقبال تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نظم بھی صفدر مرزاپوری کے مجموعے نیچرل شاعری سے لی گئی ہے جہاں اس کا ماخذ درج نہیں کیا گیا۔

تیسری نظم 'شمعِ زندگانی' کے بارے میں گیان چند خود لکھتے ہیں، ''یہ نظم محض باقیات [یعنی باقیاتِ اقبال] طبع سوم میں ص ۲۲۹ م ۲۲۸ پر ہے۔ مرتب نے اس کا ماخذ نہیں دیا تا کہ اقبال سے اس کے انتساب کے بارے میں مزید یقین ہو جاتا۔ ویسے شمع سے خطاب کرنا اقبال کو بہت مرغوب ہے۔ اس نظم میں شاعر موت آنے پر گڑگڑا کر کہہ رہا ہے کہ چندے اور دُنیا میں رہنے دے۔ یہ خیال اقبال کے مسلک کے بالکل برعکس ہے۔ نظم کا زمانہ معلوم نہیں لیکن اس کی ذہنی افتاد کے پیشِ نظر یہ ابتدائی دور ہی کی ہو سکتی ہے۔'' میرے خیال میں یہ اقبال کے کسی دور کی بھی نہیں ہو سکتی اور شمع سے خطاب کرنا اقبال ہی کو نہیں اکثر شعرا کو مرغوب تھا مگر جس نوعیت کا یہ خطاب ہے وہ اقبال سے بعید ہے۔ ویسے اس میں خطاب شمع سے نہیں بلکہ 'شمعِ زندگانی' سے ہے اور اقبال نے زندگی کو عموماً شمع نہیں بلکہ شرار یا شعلے سے تشبیہ دی ہے۔ ان دونوں باتوں میں لطیف فرق ہے۔ گیان چند نے اسماعیل میرٹھی کی نظم 'شمعِ ہستی' کو بھی اقبال کی سمجھ لیا اور شائد اسی وجہ سے تامل کے باوجود اس نظم کے بارے میں بھی باقیاتِ اقبال کا دعویٰ تسلیم کر

بیٹھے۔

۳۲ غلام بھیک نیرنگ کی روایت ہے، جریدہ اقبال (اکتوبر ۱۹۵۷) ص ۲۔ اقبالیات کے سو سال میں بھی شامل ہے۔

۳۳ اس غزل کا زمانہ معلوم نہیں۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۵۷-۵۶ پر اس کے رنگ کی وجہ سے اِسے لاہور میں طالب علمی کے زمانے میں رکھا گیا ہے۔

۳۴ اِس غزل کا زمانہ معلوم نہیں۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۵۷ پر اِسے اس کے رنگ کی بنا پر لاہور میں طالب علمی کے زمانے میں رکھا گیا ہے۔

۳۵ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۵۱-۴۹

۳۶ عبداللہ قریشی (۱۹۷۷) ص ۵۴ روایت جمشید راٹھور

۳۷ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۱۸۱۔ روایت پروفیسر منظور احمد (اقبال کے بھانجے)

۳۸ Muhammad Siddique

۳۹ سلطان محمود حسین (۱۹۸۱) ص ۷۶

۴۰ Muhammad Siddique

۴۱ Javid Iqbal, ed. (1962/2006)

۴۲ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۵۳-۵۱۔ بعض مصنفین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ مردِ مومن اور خودی والے اشعار اقبال نے ۱۹۱۵ء کے بعد اضافہ کیے ہوں گے۔ بظاہر اس قیاس آرائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ دونوں الفاظ یہاں اُن معانی میں استعمال نہیں ہوئے ہیں جو ۱۹۱۵ء کے بعد اقبال نے اِن الفاظ کو پہنائے تھے۔ یہاں تو خودی والے شعر میں بھی حسینوں سے چھیڑ چھاڑ ہی نظر آتی ہے۔ مردِ مومن کے تبسم والی بات تصوف کا ایک روائتی

نظریہ ہے جسے بعد میں اقبال نے فارسی میں دوبارہ نظم کر کے اور زیادہ مشہور کر دیا۔غزل کا کوئی اوّلین نسخہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے یہ شبہات پیدا ہوئے۔

۴۳ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷)ص ۴۴۔

۴۴ گیان چند (۱۹۸۸)ص ۸۱ پر متفرق اشعار میں درج ہے۔مولف کا خیال ہے کہ یہ ابتدائے عمر کا ہوگا کیونکہ اس میں بھی نام پر اُسی قسم کا فخر جھلکتا ہے جیسا اُس مشہور واقعے میں جب اقبال نے دیر سے اسکول پہنچے پر کہا تھا کہ اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے۔میرے خیال میں ضروری نہیں کہ اسے بالکل ہی اسکول کے زمانے کا شعر سمجھا جائے البتہ طالب علمی کے کسی بھی دور کا اور انجمن حمایتِ اسلام سے پہلے کا ضرور معلوم ہوتا ہے۔البتہ باقیات اقبال کے حوالے سے گیان چند (۱۹۸۸)ص ۸۲ پر ایک شعر درج ہے:

رومال کے لباس میں ابر آ کے بارہا
پانی پیا کیا مری چشمِ زلال سے

غالباً یہ شعر اقبال کا نہیں کیونکہ مخزن اکتوبر ۱۹۰۲ءص ۵۶ پر 'پھکول' کے تحت باعنوان شائع ہوا ہے۔پسند کرنے والے کا نام عبدالغفور پوپلزئی تھا۔ پچھلے اشعار امیر مینائی کے تھے۔ممکن ہے غلطی سے یہ شعر باقیاتِ اقبال کے مرتب نے شامل کر لیا ہو۔اس کے علاوہ مخزن میں دوسرا مصرع یوں ہے:

پانی پیا کیا مری چشمِ پُر آب سے

۴۵ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷)ص ۴۲۔روایت ذکی شاہ

۴۶ آفتاب اقبال کی تاریخ پیدائش متعدد کتابوں میں درج ہے۔

۴۷ اعجاز احمد (۱۹۸۴)ص ۱۳۶

۴۸ غلام بھیک نیرنگ کی روایت ہے، جریدہ اقبال (اکتوبر ۱۹۵۷)۔

اقبالیات کے سو سال میں بھی شامل ہے۔

۴۹ ایضاً ص ۲۷

۵۰ ایضاً ۲۸

۵۱ عبداللہ قریشی (۱۹۸۲) ص ۷۸

۵۲ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۹۷۔ روایت خواجہ فیروزالدین بیرسٹر

۵۳ دیکھیے باب ۷ میں شیخ عبدالقادر کا مضمون 'اقبال' مطبوعہ خدنگِ نظر (لکھنؤ) مئی ۱۹۰۲ء

۵۴ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۵۷

۵۵ حنیف شاہد (۱۹۷۲) ص ۱۰۹

۵۶ حسن اختر (۱۹۸۸) اور دوسرے

۵۷ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۱۷، روایت ذکی شاہ۔ انہوں نے ۱۸۹۵ء بتایا ہے جو یادداشت کی غلطی ہے۔ لاہور میں اجلاس ۱۸۹۸ء میں ہوا تھا۔

۵۸ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۱-۲۰ پر غزل موجود ہے۔ زمانہ معلوم نہیں مگر ۱۹۰۰ء سے پہلے کلام میں رکھی ہے کیونکہ غزل کی ردیف ''گویا'' کئی اشعار میں بالکل حشو ہے، مثلاً:

بے حجابی بھی ہے تو ایسی ہے
جس میں پردے کی شان ہے گویا

گیان چند کا خیال ہے کہ ''یہ زمیں آسمان ہے گویا'' مصرعِ طرح ہوسکتا ہے۔ انہوں نے بشیر الحق دیسنوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ پہلا شعر جون ۱۹۰۷ء میں گلدستہ اصلاحِ سخن کے پہلے شمارے میں مدیر کے اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوا کہ اقبال نے ایک مختصر سے غزل انہیں لاہور میں سنائی تھی جس کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔ مجھے مدیر کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔

۵۹ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۱۷۔ روایت ذکی شاہ

۶۰ گیان چند (۱۹۸۸ء) ص ۶۰ پر پوری غزل موجود ہے۔ زمانہ معلوم نہیں مگر انہوں نے ''اِس کے رنگ اور روزگار میں اِس کے وقوع کی بنا پر'' اِسے طالب علمی کے اخیر زمانے میں جگہ دی ہے۔ میں نے موقع کی مناسبت سے استعمال کیا ہے۔

باب ۶: مشرقی کالج کا استاد

۱ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۹۷

۲ ایضاً

۳ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۱۶۱

۴ ایضاً ص ۹۹

۵ ایضاً

۶ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۱۶۲

۷ متعدد، خصوصاً عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۹۷۔ روایت علی بخش

۸ وحید الدین، فقیر سید (۱۹۵۰) ص ۱۰۰۔ اقبال کے ستار بجانے کے متعلق ایک روایت بعض دفعہ بیان کی جاتی ہے جس میں ایک سکھ دوست کے ساتھ پنجابی میں ذومعنی جملوں کا تبادلہ مثلاً سکھنی چاہیے اور سکھ دا ہے وغیرہ کا ذکر ہے۔ یہ دراصل کوئی عام لطیفہ معلوم ہوتا ہے جس میں کسی نے اقبال کا نام خوامخواہ ڈال دیا ہے کیونکہ اس روایت کے مطابق جب اقبال ستار بجانا سیکھ رہے تھے تو جاوید اقبال بھی موجود تھے جنہیں سکھ دوست نے مذاق میں شامل کرلیا۔ جاوید اقبال ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے تھے اور اُس زمانے میں اقبال ستار بجانا نہیں سیکھ رہے تھے بلکہ بجانا بھی ترک کر چکے تھے۔

۹ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۸۰ پر غزل موجود ہے۔ گیان چند نے اندازے سے

اس زمانے میں رکھا ہے اور میں نے موقع کی مناسبت سے استعمال کیا ہے۔

۱۰ سوامی رام تیرتھ کے حالات کے لیے دیکھیے گیان چند (۱۹۸۸) ص ۳۰۴ اور افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۹۷

۱۱ دیکھیے باب ۷ میں شیخ عبدالقادر کا مضمون 'اقبال'، خدنگِ نظر (لکھنؤ) مئی ۱۹۰۲۔

۱۲ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۸۱ پر پوری غزل موجود ہے۔ زمانہ معلوم نہیں۔ گیان چند نے اندازے سے اس زمانے میں رکھا ہے اور میں نے موقع کی مناسبت سے استعمال کیا ہے۔

۱۳ اعجاز احمد کا بیان جس کی خاندان کے باقی افراد تردید کرتے ہیں یہ ہے کہ اُن کے والد عطا محمد اس وقت تک احمدی ہو چکے تھے۔ اُن کے یہاں کوئی لڑکا نہ ہوتا تھا۔ انہوں نے مرزا صاحب سے دُعا کروائی جس کے نتیجے میں لڑکا ہوا اور اسی لیے اُس کا نام اعجاز احمد رکھا گیا۔ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۸۶ وغیرہ

۱۴ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۹۶

۱۵ حنیف شاہد (۱۹۹۷) ص ۸۶

۱۶ اس غزل کا زمانہ معلوم نہیں۔ گیان چند (۱۹۸۸)، ص ۵۸-۵۷ پر اِسے اس کے رنگ کی بنا پر اِس زمانے میں رکھا گیا ہے اور میں نے مقطع کو موقع کی مناسبت سے استعمال کیا ہے۔

۱۷ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۸۰ پر پوری غزل موجود ہے۔ اس کا زمانہ معلوم نہیں مگر مولف اس کے رنگ کی بنا پر اِسے اس زمانے میں رکھا ہے۔

۱۸ حسن اختر، ڈاکٹر ملک (۱۹۸۸) ص ۴۰

۱۹ دیکھیے باب ۷ میں شیخ عبدالقادر کا مضمون 'اقبال'، خدنگِ نظر (لکھنؤ)

مئی ۱۹۰۲ء۔

۲۰ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۱۳۴

۲۱ جاوید اقبال (۱۹۷۹) ص ۹۸

۲۲ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۶۹-۷۱ پر نظم موجود ہے اور جلسے کی کیفیت وغیرہ بھی۔

۲۳ یہ گوپی چند نارنگ کے معروضات ہیں۔ دیکھیے ان کا مضمون 'اقبال کی شاعری کا صوتیاتی نظام' مشمولہ بشیر فاروق (۱۹۹۳) ص ۵۱

۲۴ حنیف شاہد (۱۹۹۷) ص ۸۲ بحوالہ سالانہ رپورٹ اورینٹل کالج ۱۹۰۰ء

۲۵ مقالے کا بہت سا حصہ اقبال کے پی ایچ ڈی کے مقالے *The Development of Metaphysics in Persia* میں شامل ہوا۔

۲۶ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۷۳-۷۹ پر نظم موجود ہے۔ مولف نے رائے ظاہر کی ہے، ''حیرت ہے کہ اقبال جیسے شاعر کو اتنا حجاب کیوں تھا کہ خاص موقع کے لیے لکھی ہوئی نظم جلسے میں نہ سنا سکے، بالخصوص اس صورت میں جب کہ ایک اور شاعر نے نظم سنائی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ احمد حسین خاں کی نظم شاعرانہ اعتبار سے بہتر تھی جس کی وجہ سے اقبال نے اُس وقت اپنی نظم کو پی جانا مناسب سمجھا ہو[؟]''

۲۷ B.A. Dar (1967), p.36

۲۸ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۷۶ پر غزل کے تین اشعار اور یہ مصرع درج ہے جس کی چستی کی وجہ سے گیان چند کا خیال ہے کہ یہ کسی مشاعرے کا مصرع طرح ہے۔ زمانہ معلوم نہیں مگر گیان چند نے اندازے سے اِسے اس زمانے میں رکھا ہے۔

۲۹ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۸۰-۷۹ پر غزل موجود ہے۔ چار اشعار ہی دستیاب ہوئے ہیں اور زمانہ معلوم نہیں۔ گیان چند نے اندازے سے اس زمانے میں رکھی ہے اور عبداللہ قریشی کی معاصرین اقبال کی نظر میں، ص ۳۰ کے حوالے سے لکھا ہے کہ عبداللہ قریشی کے بموجب مقطع شاید اُس زمانے کا ہے جب داغؔ نے اپنے شعر میں اُردو پر اجارہ داری کا دعویٰ کیا تھا۔

۳۰ حنیف شاہد (۱۹۹۷) ص ۸۲

۳۱ گیان چند (۱۹۸۸)، ص ۷۹-۷۷ پر قطعاتِ تاریخ موجود ہیں۔

۳۲ عبداللہ قریشی (۱۹۸۷) ص ۳۵

۳۳ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷)

۳۴ جہاں تک میں معلوم کر سکا ہوں اس نظم کا اولین متن بانگِ درا ہی میں دستیاب ہے جہاں اقبال نے اسے پہلے حصے یعنی ۱۹۰۵ء تک کی نظموں میں رکھا ہے۔ ممکن ہے کہ درسی کتابوں کے لیے جس زمانے میں 'ہمدردی' وغیرہ لکھی تھیں اُسی زمانے میں اقبال نے یہ نظم بھی لکھی ہو۔ مجھے اس بارے میں بھی کوئی شواہد نہیں مل سکے ہیں کہ بانگِ درا کی اشاعت سے پہلے یہ نظم کتنی مقبول تھی لیکن عام تاثر یہی ملتا ہے کہ اسکولوں میں یہ نظم گانے کا رواج شائد اُس سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔

۳۵ یہ رائے پروفیسر کرار حسین صاحب نے اپنی ایک تقریر میں پیش فرمائی۔

باب ۷: ہمالہ

۱ حسن اختر (۱۹۸۸) ص ۵۹

۲ فقیر سید وحید الدین (۱۹۶۳) ص ۱۲۶

۳ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۱۰۵

۴ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۱۶۳

۵ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۹۸

۶ 'ہمالہ' گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۰۹-۱۰۶ پر موجود ہے۔ مولف کو مخزن کا شمارہ دستیاب نہ تھا لہٰذا رختِ سفر میں سے اولین متن کو تلاش کیا اور اُس کا موازنہ بعض دوسرے متون کے ساتھ کیا۔ چونکہ اِن دوسرے متون کا ماخذ بھی صرف مخزن ہی ہوسکتا تھا لہٰذا میرے خیال میں صرف مخزن کے متن کو نظم کی پہلی صورت جان کر اُس کا موازنہ بانگِ درا کے نظرِ ثانی شدہ متن سے کرنا چاہیے۔ باقی متون نظر انداز کیے جا سکتے ہیں کیونکہ ان میں جو فرق ہیں وہ اختلافِ نسخ نہیں بلکہ نقل کی اغلاط ہیں۔

میں نے مخزن کا شمارہ دیکھا ہے۔ بانگِ درا سے اس کا موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء میں بانگِ درا ترتیب دیتے ہوئے اقبال نے نظم میں تین طرح کی تبدیلیاں کیں:

i بعض مصرعوں کی جگہ اُن سے بہتر مصرے رکھ دیے۔ مثلاً ''کوثر و تسنیم کی مانند لہراتی ہوئی'' کی جگہ ''کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی'' رکھ دیا جس سے کوثر و تسنیم کا مقام بھی بلند ہو گیا اور اسی اعتبار سے ندّی اور خود شاعر کا بھی۔

ii بعض مصرعوں میں لفظی ردّوبدل کر کے انہیں بہتر بنا دیا۔

iii بعض بند نکال دیے مثلاً بدھ مذہب والے بند نکالنے کی وجہ نظریاتی نہ تھی کیونکہ بدھ مذہب کا تذکرہ دوسری جگہوں پر اور بعد کی شاعری میں بڑی آب و تاب کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ 'ہمالہ' بانگِ درا کی پہلی نظم بننے جا رہی تھی، شائد اس لیے بھی اِس میں کسی مخصوص مذہب کا ذکر کرنے کی بجائے صرف آغازِ جستجو کی کیفیت دکھانی مقصود ہو گئی تھی۔ اِس سے نظم کی وحدت بھی زیادہ نمایاں ہو گئی۔

ذیل میں بانگِ درا والا متن نقل کیا جا رہا ہے تاکہ موازنہ کیا جا سکے:

ہمالہ

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لیے

امتحان دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو، دیوار ہندستاں ہے تو
مطلع اوّل فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو
سوئے خلوت گاہ دل دامن کش انساں ہے تو
برف نے باندھی ہے دستار فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہ مہر عالمتاب پر

تیری عمر رفتہ کی اک آن ہے عہد کہن
وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرم سخن
تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن
چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیال ہے
دامن موج ہوا جس کے لیے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوار ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برق سر کہسار نے

اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی، جسے
دست قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے

ہائے کیا فرط طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیل بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

جنبش موج نسیم صبح گہوارہ بنی
جھومتی ہے نشہ ہستی میں ہر گل کی کلی

یوں زبان برگ سے گویا ہے اس کی خامشی
دست گل چیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنج خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

آئنہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراق دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلی شب کھولتی ہے آ کے جب زلف رسا
دامن دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا

وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

اے ہمالہ! داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

۷ 'مزدور کا خواب' نامکمل متروک نظم ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۳۸-۲۳۹ پر فقیر سید وحید الدین (۱۹۶۳ء) سے شامل کی گئی ہے۔ اِس کا زمانہ معلوم نہیں مگر گیان چند نے اندازاً سے یورپ سے قبل کی نظموں میں ۱۹۰۴ء کے زمانے میں رکھا ہے۔ مجھے یہ اُس سے پہلے کی معلوم ہوتی ہے۔ بعد میں اقبال نے اِس ہیئت کے تجربے 'حسن و عشق' (۱۹۰۷) اور 'ابی سینیا' (۱۹۳۶) وغیرہ میں کیے۔

۸ دیکھیے حاشیہ ۱

۹ 'طلوعِ اسلام' اور 'مسجدِ قرطبہ' کے ہر بند میں آٹھ آٹھ شعر ہیں بلکہ 'مسجدِ قرطبہ' میں تو بند بھی آٹھ ہیں (باربرا مٹکاف نے ایک مقالے میں اِس نظم کی ساخت اور فنِ تعمیر کے درمیان موازنہ کر کے اِس قسم کے پہلوؤں کی افادیت واضح کی ہے)۔ 'ذوق و شوق' کے ہر بند میں چھ اشعار ہیں اگرچہ اصل مسودے میں اس سے کہیں زیادہ اشعار تھے جن کی قطع و برید کے بعد اقبال نے ہر بند کے لیے صرف چھ شعر منتخب کیے۔ اِس کے برعکس بعض ترکیب بند نظموں میں یہ چیز پیشِ نظر نہیں رکھی، مثلاً 'شمع و شاعر' اور 'خضرِ راہ' کے بند چھوٹے بڑے ہیں۔ میرے خیال میں یہ اتفاقاً نہیں بلکہ عمداً ہے ورنہ اگر 'ذوق و شوق' کے مسودے میں سے نصف کے قریب اشعار خارج کر

کے نظم کو ایک خاص ساخت کا پابند کر سکتے تھے تو 'شمع و شاعر' میں سے بھی اشعار خارج کیے جا سکتے تھے (اور ترمیم تو اُس میں بھی کی بھی گئی)۔

۱۰ Tony Rennel (2000/2001), *The Last Days of Glory*, p.1

۱۱ 'اشکِ خوں (یعنی ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ)' گیان چند (۱۹۸۸) ص ۹۵-۸۹ پر نظم موجود ہے۔ جس تعزیتی جلسے میں یہ نظم پڑھی گئی مولف نے اُس کی تاریخ غلام رسول مہر کے قیاس کے حوالے سے ۲۳ یا ۲۴ جنوری تسلیم کرکے رائے دی ہے، ''اُس میں اقبال نے اِتنا طویل مرثیہ پڑھا۔ دو ایک دن میں ۱۱۰ اشعار کی نظم لکھ دینا اُن کی زُود گوئی اور پُر گوئی کی دلیل ہے۔'' اقبال کی زُود گوئی کی اور مثالیں بھی موجود ہیں مگر یہ بات یقینی نہیں ہے کہ جلسے میں پورا مرثیہ پڑھا گیا اور اشاعت کے وقت کچھ اضافہ نہیں کیا گیا۔

۱۲ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۹۴

۱۳

۱۴ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۱۳۵

۱۵ 'پنجہ ٔ فولاد' گیان چند (۱۹۸۸)، ص ۱۰۶-۱۰۴ پر موجود ہے۔ کسری منہاس کے مضمون 'مورخینِ لاہور' نقوش لاہور فروری ۱۹۶۲ء ص ۹۹۹-۹۹۸ کے حوالے سے داغ کا لکھا ہوا قطعہ بھی درج ہے جس سے ۱۳۱۹ھ تاریخ نکلتی ہے:

ہوا ہے پنجۂ فولاد جاری
خریدارو نیا اخبار دیکھو
سنا دو مصرعِ تاریخ اے داغ
یہ لو اخبارِ جوہردار دیکھو

۱۶ ڈاکٹر اجمل خان نیازی (۱۹۹۰)، ص ۵۶

۱۷ عبدالقادر نے یہ واقعہ بانگِ درا کے دیباچے میں تحریر کیا ہے۔

۱۸ عبدالقادر نے یہ واقعہ بانگِ درا کے دیباچے میں تحریر کیا ہے۔

۱۹ عبدالقادر نے یہ بات بانگِ درا کے دیباچے میں تحریر کی ہے۔

۲۰ دیکھیے باب ۷ میں شیخ عبدالقادر کا مضمون 'اقبال'، خدنگِ نظر (لکھنؤ) مئی ۱۹۰۲ء۔

۲۱ مکتوب بنام کشن پرشاد

۲۲ اِس غزل کے سترہ اشعار گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۱۲-۱۱۱ پر موجود ہیں۔

۲۳ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۱۵-۱۱۳ پر اِس غزل کے سولہ اشعار موجود ہیں جو مختلف مجموعوں سے حاصل کیے گئے ہیں مگر مخزن جولائی ۱۹۰۱ء کا شمارہ گیان چند کی نظر سے نہیں گزرا۔ جن اشعار کو اقبال نے مخزن میں شائع نہ کروایا اُن میں تین مقطعے موجود ہیں جن میں سے آخری اور بے تکا مقطع جگن ناتھ آزاد کے مطابق مولانا صلاح الدین اور شورش کاشمیری کی بیاضوں میں تھا جس کے لیے مولف نے آزاد کے مضمون 'داغ کے اثرات اقبال پر' مشمولہ اقبالیات لاہور جولائی ستمبر ۱۹۸۶ء ص ۲۷ کا حوالہ دیا ہے:

نئی ہو پرانی ہو اقبال کو کیا

یہ حضرت تو بس ایک پی جانتے ہیں

یہ شعر اقبال کا ہو تب بھی امکان نہیں کہ ۱۹۰۱ء میں یا اُس کے بعد شائع کروایا ہو۔ معلوم نہیں ان بیاضوں میں کہاں سے آیا۔

۲۴ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۱۵ پر اِس غزل کے ساتھ اشعار موجود ہیں جو روزگارِ فقیر سے لیے گئے ہیں۔ زمانہ معلوم نہیں مگر گیان چند نے اس کے رنگ کی وجہ سے اِسے یہاں جگہ دی ہوگی۔ ''رموزِ اتحادِ حسن و عشق'' میں

خودی اور بیخودی کی اُس وحدت کے بیج موجود ہیں جسے بعد میں اقبال نے ایک باقاعدہ حکمت کے طور پر بیان کیا۔ حکمت بعد میں پیدا ہوئی مگر اُس کی جذباتی اَساس یہاں موجود ہے۔ آگے چل کر معانی نہیں بدلے بلکہ الفاظ بدل گئے۔

۲۵ 'گل رنگیں' گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۱۱-۱۰۹ پر موجود ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ مخزن مئی ۱۹۰۱ء کا شمارہ مولف کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ گل رنگیں وہی علامت ہے جو ترقی کر کے لالہ بن گئی۔ یہ علامت بعض ابتدائی غزلوں میں بھی موجود تھی مثلاً گیان چند (۱۹۸۸) ص ۵۶ پر نقل کیے ہوئے اس شعر میں:

بادہ کش ہے نگاہ گلشن میں
پھول ساغر، کلی گلابی ہے

۲۶ 'عہدِ طفلی' مخزن میں ص ۳۹-۳۸ پر شائع ہوئی اور گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۱۳-۱۱۲ پر موجود ہے۔ بانگِ درا میں صرف دو بند شامل کیے گئے اور کچھ ترمیم ہوئی جس سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اقبال شروع میں بھی اس کی ہیٔت سے مطمئن نہ رہے ہوں گے جس طرح 'ہمالہ' پر نظرِ ثانی کی ضرورت سمجھتے تھے مگر اُسے مخزن میں شائع ہونے دیا۔

۲۷ اس دور کی نظموں میں یہ تاثر صاف موجود ہے۔

۲۸ عبدالقادر نے یہ بات بانگِ درا کے دیباچے میں تحریر کی ہے۔

۲۹ بانگِ درا میں اشاعت کے وقت ''پرِ مرغِ تصور'' کی بجائے ''پرِ مرغِ تخیل'' کر دیا مگر لفظی ترمیمات کے سوا صرف ایک بند منسوخ کر کے اُس کی بجائے دوسرا بند لکھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظم کی بنیادی ہیٔت سے اقبال کافی مطمئن رہے ہوں۔ نظم کے منسوخ اور متداول متون گیان چند ۱۹۸۸ء

ص ۱۲۰-۱۱۹ پر موجود ہیں۔ نظم مخزن میں ستمبر ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی جس کا حوالہ آگے آئے گا۔

۳۰ 'ہم نچوڑیں گے دامن' گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۱۹-۱۱۸ پر اس وضاحت کے ساتھ موجود ہے، ''باقیات [باقیاتِ اقبال] میں اس کا ماخذ کشمیری گزٹ ستمبر ۱۹۰۱ء درج ہے۔ شروع میں ایک نوٹ ہے کہ اقبال نے ایک دوست کی فرمائش پر یہ نظم آٹھ دس منٹ میں کہی تھی۔''

۳۱ مثنوی عقدِ گوہر کے قطعاتِ تاریخِ طبع گیان چند (۱۹۸۸) ص ۷۹-۷۷ پر موجود ہیں۔ مولف نے کسریٰ منہاس کے مضمون 'اقبال اور تاریخ گوئی' مطبوعہ نقوش اقبال نمبر ستمبر ۱۹۷۷ء ص ۳۹۴ سے اقتباس دیا ہے، ''قیاسِ واثق ہے کہ مصنف نے پہلے ۱۳۱۷ھ و ۱۹۰۰ء کو اس کتاب کی تاریخ کے لیے احباب کو لکھا ہو اور بعد میں ۱۳۱۸ھ اور ۱۹۰۱ء کے لیے۔ احباب نے دونوں سنین کہ کر بھیج دیے ہوں گے۔''

۳۲ غلام بھیک نیرنگ کی روایت ہے، جریدہ اقبال (اکتوبر ۱۹۵۷) ص ۲۔ اقبالیات کے سو سال میں بھی شامل ہے۔

۳۳ عبداللہ قریشی (۱۹۸۸) ص ۲۵۰

۳۴ ایضاً

۳۵ یہ عام خیال ہے۔

۳۶ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۱۰۰

۳۷ ''لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لیے'' کے سات اشعار بانگِ درا میں شامل ہیں۔ منسوخ اشعار گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۲۱-۱۲۰ پر مختلف مجموعوں سے حاصل کر کے رکھے گئے ہیں مگر نومبر ۱۹۰۱ء کا مخزن مولف کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔

۳۸ 'ابر کہسار' ترمیم کے ساتھ بانگِ درا میں شامل ہے جہاں اس کے چار بند ہیں۔ منسوخ متن میں دس بند تھے جو گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۲۴-۱۲۱ پر موجود ہیں۔

۳۹ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۴۲ روایت ذکی شاہ

۴۰ حسن اختر، ڈاکٹر ملک (۱۹۸۸) ص ۱۵۱۔ مرتب نے بعض گمشدہ درسی کتب کی بازیافت سے اقبال کی چند نظموں خصوصاً 'ایک مکڑا اور مکھی' اور 'ہمدردی' کے اولین متون پر تحقیق کی ہے۔ نظم 'ہمدردی' کی مکمل ابتدائی صورت وہاں سے نقل کی جاتی ہے:

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا
بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
آنکھوں سے ٹپک رہے تھے آنسو
کہتا تھا کہ ہائے اب کروں کیا
کس طرح سے گھونسلے کو جاؤں
یہ شام یہ رات کا اندھیرا
پھیلی ہے یہ رات کی سیاہی
رستہ نہیں گھونسلے کا ملتا
افسوس مجھے سمجھ نہ آئی
اُڑنے چگنے میں دن گزارا
خورشید کے ڈوبنے سے پہلے
گھر مجھے چاہیے تھا جانا
بچے مرے دیر سے ہیں بھوکے
دے گا انہیں کون جا کے دانا

مر جائیں نہ وہ غریب ڈر کر
گر جائیں نہ گھونسلے سے باہر
بلبل نے کہا جو حال اپنا
جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے
کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری
میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل
چمکا کے مجھے دِیا بنایا
روشن ہیں جو پر مرے تو مجھ کو
آسان ہے راہ کا دکھانا
اوروں کے جو کام میں نہ آؤں
کس کام کا پھر مرا ہے جینا
بلبل کو اُڑا یہ کہہ کے جگنو
لے کر اُسے گھونسلے میں آیا
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

۴۱ عبدالواحد معینی (۱۹۶۳) ص ۳۴

۴۲ اقبال کی متروک نظم 'دین و دنیا' (۱۹۰۲ء) کے حوالے سے گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۵۳ پر درج ہے، "باقیات کے مختلف مجموعوں میں نوٹ کے مطابق جمسیٹ جی ایک پارسی تھا جس کا نیلام گھر اُس زمانے میں بہت مشہور

تھا۔۔جمسیٹ تخریب ہے جمشید کی۔اقبال نے اِس لفظ میں 'ے' کو حذف کر کے جم+سٹ باندھا ہے۔''اقبال کا شعر یہ ہے:

ایسے دینداروں سے تنگ آئے ہیں آخر کیا کریں

آج سنتے ہیں کہ جمسیٹ جی کے ہاں لیلام ہے

۴۳ گیان چند (۱۹۸۸)ص ۱۴۴-۱۴۳ کے مطابق خدنگِ نظر لکھنؤ کے جنوری ۱۹۰۱ء کے شمارے میں نظم 'شمع و پروانہ' کے ساتھ ادارتی نوٹ میں درج تھا کہ اقبال نے یہ نظم ''ہمارے اصرار پر نہایت ہی عجلت میں تصنیف فرمائی ہے۔۔۔''اس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ نظم چند ہفتے قبل لکھی ہو گی۔

۴۴ 'خفتگانِ خاک سے استفسار' گیان چند (۱۹۸۸)ص ۱۴۷-۱۴۴ پر موجود ہے مگر مولف نے فروری ۱۹۰۱ء کا مخزن نہیں دیکھا۔ بانگِ درا میں شامل کرتے ہوئے نظم میں بہت سی تبدیلیاں کی گئیں۔جو اشعار نکالے گئے اُن میں پہلے بند کے کچھ اشعار شامل تھے جن میں جھٹپٹے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے ایک کسان کا ذکر تھا جو کھیت سے کچھ گنگناتے ہوئے واپس آ رہا تھا۔ اِن اشعار کو حذف کرنا بھی بظاہر اُسی اصول کا تابع دکھائی دیتا ہے جس کے تحت ''ہمالہ'' میں سے بدھ مت والے اشعار نکالے ہوں گے یعنی ایک عمومی کیفیت بیان کرتے ہوئے کسی مخصوص شے کی تفصیل میں جانے سے تاثیر میں کمی ہو سکتی ہے۔اقبال کی ابتدائی شاعری میں اس قسم کی جزئیات جنہیں بعد میں حذف کرنا پڑا میتھو آرنلڈ کا اثر ہو سکتی تھیں جس کے بارے میں اقبال کا خیال تھا کہ وہ بہت "precise poet" ہے جبکہ اقبال طبعاً شاعری میں کسی قدر ابہام کے دلدادہ تھے جس کی وجہ سے گہرائی پیدا ہوتی ہے (یہ خیال انہوں نے اپنی نوٹ بک *Stray Reflections* میں ظاہر کیا ہے)۔

۴۵ 'اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں کو' گیان چند (۱۹۸۸) ص
۱۶۰-۱۵۴ پر موجود ہے۔ مولف نے عنوان کا آخری لفظ ''کو'' لکھا ہے لیکن
میں نے ''سے'' وجہ یہ ہے کہ اختلافِ نسخ کے حصے میں ص ۳۸۱ پر مولف خود
لکھتے ہیں، ''سرود و باقیات [سرودِ اقبال اور باقیاتِ اقبال] میں اس
نظم کا عنوان 'اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے' ہے جب کہ
نوادر [نوادرِ اقبال] میں آخری 'سے' کے بجائے 'کو' ہے۔ نوادر میں انجمن
کی روداد سے اس کے بارے میں جو اقتباس نقل کیا ہے اُس میں بھی نظم کے
نام میں 'کو' ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ یوں عام طور سے سرود کا متن صحیح
ہے اور نوادر میں اغلاطِ کتابت ہیں۔'' میں نے سرود کے متن پر اعتبار کیا کہ
یہ محاورے کے اعتبار سے بہتر بھی معلوم ہوتا ہے۔

۴۶ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۶۰ پر اس شعر کے حوالے سے درج ہے، ''اقبال
نے پہلی بار بانگِ درا کی ترکیب اِس نظم میں استعمال کی جو ۲۲ سال بعد اُن
کے مجموعے کا عنوان بنی۔'' مجموعے کا عنوان بھی اور ایک خاص استعارہ بھی
جو اِس کے بعد بار بار آتا رہا۔ اقبال نے ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ
میں اپنا جو کردار متعین کیا تھا یہ اُس کی طرف اشارہ تھا۔

۴۷ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷)

۴۸ شیخ اعجاز احمد جن کے مطابق شیخ نور محمد کسی زمانے میں احمدی جماعت سے
منسلک ہوئے تھے اُن کا بیان ہے کہ اس موقع پر تمام احمدی دوستوں نے
جنازے میں شرکت سے معذرت کر لی بلکہ نور محمد سے بھی توقع کی گئی کہ وہ
بیٹی کے جنازے میں شامل نہ ہوں مگر اُنہوں احمدی جماعت ہی سے تعلق ختم
کر لیا اور حامد شاہ کے ذریعے کہلوا بھیجا، ''میں عمر رسیدہ ہوں۔ آپ کے
ساتھ اس قدر تیز نہیں چل سکتا۔'' (اعجاز احمد [۱۹۸۴] ص ۱۸۵) دیگر

خاندانی روایتیں اس بات کی تردید کرتی ہیں کہ شیخ نور محمد کبھی احمدی جماعت سے منسلک ہوئے ہوں۔

۴۹ اِس بحث کے لیے دیکھیے گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۶۳، اور اعجاز احمد (۱۹۸۴) ۱۹۰

۵۰ 'خفتگانِ خاک سے استفسار' کے بارے میں گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۴۷ پر درج ہے، ''یہ نظم مخزن فروری ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔''

۵۱ انجمن کے سترھویں جلسے میں لاٹ صاحب اور ڈائرکٹر تعلیم تشریف لائے تھے۔ ان کے نام گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۴۹ پر درج ہیں۔

۵۲ عرفی شیرازی کا یہ شعر اقبال نے اپنے خطوط میں بھی درج کیا ہے اور اپنی شاعری میں اِس کی طرف دو قسم کے اشارے کیے ہیں۔ ایک وہ جن میں یہی مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے، 'رُوحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے' (بالِ جبریل) میں رُوحِ ارضی آدم سے کہتی ہے:

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

دوسری قسم کے مقامات وہ ہیں جنہیں اِس شعر کے مضمون پر بحث سمجھا جا سکتا ہے یعنی اُن میں اِس شعر کا جواب دیا ہے یا اِس کے مضمون سے کوئی دُوسرا نکتہ نکالا ہے۔ مثلاً غزل (بانگِ درا) کا یہ شعر:

کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے
جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے

اِسی طرح 'خضرِ راہ' (بانگِ درا) میں خضر، شاعر سے کہتے ہیں:

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دُوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک!

۵۳ مدرسے کے طالب علم کا بھیک مانگنا نیز اگلا واقعہ جس میں مولوی صاحب انگریزی کے خلاف وعظ کر رہے تھے اقبال نے 'دین و دنیا' میں نظم کیے تھے جو بانگِ درا میں شامل نہیں ہوئی مگر باقیات کے مختلف مجموعوں کے علاوہ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۵۴-۱۴۹ پر موجود ہے۔ وہیں نوادرِ اقبال سے انجمن حمایتِ اسلام کی ۲۲ فروری کی روداد کا اقتباس نقل کیا گیا ہے جس کے مطابق نظم میں جن واقعات کا ذکر ہے وہ حقیقتاً پیش آئے تھے۔ واقعاتی نظمیں جو بانگِ درا میں شامل ہیں اُن میں سے اکثر کے بارے میں شہادتیں موجود ہیں کہ وہ حقیقت پر مبنی ہیں مثلاً 'زہد اور رندی'، 'موٹر' اور 'سیر فلک' وغیرہ۔

۵۴ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۵۲ پر مولف نے رائے دی ہے، ''سچ تو یہ ہے کہ یہ نظم اقبال کے مرتبے سے گری ہوئی ہے۔ انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں وہ 'نالۂ یتیم' اور 'ایک یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے' جیسی نظمیں پڑھ چکے تھا۔ ۱۹۰۲ء میں دن کے جلسے میں گورنر کی قصیدہ خوانی اور رات کو ایسی تمسخرانہ نظم! اس میں بھرتی کے الفاظ اور تصنع آمیز قافیے تک لانے پڑے۔'' شعری حسن کی حد تک رائے درست ہے مگر مولف نے یہ بات نظر انداز کر دی ہے کہ اقبال کے ذہنی سفر میں یہ ایک نئے موضوع کے تعاقب کا آغاز معلوم ہوتا ہے اور کسی نئے کام کا آغاز کمال سے نہیں بلکہ کسی ناپختگی سے ہوتا ہے۔ مینجمنٹ سائنس کا عام کلیہ ہے کہ کسی ایک طریقے کے مطابق کام کرتے کرتے اچانک اُس سے بہتر طریق کار کو اپنائیں تو کارکردگی کا معیار ایک دم بہتر ہونے کی بجائے پہلے عارضی طور پر گرتا ہے اور اُس کے بعد پہلے سے بہتر ہو جاتا ہے۔

۵۵ سالک (۱۹۵۵) میں ہے (جسے گیان چند ۱۹۸۸ء ص ۱۵۴-۱۵۳ پر بھی

تبرکاتِ اقبال کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے)،"چوں کہ اس قطعہ میں بعض غلط قسم کے مولویوں کو کھری کھری سنائی تھیں اس لیے مولوی محبوب عالم (پیسہ اخبار) نے اِس قطعے کو چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اُس کے متعلق بھی ایک شعر میں اشارہ تھا... بعد میں 'محبوبانِ عالم' کی جگہ 'بیچارے حسینوں' کر دیا گیا۔" گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۵۴ پر مولف نے خیال ظاہر کیا ہے، "اگر ایسا ہوا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ سب اشعار ۲۲ فروری ۱۹۰۲ء کو پڑھے جانے والے متن میں نہیں ہوں گے بلکہ بعد کا اضافہ ہوں گے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ صدیقی پریس میں طباعت سے متعلق اشعار بھی جلسے کے بعد بڑھائے گئے ہوں گے یا مطبوعہ قطعے میں الگ سے شامل کر کے سنائے گئے ہوں گے۔" یہ اُن کا قیاس ہے، مجھے زیادہ قرینِ قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ صدیقی پریس والے اشعار بھی جلدی سے کہہ کر مطبوعہ میں شامل کر دیے گئے ہوں۔

۵۷ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۶۰-۱۵۹

۵۸ اِس غزل کے آٹھ شعر گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۱۷-۱۱۶ پر موجود ہیں۔ ماخذ فقیر سید وحید الدین (۱۹۶۳ء) ہے اور زمانہ معلوم نہیں۔ گیان چند نے اِسے اندازے سے ۱۹۰۱ء کی غزلوں میں رکھا ہے لیکن میرے خیال میں یہ اور اس سے اگلی غزل ("کسی کے ذکر کو سن کر تڑپ جانے کی باتیں ہیں" اور "یہ کس اُلجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے کی باتیں ہیں") ۱۹۰۲ء کے اوائل کی ہو سکتی ہیں جب اقبال بعض قسم کے واعظوں پر ناراض تھے۔ دونوں غزلوں میں مشقِ سخن کی پختگی ہے جسے گیان چند نے محسوس کیا ہو گا مگر ابھی تک واعظوں پر تنقید میں گہرائی نہیں آ سکی جس کی وجہ سے اقبال نے 'دین و دنیا' والے ہنگامے کے فوراً بعد اِن غزلوں کی اشاعت مناسب

نہ سمجھی ہوگی۔

۵۹ 'دین و دنیا' کا شعر ہے:

موچی دروازے میں ہیں فخرِ اطبائے زماں
اُن سے اُمیدِ شفا لیکن خیالِ خام ہے

اِس کے بارے میں گیان چند (۱۹۸۸)، ص ۱۵۳ پر درج ہے، ''موچی دروازے میں اقبال کے دوست زُبدۃ الحکما حکیم غلام نبی مشہور طبیب تھے۔ تبرکات [تبرکاتِ اقبال مرتبہٗ محمد بشیر الحق دیسنوی، دہلی ۱۹۵۹ء] کے مطابق یہ اُنہیں پر چوٹ تھی۔ اقبال نے اسے غلط قرار دیا۔ نقوش لاہور نمبر میں ان کے حالات ص ۸۱۹ پر دیے ہیں۔ ان کی چالیس کے قریب تالیفات ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں انتقال ہوا۔''

۶۰ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۱۷ پر غزل موجود ہے۔ زمانہ معلوم نہیں لیکن میرے خیال میں ۱۹۰۲ء میں 'دین و دنیا' کے قریب کے زمانے کی ہوسکتی ہے (تفصیل پچھلے حاشیے میں ملاحظہ ہو)۔

۶۱ اِس غزل کے تین اشعار گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۱۸-۱۱۷ پر موجود ہیں۔ زمانہ معلوم نہیں، میں نے موقع کی مناسبت سے شعر استعمال کیا ہے۔

۶۲ ''دل کی بستی عجیب بستی ہے'' گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۶۱ پر موجود ہے۔ بظاہر مخزن کا شمارہ مارچ ۱۹۰۲ء مولف کی نظر سے نہیں گزرا۔

۶۳ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۳۸۱ پر وحید کی کتابیات اور اقبال دانائے راز کے حوالے سے درج ہے کہ ۱۹ مارچ ۱۹۰۲ء کو پنجۂ فولاد جلد ۲ نمبر ۱۱ میں اقبال کی نظم 'زبانِ حال' شائع ہوئی جو انہوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں ۲۳ فروری ۱۹۰۲ء کو پڑھی تھی۔ مولف کا خیال ہے، ''چونکہ اس تاریخ کو انجمن کے اجلاس میں اقبال نے صرف یہی نظم پڑھی تھی اِس سے یہ

نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ پنجہ فولاد میں اسی کو 'زبانِ حال' کے نام سے چھاپا گیا ہوگا۔

۶۴ ''وہ وعظ اپنا کہے جائے ہوشیار ہوں میں'' والی غزل بانگِ درا میں شامل نہیں۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۶۷-۱۶۶ پر موجود ہے۔ اس کا زمانہ معلوم نہیں مگر مولف کی رائے ہے، ''ابتدائی دَور کی معلوم ہوتی ہے۔'' ابتدائی دَور سے اُن کی مراد یورپ روانگی سے پہلے کا دَور ہے لیکن میرے خیال میں یہ غزل عین اسی زمانے کی ہے جہاں مولف نے اسے رکھا ہے یعنی ۱۹۰۲ء کیونکہ اس میں عرصہ تقریر تنگ ہونے کا ذکر ہے:

کبھی نہ گوشِ ساعت سے شرمسار ہُوں میں
وہ راز ہُوں کہ زمانے پہ آشکار ہُوں میں

یہ دُشواری اُسی زمانے میں 'اسلامیہ کالج کا خطاب...' سے شروع ہوتی نظر آتی ہے۔ واعظ پر پھبتی والا جو شعر میں نے کتاب میں نقل کیا اُس میں بھی متانت آگئی ہے جس کی وجہ سے اسے 'دین و دنیا' سے ذرا بعد کی سمجھا جا سکتا ہے۔

۶۵ عبدالرؤف عروج (۱۹۸۸) ص ۱۸۷

۶۶ دیکھیے اسی باب میں شیخ عبدالقادر کا مضمون 'اقبال'، خدنگِ نظر (لکھنؤ) مئی ۱۹۰۲۔

۶۷ دیباچہ علم الاقتصاد

۶۸ دیباچہ علم الاقتصاد

۶۹ عبدالواحد معینی (۱۹۶۳) ص ۴۳

۷۰ بانگِ درا میں اس غزل کے پانچ اشعار موجود ہیں۔ وہیں سے گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۱۸ پر رکھی گئی ہے۔ زمانہ معلوم نہیں مگر مولف نے ''بانگِ درا میں اس کے وقوع کی بنا پر'' اسے ۱۹۰۱ء کی غزلوں میں جگہ دی ہے۔

میرے خیال میں یہ ۱۹۰۲ء میں 'دین و دنیا' سے شروع ہونے والی سوچ کے سلسلے میں پختگی آنے کا موقع ظاہر کرتی ہے، مثلاً:

عجب واعظ کی دینداری ہے یارب
عداوت ہے اُسے سارے جہاں سے

ایسی اچھی غزل کو اقبال نے مخزن میں شائع نہیں کروایا جس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ بلاوجہ جلتی پر مزید تیل نہ ڈالنا چاہتے ہوں گے کہ اُن کا مقصد مذہبی طبقے کو ناراض کرنا نہیں بلکہ اصلاح کرنا تھا۔

۷۱ شیخ عبدالقادر، 'اقبال'، خدنگِ نظر (لکھنؤ) مئی ۱۹۰۲۔ مشمولہ اقبالیات کے سو سال بحوالہ اقبال جادو گرِ ہندی نژاد مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۸۰ء

۷۲ بانگِ درا میں اِس نظم کے صرف آخری حصے کا مکالمہ 'عقل و دل' کے عنوان سے شامل ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۶۴-۱۶۱ پر نظم کا منسوخ متن موجود ہے۔ مولف نے لکھا ہے، ''نظم میں براہِ راست جوابیہ انداز نہیں'' مگر اِسے تو کسی نظم کی خامی نہیں بلکہ خوبی سمجھنا چاہیے۔ اُن کا یہ کہنا، ''اِس کے علاوہ نظم بالکل دولخت ہے'' کسی حد تک درست بھی ہے اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مکالمے کو نظم کا حصہ تسلیم نہیں کیا۔ بہر حال پچھلے برس کی نظموں کی ہیئت میں پختگی کے بعد اچانک اِس قسم کا کچا پن اسی بات کی دلیل ہے کہ اقبال کسی نئے خیال کے تعاقب میں نکلے تھے جسے کامیابی کے ساتھ بیان کرنے کے ذرائع ادبی روایت میں پہلے سے موجود نہیں تھے۔

۷۳ 'آفتابِ سحر' نظر ثانی کے بعد 'آفتابِ صبح' کے عنوان سے بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۶۶-۱۶۴ پر موجود ہے۔

۷۴ 'صدائے درد' نظر ثانی کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن

میں تین بند تھے اور اشعار کی تعداد ۴۹ تھی۔ یہ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۶۷-۱۷۰ پر موجود ہے۔ مولف کی رائے ہے، ''اشعار نمبر ۲۴ تا ۲۷ قابلِ توجہ ہیں جن میں صریحاً قوم کو مذہب پر ترجیح دی ہے'' (ان میں کچھ یہاں اقتباس میں شامل کیے گئے ہیں) مگر لفظ قوم اُس زمانے میں کئی معانی میں استعمال ہوتا تھا جن میں قبیلہ، مذہب، نسل، پیشہ وغیرہ میں سے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہاں اِسے قبیلے کے معانی میں استعمال کیا گیا ہے اور یہ انتہا پسند ہندوؤں کے مقابلے پر مسلمانوں کا دفاع ہے۔ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے مذہب کی اہمیت اقبال اس سے پہلے کئی نظموں میں بیان کر چکے تھے۔

۷۵ یہ غزل بانگِ درا میں شامل نہیں کی۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۷۰-۱۷۱ پر موجود ہے۔

۷۶ 'ماتمِ پسر' متروک نظم ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۷۲-۱۷۱ پر موجود ہے جہاں مخزن میں شائع ہونے والے نوٹ کے خلاصے سے شانِ نزول بھی بیان ہوئی ہے۔

۷۷ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۶۳ پر 'خطِ منظوم (پیغامِ بیعت کے جواب میں)' کے بارے میں درج ہے، ''اِسی عنوان سے پنجۂ فولاد لاہور ۱۴ جولائی ۱۹۰۲ جلد ۲ شمارہ ۲۷ میں شائع ہوئی۔''

۷۸ مکتوب بنام مسز اسٹراٹن۔ نیز افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۹۶

۷۹ عبداللہ قریشی (۱۹۸۸) ص ۹۸

۸۰ عبدالمجید سالک (۱۹۵۴) ص ۶۸

باب ۸: سورج کے سامنے

۱ صدیق (کیٹلاگ) کے مطابق یہ کتاب اقبال کی ذاتی کتب کے مجموعے میں

موجود تھی۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۷۷ پر مولف نے لکھا ہے، ''ڈاکٹر تاراچرن رستوگی نے مجھے اپنے مکتوب مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۸۶ء میں لکھا کہ اقبال نے میکس مولر کی تفسیر کا ترجمہ کیا ہے۔ میکس مولر نے سوریہ ناراین اُپنشد کا حوالہ دیا ہے جب کہ اس کا صحیح نام محض سوریہ اُپنشد ہے۔ اقبال نے نظم کے ساتھ لکھے ہوئے شذرات میں سوریہ نراین اُپنشد لکھا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اُن کا ماخذ میکس مولر ہے یہی وجہ ہے کہ اقبال کی نظم میں بہت سے حشویات ہیں خصوصاً آخری تین شعر بالکل غیر ضروری ہیں۔''

۲ 'آفتاب' کو بانگِ درا (حصہ اول) میں شامل کرتے ہوئے ''تیری نگاہ رشتۂ تارِ حیات ہے'' پر نظرِ ثانی کر کے ''تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے'' کر دیا گیا۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۷۷-۱۷۲ پر منسوخ متن اور دیگر تفصیلات موجود ہیں۔

۳ عبدالواحد معینی (۱۹۶۳) ص ۴۳

۴ یہ غزل بانگِ درا میں موجود ہے۔ زمانہ معلوم نہیں مگر بانگِ درا میں اِسے ''نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی'' والی غزل سے پہلے رکھا ہے۔ وہ مخزن میں جون ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی مگر گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۸۵ پر مولف کا اندازہ ہے کہ یہ غزل اُس سے پہلے کی نہیں لگتی: ''اِس کی پختگی اِس عقیدے کی منافی ہے۔ یہ واضح ہو کہ بانگِ درا میں ہر جگہ کلام تاریخی ترتیب سے درج نہیں کیا گیا۔ ہو سکتا ہے اقبال نے اِس غزل کا نقشِ اول جون ۱۹۰۱ء میں یا اُس سے پہلے تیار کیا ہو۔ بعد میں اِسے ترقی دے کر موجودہ شکل دے دی۔ نقشِ اول موجود نہیں ہے۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ چار شعر انتخاب ہیں۔ پوری غزل میں زیادہ اشعار رہے ہوں گے۔ یہ اشعار سب سے پہلے کہاں شائع ہوئے، معلوم نہیں۔'' چونکہ مولف کو محمد انور

خاں کی قلمی بیاض میں بھی یہی اشعار ملے تھے لہٰذا اُن کے خیال میں، ''کسی رسالے میں چھپے ضرور ہوں گے جہاں سے قلمی کلام کے مرتب نے نقل کیے'' مگر خود مولف کے بیان کے مطابق یہ بیاض ۱۹۲۴ء میں مرتب کی گئی (حرفِ اوّل، ص ۱۲) پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ اشعار کسی رسالے سے نہیں بلکہ بانگِ درا ہی سے اُس میں نقل کیے گئے ہوں؟

۵ عبدالرؤف عروج (۱۹۸۸) ص ۱۹۱

۶ یہ منسوخ غزل ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۸۱-۱۸۰ پر فقیر سید وحید الدین (۱۹۶۳ء) کے حوالے سے موجود ہے۔ زمانہ معلوم نہیں اور مولف نے اندازے سے یہاں رکھی ہے۔ آخری شعر جو میں نے نقل کیا اُسی مضمون کا شعر زبورِ عجم (۱۹۲۷) حصہ اول کی غزل نما نظم کا آخری شعر ہے۔

۷ 'شکریۂ انگشتری' منسوخ نظم ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۷۹-۱۷۷ پر نظم، خط اور دیگر تفصیلات موجود ہیں۔

۸ 'شمع' نظرِ ثانی کے بعد بانگِ درا میں شائع ہوئی۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۸۳-۱۸۱ پر منسوخ متن مختلف مجموعوں کے حوالے سے موجود ہے مگر غالباً مخزن دسمبر ۱۹۰۲ء کا شمارہ مولف کی نظر سے نہیں گزرا۔

۹ 'ایک آرزو' نظرِ ثانی کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۸۵-۱۸۳ پر مختلف مجموعوں کے حوالے سے منسوخ متن موجود ہے مگر غالباً مخزن کا دسمبر ۱۹۰۲ء کا شمارہ مولف کی نظر سے نہیں گزرا۔ نظرِ ثانی کے بارے میں اُن کی رائے ہے، ''بانگ میں چھاپتے وقت دُوسرا بند شاید اِس لیے حذف کیا گیا کہ اِس میں مختلف ملتوں کی ہم آہنگی پر زور دیا گیا جو اقبال کے بعد کے موقف کے منافی تھا۔'' مختلف

قوموں اور مذاہب کے درمیان ہم آہنگی تو اقبال کے کسی دور کے موقف کے بھی منافی نہیں ہوسکتی نہ ہی بانگِ درا کی ترتیب کے وقت اقبال اپنے ذہنی سفر کے کسی مرحلے پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے ورنہ بہت سی نظمیں سرے سے شامل ہی نہ کرتے۔ اِس نظم کے منسوخ اشعار پر نظر ڈالنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی وجہ سے نظم کی وحدت مجروح ہو رہی تھی اور اختصار کی وہ خوبی بھی پیدا نہیں ہوتی تھی جو اقبال کو فطری طور پر مرغوب تھی مگر جسے ابتدائی دَور میں وہ بعض اوقات اظہارِ مدعا کی خاطر نظر انداز کر جاتے تھے۔

۱۰ ''کہ اِس دیس میں راج ہے دشمنی کا'' والی غزل متروک ہے۔ اِس کے تین اشعار فقیر سید وحیدالدین (۱۹۶۳ء) کے حوالے سے گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۷۰ پر درج ہیں۔ زمانہ معلوم نہیں مگر مجھے اقبال کی بعد کی بیاضوں میں نہیں ملی اس لیے سفرِ یورپ سے پہلے کی تصور کرتے ہوئے موقع کی مناسبت سے استعمال کیا ہے۔ مولف کی یہ رائے محلِ نظر ہے، ''چونکہ یورپ سے واپسی کے بعد اقبال وطن کے لیے نہیں لکھتے تھے اس لیے تیسرے شعر [''خدا جانے کیا ہوا ہندیوں کو...''] میں ہندیوں کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ سفرِ یورپ سے قبل کی ہے۔'' اقبال نے بعد میں ہندوستان کے بارے میں لکھا، مثلاً بانگِ درا کے حصہ سوم میں ''ظریفانہ'' حصے کی غزل کا یہ شعر:

یا باہم پیار کے جلسے تھے، دستورِ محبت قائم تھا
یا بحث میں اُردو ہندی ہے یا قربانی یا جھٹکا ہے

۱۰ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) ص ۶۹۔ روایت پروفیسر محمد دین بھٹی

۱۱ ''عاشقِ دیدارِ محشر کا تمنائی ہوا'' متروک غزل ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص

۱۸۰-۹ ۱۷پر موجود ہے۔

۱۲ 'سید کی لوحِ تربت' ترمیم کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۸۹-۱۸۷پر موجود ہے۔

باب ۹: امیر کا صنم خانہ

۱ امیر بیگم کے حالات دیگر ماخذوں کے علاوہ جاوید اقبال (۱۹۸۱) اور افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) سے اخذ کیے گئے ہیں۔ دیگر ماخذوں کا حوالہ ان کی جگہ پر دیا گیا ہے۔

۲ عبداللہ قریشی ص (۱۹۸۸) ص ۵۵

۳ ''چاہیں اگر تو اپنا کرشمہ دکھائیں ہم'' والی غزل بانگِ درا میں شامل نہیں کی گئی۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۹۰پر موجود ہے۔

۴ عبداللہ قریشی ص (۱۹۸۸) ص ۵۵

۵ بانگِ درا کے لیے نظر ثانی کرتے ہوئے دو شعر خارج کر دیے گئے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۹۱-۱۹۰پر موجود ہے۔

۶ اقبال نے منشی سراج الدین کے نام مکتوب ۱۱ مارچ ۱۹۰۳ء میں امیر بیگم کو اشارتاً ''علتِ ابرِ گہربار'' لکھا۔ دیگر تفاصیل بھی انہی دنوں شروانی کے نام ایک خط میں بیان کیں جن میں امیر بیگم کا نام نہیں آتا چنانچہ بین السطور پڑھ کر میں نے یہ نتائج اخذ کیے ہیں۔

۷ 'ابرِ گہربار' گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۰۰-۱۹۱پر شامل ہے

۸ سالک (۱۹۵۵) ص ۲۴۶

۹ ''جسے دیکھتا ہوں وہی خوب رو ہے'' والی غزل بانگِ درا میں شامل نہیں۔ اِس کے آٹھ شعر گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۱۲ پر موجود ہیں۔ مولف نے ''اِس کے رنگ اور پختگی کی بنا پر'' اِسی زمانے میں رکھا ہے۔

۱۰ 'بلبل کی فریاد' کے نام سے ایک نظم مارچ ۱۹۰۲ء تک لکھی جا چکی تھی اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ وہی تھی جو نظرِ ثانی کے بعد 'پرندے کی فریاد' کے عنوان سے بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ اِس عنوان سے یہ سب سے پہلے مخزن میں فروری ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی جس کا متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۰۳-۲۰۱ پر موجود ہے۔ ۱۱ مارچ ۱۹۰۳ء کے خط میں منشی سراج الدین کو 'بلبل کی فریاد' بھیجتے ہوئے اقبال نے اُس نظم کی جو خصوصیات بتائیں اُن کے بارے میں مولف کی رائے ہے، ''یہ بیان نظم 'پرندے کی فریاد' پر بالکل چسپاں ہوتا ہے۔'' مولف نے ڈاکٹر سید حامد حسین کے مضمون 'علامہ اقبال کی بعض ماخوذ نظمیں' مجلّہ سفینہ یادگارِ اقبال جلد ہفتم ۸۱-۱۹۸۰ کے حوالے سے لکھا ہے، ''یہ اٹھارویں صدی کے انگریزی شاعر ولیم کوپر کی نظم

'On a Goldfinch Starved to Death in His Cage'

سے ماخوذ ہے۔'' بانگِ درا نے اقبال نے اِسے ماخوذ نہیں لکھا جس کی وجہ شائد یہی ہو کہ یہ نظم ولیم کوپر سے زیادہ مولانا روم سے قریب ہے اور مولانا روم کے فیض کا اعتراف اقبال بانگِ درا سے پہلے اسرار و رموز میں اس طرح کر چکے تھے کہ اس کا اطلاق بعد کے تمام مجموعوں پر ہوتا ہے۔ مولانا روم کی پرندے والی حکایت سے اِس نظم کے تعلق پر توجہ نہیں دی گئی حالانکہ اِس نظم میں مثنوی کے دوسرے شعر کا آزاد ترجمہ بھی موجود ہے۔ مثنوی میں بانسری فریاد کرتی ہے:

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

اقبال نے اِس کا آزاد ترجمہ یوں کیا ہے:

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے

دل غم کو کھا رہا ہے، غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اِسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سُننے والے
دُکھے ہوئے دِلوں کی فریاد یہ صدا ہے

ظاہر ہے کہ مثنوی میں جو بانسری کی فریاد ہے وہی پرندے کی بھی ہے کیونکہ وہاں دونوں ایک ہی چیز کی علامتیں ہیں۔

۱۱ یہ اشعار متروک ہیں۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۰۷-۲۰۶ پر فقیر سید وحیدالدین (۱۹۶۳ء) کے حوالے سے موجود ہیں۔ زمانہ معلوم نہیں مگر مولف نے اِس کے رنگ کو دیکھ کر اسے اسی زمانے میں رکھا ہے۔

۱۲ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۰۷ پر اس غزل کے تین اشعار فقیر سید وحیدالدین (۱۹۶۳ء) کے حوالے سے درج ہیں۔ زمانہ معلوم نہیں۔ مولف نے اس کے رنگ کو دیکھتے ہوئے اسے اسی زمانے میں رکھا ہے۔

۱۳ مکتوب بنام منشی سراج الدین، ۱۱ مارچ ۱۹۰۳ء

۱۴ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) روایت علی بخش

۱۵ ''لڑکپن کے ہیں دن صورت کسی کی بھولی بھولی ہے'' متروک ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۰۳-۲۰۴ پر موجود ہے اور شانِ نزول مخزن کے نوٹ کے خلاصے کی صورت میں درج ہے۔

۱۶ ''تُو نہاں مجھ سے مرے داغِ جگر کی صورت'' والی غزل متروک ہے۔ اس کے سترہ اشعار گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۱۰ پر مختلف مجموعوں سے اکٹھے کیے گئے ہیں۔ مخزن مئی ۱۹۰۳ء مولف کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔

۱۷ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۸۸

۱۸ 'اہلِ درد' متروک ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۰۸ پر موجود ہے۔

۱۹ 'ماں کا خواب' اور متن کی تفصیل گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۳۷-۱۳۶ اور

۳۷۶-۳۷۵ پر موجود ہے۔ بانگِ درا سے پہلے عبدالرزاق کی کلیاتِ اقبال میں بھی شائع ہوئی لیکن اس کا متن بانگِ درا کے مطابق ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ متروک اشعار جو روزگارِ فقیر اور باقیاتِ اقبال کے حوالے سے گیان چند نے شامل کیے ہیں، بانگِ درا سے پہلے ہی کسی مرحلے پر خارج ہو چکے تھے ورنہ عبدالرزاق کی کتاب میں بھی موجود ہوتے۔

۲۰ حسن اختر (۱۹۸۸) ص ۶۵

۲۱ ''نادرِ کاکوروی نے دُور سے دیکھا مجھے'' والی غزل متروک ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۲۰-۲۱۸ پر موجود ہے۔ یہ خدنگِ نظر لکھنؤ میں اگست ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی لہٰذا کچھ عرصہ قبل کہی گئی ہوگی۔

۲۲ انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر، مطبوعہ سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور (۱۹۹۰)، ص ۹۳ میں یہ تحریر شامل ہے مگر صرف سالِ اشاعت درج ہے، مہینہ اور ماخذ کا ذکر نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ صرف کسی ثانوی ماخذ سے حاصل کیا ہوا اقتباس ہو۔

۲۳ اعجاز احمد (۱۹۸۴) ص ۵۳ نیز گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۱۴

۲۴ حسن نظامی

۲۵ 'برگِ گل' متروک نظم ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۱۵-۲۱۱ پر موجود ہے۔ وہاں وضاحت ہے، ''یہ نظم سب سے پہلے ہفتہ وار وطن لاہور بابت ۲۰ جولائی ۱۹۰۳ء میں 'مناجات' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ وہاں تمہیدی نوٹ ہے، 'مناجات از شیخ محمد اقبال صاحب ایک اے اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج جو حضرت محبوب الٰہی کے مزارِ مقدس پر خواجہ حسن نظامی نے با آوازِ بلند پڑھی۔''

۲۶ ''عبادت میں زاہد کو مسرور رہنا'' والی غزل متروک ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۱۸-۲۱۷ پر مختلف مجموعوں کے حوالے سے موجود ہے۔ مولف نے عبداللہ قریشی کی تصنیف اقبال معاصرین کی نظر میں کے حوالے سے لکھا ہے، ''۱۹۰۳ء میں اقبال اور اُن کے دوست غلام بھیک نیرنگ دونوں نے غزلیں کہیں۔ نیرنگ کی غزل ع یہ شایاں ہے عاشق کا دستور رہنا، پنجۂ فولاد ۱۴ اکتوبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔''

۲۷ عبدالواحد معینی (۱۹۶۳) ص ۵۲

۲۸ حسن نظامی (۱۹۹۰) ص ۶۹

۲۹ دیکھیے مکتوب ۳۱ اگست ۱۹۱۸ء

۳۰ اقبال (۱۹۰۸ء) ص ۹۰۔ انگریزی میں بزمِ قدرت کے لیے ''ایکسٹرنل نیچر'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

۳۱ 'انسان اور بزمِ قدرت' نظر ثانی کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ پرانا متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۲۱-۲۲۰ پر موجود ہے۔ یہ مخزن ستمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔

۳۲ 'شیشۂ ساعت کی ریگ' منسوخ نظم ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۲۲-۲۲۱ پر موجود ہے۔ خدنگِ نظر لکھنؤ میں ستمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔

۳۳ 'دردِ عشق' نظر ثانی کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ پرانا متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۲۳-۲۲۲ پر موجود ہے۔

۳۴ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) روایت علی بخش

۳۵ ''کہوں کیا آرزوئے بے دلی مجھ کو کہاں تک ہے؟'' والی غزل بانگِ درا میں شامل ہے مگر کچھ اشعار منسوخ ہوئے۔ وہ گیان چند (۱۹۸۸) ص

۲۲۴-۲۲۳ پر موجود ہیں۔

۳۶ 'عشق اور موت' نظر ثانی کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ پرانا متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۲۶-۲۲۴ پر موجود ہے۔

۳۷ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۲۸

۳۸ حسن نظامی

۳۹ قصیدہ متروک ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۳۰-۲۲۶ پر موجود ہے۔ مولف کی رائے ہے، ''اس کا خاتمہ محل نظر ہے۔ خاتمے میں ممدوح کے لیے دعا یا حسن طلب ہونا چاہیے۔ اقبال نے اس قصیدے کے آخری دو اشعار میں فخر و مباہات سے کام لیا ہے بالخصوص آخری شعر میں جو لاف وگزاف ہے وہ قصیدے کے لیے مناسب خاتمہ نہیں۔'' مگر قصیدے میں اپنی خودداری کا پہلو نمایاں کرنے کی مثال عرفی نے بھی قائم کی تھی اور پھر یہ قصیدہ زبانی نہیں بلکہ رسالے میں اشاعت کے ذریعے پیش ہو رہا تھا جس کی وجہ سے مزید گنجایش پیدا ہوئی ہوگی۔ بہر حال وہ نئی قدریں دریافت کرنے کا زمانہ تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ قصیدے کی صنف مستثنیٰ رہتی۔

۴۰ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۲۹ پر ہے کہ قصیدہ نواب بہاول پو ہفت روزہ وطن میں بھی شائع ہوا مگر مولف نے اخبار کی اشاعت کی تاریخ نہیں بتائی۔

۴۱ ''کوئی اس نام کا نہیں ملتا'' متروک غزل ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۰۸ پر فقیر سید وحید الدین (۱۹۶۳ء) کے حوالے سے موجود ہے۔

۴۲ حنیف شاہد (۱۹۷۲) ص ۸۷

۴۳ 'زہد اور رندی' نظر ثانی کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ پرانا متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۳۳-۲۳۱ پر موجود ہے۔

۴۴ 'پیامِ صبح' نظرثانی کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ پرانا متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۳۱-۲۳۰ پر موجود ہے۔

۴۵ سالک (۱۹۵۵) ص ۲۴۷۔ یہ معلوم نہیں کس زمانے کا مکالمہ ہے۔

۴۶ ''ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں'' والی غزل بانگِ درا میں شامل ہے۔ منسوخ اشعار سمیت پورا متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۳۴ پر موجود ہے۔

۴۷ 'ترجمۂ ڈانگ' منسوخ نظم ہے۔ گیان چند ص ۲۳۵-۲۳۴ پر موجود ہے مگر جنوری ۱۹۰۴ء کا مخزن مولف کی نظر سے نہیں گزرا۔

۴۸ 'طفلِ شیر خوار' کی شانِ نزول خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) ص ۳۷ پر بیان ہوئی ہے۔ نظم بانگِ درا میں شامل ہے۔ نظرثانی میں کئی اشعار منسوخ ہوئے۔ پرانا متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۳۶-۲۳۵ پر ہے۔

۴۹ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۱۰۴

۵۰ 'رخصت اے بزمِ جہاں' نظرثانی کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۳۸-۲۳۶ پر موجود ہے۔

۵۱ 'تصویرِ درد' نظرثانی کے بعد بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شامل کی گئی۔ جو بند یہاں شامل ہے اُس میں سے بعض اشعار نکالے گئے اور آخری شعر کی جگہ یہ نیا شعر شامل کیا گیا:

یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۴۶-۲۳۹ پر موجود ہے۔

۵۲ اقبال کا بیان مئی ۱۹۰۴ء میں مخزن میں 'نالۂ فراق' کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۰ پر موجود ہے۔

۵۳ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷)

۵۴ اقبال کا بیان مئی ۱۹۰۴ء میں مخزن میں 'نالۂ فراق' کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۰ پر موجود ہے۔

۵۵ افتخار احمد صدیقی (۱۹۸۷) ص ۸۸

۵۶ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۴۶

۵۷ جاوید اقبال (۱۹۷۹) ص ۹۹

۵۸ عبدالرؤف عروج (۱۹۸۸)

۵۹ حنیف شاہد (۱۹۷۲) ص ۸۲

۶۰ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۴۷

۶۱ ''مشہور زمانے میں ہے نامِ حالی'' والی رباعی متروک ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۴۷ پر موجود ہے۔

۶۲ حسن اختر (۱۹۸۸) ص ۱۸۳

۶۳ ایضاً

۶۴ 'ماہِ نو' ترمیم کے بعد بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۴۸-۲۴۷ پر موجود ہے۔

۶۵ 'نالۂ فراق' نظرِ ثانی کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۴۰-۲۴۸ پر موجود ہے۔ شانِ نزول کے بارے میں اقبال کا بیان مئی ۱۹۰۴ء میں مخزن میں 'نالۂ فراق' کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۰ پر بھی موجود ہے۔

۶۶ حنیف شاہد (۱۹۷۲) ص ۸۸

۶۷ ''کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے'' والی غزل انتخاب کی صورت میں بانگِ درا میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۱-۲۵۰ پر موجود ہے۔

۶۸ 'چاند' ترمیم کے بعد بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۲-۲۵۱ پر موجود ہے۔

۶۹ مکتوب ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء

۷۰ 'ابر' ترمیم کے بعد بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شائع ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۴-۲۵۲ پر جلیل قدوائی کے مضمون 'اقبال کی بعض نظموں کا ابتدائی متن' ہمایوں لاہور مئی ۱۹۵۰ مشمولہ علامہ اقبال کی چند غیر مدون تحریریں از رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵) کے حوالے سے موجود ہے۔

۷۱ عبدالواحد معینی (۱۹۶۳) میں شامل اقبال کا مضمون 'قومی زندگی'

۷۲ عطیہ فیضی (۱۹۶۷)، دیکھیے جریدہ *Dawn*, April 30, 1967

۷۳ عبدالواحد معینی (۱۹۶۳) میں شامل اقبال کا مضمون 'قومی زندگی'

۷۴ جلسے کا حال گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۶ پر محمد عمر (نور الٰہی) کے مضمون 'ہندوستاں ہمارا کی شانِ نزول' مشمولہ آج کل یکم جنوری ۱۹۴۶ء کے حوالے سے درج ہے۔

۷۵ 'ہمارا دیس' بانگِ درا (۱۹۲۴) میں 'ترانہ ہندی' کے عنوان سے شامل کی گئی۔ اِس کا اولین متن اُسے سمجھا جا سکتا ہے جو اقبال کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا رسالہ آج کل دہلی اقبال نمبر ۱۹۷۷ میں شائع ہوا۔ اُس پر ۱۰ اگست کی تاریخ ہے اور یہاں وہی متن گیان چند (۱۹۸۸) سے اخذ کر کے درج کیا گیا ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۶۰-۲۵۴ اور ۴۲۱-۴۲۰ پر نظم کا پرانا متن اور مختلف متون کے اختلافِ نسخ موجود ہیں۔

۷۶ یہ بات بھی گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۶ پر محمد عمر (نور الٰہی) کے بیان سے ماخوذ ہے۔

۷۷ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۷-۲۵۶ کے مطابق اقبال کے ہاتھ میں 'ترانۂ ہندی' کا عکس سب سے پہلے پہلے رسالہ آج کل دہلی اقبال نمبر ۱۹۷۷ میں شائع ہوا مگر اُس کا ماخذ معلوم نہیں۔

۷۸ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۶ پر درج ہے کہ 'ترانۂ ہندی' عنوان کے بغیر اتحاد میں ۱۶ اگست ۱۹۰۴ء کو شائع ہوئی۔ شرر کے نوٹ کا اقتباس بھی درج ہے۔ اتحاد کا عکس مولف کی نظر سے گزرا تھا۔

۷۹ دلگداز اگست ۱۹۰۴ء سے 'ترانۂ ہندی' پر تنقید کا اقتباس گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۸ پر درج ہے۔ اس رسالے کا عکس مولف کی نظر سے گزرا تھا۔

۸۰ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۵۸ پر زمانہ کے تمہیدی نوٹ کا اقتباس ڈاکٹر اکبر حیدری کے مضمون 'اقبال کا سفرِ لکھنو، حقیقت یا افسانہ' ہماری زبان ۱۵ مئی ۱۹۸۰ کے حوالے سے درج ہے۔ مولف نے زمانہ کے متن کی تفصیلات بھی دی ہیں۔ مولف کے خیال میں اقبال نے یہ متن خود زمانہ کو بھیجا تھا اس لیے اِسے نظم کا اولین متن سمجھنا چاہیے جس میں بعد میں اقبال نے تبدیلیاں کیں۔ میرے خیال میں بغیر سند کے ایسا نہیں سمجھا جا سکتا۔ نظم نے یکدم ایسی مقبولیت حاصل کی تھی کہ اُس زمانے میں بہت سے اخبارات نے شائع کی ہوگی۔

۸۱ 'سرگزشتِ آدم' نظرِ ثانی کے بعد بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۶۵-۲۶۳ پر موجود ہے۔ مولف کا بیان ہے، ''امیر مینائی کے دیوان صنم خانۂ عشق میں اس نظم کی زمین میں کوئی غزل یا شعر نہیں ہے۔''

۸۲ 'بلال' ترمیم کے بعد بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شامل ہوئی۔ گیان چند

(۱۹۸۸) ص ۲۶۳-۲۶۱ پر منسوخ متن موجود ہے۔

۸۳ یہ غزل متروک ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۶۸-۲۶۷ پر منسوخ متن موجود ہے اور ص ۴۲۴ پر اختلافِ نسخ کے ضمن میں لکھا ہے کہ الکاشف میں اس کے سترہ شعر شائع ہوئے تھے جن کی ترتیب وہی تھی جو باقیاتِ اقبال طبع سوم میں ہے۔ مولف نے یہ نہیں بتایا کہ الکاشف اُن کی نظر سے گزرا یا نہیں۔ مولف نے بقیہ تین اشعار فقیر سید وحید الدین (۱۹۶۳ء) سے لیے ہیں۔

۸۴ مزید ایک لفظ اور عنوان کی تبدیلی سب سے پہلے بانگِ درا (۱۹۲۴) میں سامنے آئی۔

۸۵ یہ شعر بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شامل نہیں ہوا مگر غزل کا انتخاب شامل ہوا جس کا پہلا مصرع ''انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں'' مشہور ہے۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۶۱-۲۶۰ پر موجود ہے۔ مولف نے لکھا ہے یہ دکن ریویو جلد ۲ نمبر ۸، ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی مگر شمارے کی تاریخ نہیں لکھی۔

۸۶ مکتوب ۲۳ اکتوبر ۱۹۰۴ء

۸۷ تنقید ہمدرد کے مضمون کا اقتباس گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۶۰ پر موجود ہے۔

۸۸ شورش کاشمیری (نورتن) ص ۳۵، روایت عبدالمجید سالک۔ روایت نقل کرنے میں شورش سے کہیں غلطی ضرور ہوئی ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ عبدالمجید سالک نے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ وہ خود بھی گرامی کے ساتھ امیر کو لینے گئے تھے۔ یہ درست نہیں ہو سکتا کیونکہ ۱۹۰۴ء میں سالک کی عمر گیارہ برس تھی جبکہ اقبال سے ان کی پہلی ملاقات ۱۹۱۴ء کے قریب ہوئی۔ یہ

واقعہ بعد کے زمانے کا بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ اول تو اقبال اور امیر کا تعلق ۱۹۰۴ء میں ختم ہو گیا تھا، دوسرے خود اسی روایت میں سالک کہتے ہیں کہ اقبال اُن دنوں بازارِ حکیماں میں رہتے تھے۔ یہ معلوم ہے کہ اقبال ۱۹۰۵ء کے بعد کبھی اُس محلے میں نہیں رہے۔

۸۹ ''آسمانوں میں زمینوں میں'' والی غزل بانگِ درا (۱۹۲۴) میں انتخاب کی صورت میں شائع ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۶۷-۲۶۶ پر موجود ہے۔ مولف نے عماد الملک سید حسین بلگرامی کے ذخیرے سے حاصل کی ہوئی ایک قلمی بیاض کے بارے میں لکھا ہے، ''بیاضِ عماد میں اِس غزل کے اوپر لکھا ہے: 'عنوان در صوفی' 'شاہ راہِ کامیابی'۔ معلوم ہوا کہ یہ غزل پنڈی بہاالدین کے رسالہ صوفی میں شائع ہوئی۔ ممکن ہے اِس کی پہلی اشاعت یہی ہو۔''

۹۰ 'موجِ دریا' نظر ثانی کے بعد بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شامل کی گئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۶۹-۲۶۸ پر موجود ہے۔

۹۱ 'جگنو' نظر ثانی کے بعد بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۷۱-۲۷۰ پر موجود ہے۔

۹۲ 'صبح کا ستارہ' نظر ثانی کے بعد بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شامل ہوئی۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۷۲-۲۷۱ پر موجود ہے۔

۹۳ عبدالواحد معینی (۱۹۶۶/۱۹۵۲) ص ۱۹۵-۱۹۲ میں مخزن، جنوری ۱۹۰۵ء کے حوالے سے درج ہے۔ گیان چند (۱۹۸۸) میں نہیں ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً کے پیشِ نظر صرف اقبال کا اردو کلام تھا۔ پوری منقبت درج ذیل ہے۔ مخزن میں 'سپاسِ جنابِ امیر' کے عنوان سے شیخ عبدالقادر کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اقبال

اسے صبح کے وقت پڑھا کرتے ہیں:

اے محوِ ثنائے تو زباں ہا
اے یوسفِ کاروانِ جانہا
اے بابِ مدینۂ محبت
اے نوحِ سفینۂ محبت
اے ماحیِ نقشِ باطلِ من
اے فاتحِ خیبرِ دلِ من
اے سِرِّ خطِ وجوب و امکاں
تفسیرِ تو سورہ ہائے قرآں
اے مذہبِ عشق را نمازے
اے سینۂ تو امینِ رازے
اے سِرِّ نبوتِ محمدؐ
اے وصفِ تو مدحتِ محمدؐ
گردوں کہ بہ رفعت ایستادست
از بامِ بلندِ تو فتادست
ہر ذرۂ در گہت چو منصور
در جوشِ ترانۂ اناالطّور
بے تو نتواں باو رسیدن
بے او نتواں بتو رسیدن
فردوس زتو چمن در آغوش
از شانِ تو حیرت آئنہ پوش
جانم بغلامیِ تو خوشتر

سر بر زدہ ام زجیبِ قنبرؓ
ہشیارم و مستِ بادۂ تُو
چوں سایہ زپا فتادۂ تُو
از ہوش شدم مگر بہوشم
گوئی کہ نصیری خموشم
دانم کہ ادب بضبطِ راز است
در پردۂ خامشی نیاز است
امّا چہ کنم مے تولا
تُند است بروں فتد زمینہا
زاندیشۂ عاقبت رہیدم
جنسِ غمِ آلِ تُو خریدم
فکرم چو بہ جستجو قدم زد
در دیر شد و درِ حرم زد
در دشتِ طلب بسے دویدم
داماں چو گردباد چیدم
در آبلہ خارہا خلیدہ
صد لالہ تہِ قدم دمیدہ
افتادہ گرہ بروے کارم
شرمندۂ دامنِ غبارم
پویاں پے خضر سوئے منزل
بر دوش خیال بستہ محمل
جویائے مے و شکستہ جامے

چوں صبح بباد چیدہ دامے
پیچیدہ بخود چو موجِ دریا
آوارہ چو گردبادِ صحرا
واماندہ زدردِ نارسیدن
در آبلہ شکستہ دامن
عشقِ تو دلم ربود ناگاہ
از کارِ گرہ کشود ناگاہ
آگاہ زہستی و عدم ساخت
بت خانہ عقل را حرم ساخت
چوں برق بخرمنم گزر کرد
از لذّتِ سوختن خبر کرد
برباد متاعِ ہستیم داد
جامے ز مئے حقیقتم داد
سرمست شدم زپا فتادم
چوں عکس زخود جدا فتادم
پیراہنِ ما و من دریدم
چوں اشک زچشمِ خود چکیدم
خاکم بفراز عرش بردی
زاں راز کہ با دلم سپردی
واصل بکنار کشتیم شد
طوفانِ جمالِ زشتیم شد
جز عشق حکایتے ندارم

پروائے ملامتے ندارم

از جلوۂ عام بے نیازم

سوزم۔ گریم۔ تپم۔ گدازم

۹۴ دیکھیے حاشیہ ا

۹۵ یہ غزل انتخاب کی صورت میں بانگِ درا (۱۹۲۴) میں شامل ہوئی۔ پہلا مصرع ہے، ''سختیاں کرتا ہوں دل پر، غیر سے غافل ہوں میں''۔ منسوخ متن گیان چند (۱۹۸۸) ص ۲۷۳-۲۷۲ پر موجود ہے۔

۹۶ شورش کاشمیری (اس بازار میں) ص ۱۸۴

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

منتخب کتابیات

☆ صرف انہی کتابوں کا اندراج کیا جا رہا ہے جن کا حوالہ مآخذ میں دیا گیا ہے۔دیگر کتب جن سے اس سوانح کی تیاری میں مدد لی گئی وہ شامل نہیں۔

☆ مصنف کا نام درج کرتے ہوئے لقب، عہدہ یا ذات نکال کر اس کے بعد والے نام سے شروع کیا گیا ہے۔اگر نام کا پہلا لفظ محمد ہے تو اسے بھی نام سے پہلے شمار نہیں کیا گیا۔مثلاً عبدالمجید سالک تو عبدالمجید سالک ہی رہا ہے مگر ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کو ''عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر محمد'' لکھا ہے۔

☆ مصنف کے نام کے بعد کتاب کی پہلی اشاعت کا سال درج ہے۔چونکہ اُردو میں تاریخِ اشاعت درج کرنے کا رواج عام نہیں رہا اس لیے بعض صورتوں میں دیباچے کی تاریخ کو طبعِ اوّل کی تاریخ فرض کرنا پڑا ہے۔

☆ ناشر کا نام کتاب کے اُس نسخے سے لیا گیا ہے جس سے براہِ راست استفادہ ہوا۔اگر یہ پہلا ایڈیشن نہ رہا ہو تو ناشر کے نام کے بعد قوسین میں نئے ایڈیشن کی تاریخ درج ہے۔

کتبِ اقبال

The Development of Metaphysics in Persia (1908).

Bazm-eIqbal (1964) Lahore.

علم الاقتصاد (۱۹۰۴)۔آئینۂ ادب (۱۹۹۱) لاہور

بانگِ درا (۱۹۲۴ء)

اقبال کی وہ تحریریں جو دوسروں نے مرتب کیں

گیان چند، ڈاکٹر۔۱۹۸۸۔ ابتدائی کلامِ اقبال بہ ترتیبِ مہ و سال۔شائستہ پبلشنگ ہاؤس۔کراچی

مظفر حسین برنی۔۱۹۹۲۔ کلیاتِ مکاتیبِ اقبال (جلد اول)۔ اُردو اکادمی۔دہلی

محمد عبداللہ قریشی۔۱۹۸۷۔حیاتِ جاوداں۔بزمِ اقبال۔لاہور

عبدالواحد معینی، عبداللہ قریشی۔۱۹۵۲/۱۹۶۶۔ باقیاتِ اقبال (طبع دوم)۔ آئینۂ ادب۔لاہور

عبدالواحد معینی، عبداللہ قریشی۔۱۹۶۳۔مقالاتِ اقبال۔آئینۂ ادب (۱۹۸۸)۔لاہور

B. A. Dar 1967 *Letters And Writings Of Iqbal*. Iqbal Academy Pakistan, Lahore

Javid Iqbal, Dr. (1962/2006), *Stray Reflections*, Revised and annotated by Khurram Ali Shafique. Iqbal Academy Pakistan, Lahore

بنیادی مآخذ

خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) بزمِ اقبال (۱۹۸۳) لاہور

عبدالقادر، شیخ۔۱۹۲۴۔دیباچہ بانگِ درا۔شیخ غلام علی اینڈ سنز (۱۹۷۳)۔ لاہور

فقیر سیّد وحید الدین۔۱۹۵۰/۱۹۶۳۔روزگارِ فقیر (جلد اوّل)۔آتش فشاں پبلی کیشنز (۱۹۸۸)۔لاہور

فقیر سید وحیدالدین۔۱۹۶۳ء۔روزگارِ فقیر (جلد دوم)۔آتش فشاں پبلی کیشنز (۱۹۸۸)۔لاہور

حمید احمد خاں۔۱۹۷۴۔اقبال کی شخصیت اور شاعری۔بزمِ اقبال (۱۹۸۳ء)۔لاہور

اعجاز احمد۔۱۹۸۵۔مظلوم اقبال۔اعجاز احمد۔کراچی

عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر محمد۔۱۹۷۷۔روایاتِ اقبال۔اقبال اکادمی پاکستان (۱۹۸۹)۔لاہور

عبدالمجید سالک۔۱۹۵۵۔ذکرِ اقبال۔بزمِ اقبال۔لاہور

عبدالمجید سالک۔۱۹۵۴۔سرگزشت۔الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب (۱۹۹۳)۔لاہور

نذیر نیازی، سیّد۔۱۹۶۱۔اقبال کے حضور۔اقبال اکادمی۔کراچی

عبداللہ قریشی (مرتب)۔۱۹۸۸۔تذکارِ اقبال از منشی محمد الدین فوق۔بزمِ اقبال۔لاہور

محمد حنیف شاہد۔۱۹۷۲۔نذرِ اقبال سر عبدالقادر کے مضامین، مقالات، مقدمات اور مکاتیب کا مجموعہ۔بزمِ اقبال۔لاہور

Atiya Fyzee (1947). *Iqbal*

Muhammad Siddique: *Descriptive Catalogue of Allama Iqbal's Personal Library*. Iqbal Academy, Lahore

B. A. Dar (1967): *Writings And Speeches of Iqbal*. Iqbal Academy Pakistan, Lahore

جرائد

Dawn: April 21, 1952 (Attiya Faizi: When soft music confused Iqbal)

Dawn: April 30, 1967 (Attiya Faizi: Iqbal, a reflection)

اقبال (بزمِ اقبال لاہور) اکتوبر ۱۹۵۷ء: غلام بھیک نیرنگ ۔ 'اقبال کے بعض حالات'

ثانوی مآخذ

عبداللہ قریشی ۔۱۹۸۲۔حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں ۔بزمِ اقبال ۔لاہور

افتخار احمد صدیقی ۔۱۹۸۷۔ عروجِ اقبال ۔بزمِ اقبال ۔لاہور

سلطان محمود حسین، ڈاکٹر سیّد ۔۱۹۸۲۔ اقبال کی ابتدائی زندگی ۔ اقبال اکادمی پاکستان ۔لاہور

سلطان محمود حسین، ڈاکٹر سیّد ۔۱۹۸۱۔ علّامہ اقبال کے اُستاد شمسُ العلماءٗ مولوی سیّد میر حسن (حیات و افکار) ۔اقبال اکادمی پاکستان ۔لاہور

نذیر نیازی، سیّد ۔۱۹۷۹۔دانائے راز ۔اقبال اکادمی پاکستان (۱۹۸۸)۔ لاہور

اجمل خان نیازی، ڈاکٹر ۔۱۹۹۰ء۔فوق الکشمیر ۔مطبوعہ سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور

الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ)، سیّد اور پروفیسر محمد ایوب قادری ایم

اے(مرتبین)۔۱۹۷۰۔ علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں
۔اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔کراچی

اکرام،ایس۔ایم۔(تاریخ ندارد)۔ یادگارِ شبلی ۔ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ(۱۹۹۴)۔لاہور

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی۔۱۹۸۳۔ اوزانِ اقبال۔شیخ غلام علی اینڈ سنز۔لاہور

حسن اختر،ڈاکٹر ملک۔۱۹۸۸۔ اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ۔ یونیورسل بکس۔لاہور

سعید اختر درّانی۔۱۹۸۵۔ اقبال یورپ میں۔اقبال اکادمی۔لاہور

ظ۔انصاری۔۱۹۸۳۔مثنویاتِ غالب: اصل فارسی مع اردو ترجمہ۔غالب انسٹی ٹیوٹ۔نئی دہلی۔

شبلی نعمانی۔سفر نامہ مصر و روم و شام

بشیر فاروق۔۱۹۹۳۔ دانائے راز۔فاروق اکیڈمی۔کراچی

عبدالرؤف عروج۔۱۹۸۸۔رجالِ اقبال۔نفیس اکیڈمی۔کراچی

شورش کاشمیری(تاریخ ندارد)۔ اُس بازار میں۔الفیصل تاجرانِ کتب۔ لاہور

شورش کاشمیری(تاریخ ندارد)۔ نو رتن۔الفیصل تاجرانِ کتب(۱۹۹۸)۔ لاہور

اختتام------------------------The End